اثراتِ شبلی

جلد دوم

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
ایم۔اے۔، پی۔ایچ۔ڈی

اثراتِ شبلی

(جلد دوم)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

اثراتِ شبلی

(جلد دوم)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ادبی دائرہ اعظم گڑھ

ASARAT-E-SHIBLI. VOL:2
by: Dr. Mohammad Ilyas Azmi
Frist edition Sept. 2022
azmi408@gmail.com
+919838573645
Page: 272. Rs: 400/-

ISBN 978-81-955985-4-0

- کتاب : اثرات شبلی۔ جلد دوم
- مصنف : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
- ناشر : مصنف
- مطبع : اصیلہ پرنٹرس، دہلی

ملنے کے پتے

- مکتبہ جامعہ اردو بازار جامع مسجد دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶
- دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۷۶۰۰۱

انتساب

محبِ مکرم

ڈاکٹر محمد شکیل اختر

اے جے کے ماس کمیونیکیشن ریسرچ سینٹر

جامعہ ملیہ اسلامیہ

کی نذر

ترتیب

اثرات شبلی

•••

دیباچہ

''اثرات شبلی'' کی جلد اول میں ۱۰۵ر اہم اور نامور شخصیات کے علامہ شبلی اور ان کے افکار سے متاثر ہونے کی داستان قلم بند کی گئی ہے۔ یہ داستان عہد سرسید سے علامہ شبلی کی وفات [۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء] تک کی علمی و تعلیمی اور ادبی و تنقیدی کاوشوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ شبلی شناسی کا بڑا حصہ اس جلد میں آگیا ہے۔ زیر نظر کتاب اس کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میں ۱۹۱۴ء سے عہد حاضر تک کی ۱۰۴ر نامور علمی و ادبی شخصیات کے علامہ شبلی سے متاثر ہونے کی تفصیل قلم بند ہوئی ہے۔ یہ داستان اپنی نوعیت اور افادیت کے لحاظ سے حصہ اول سے کم نہیں بلکہ بعض حیثیتوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ چونکہ اس عہد سے ہم ادبی و ثقافتی اعتبار سے زیادہ قریب ہیں اور اس کے اکثر واقعات اور تاثرات قریب العہد ہونے کی بنا پر دل سے بھی زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والوں کو یہ زیادہ متاثر کرتے ہیں۔

اثرات شبلی کی یہ داستان دراصل ہماری گذشتہ پون صدی کی تہذیبی اور تمدنی تاریخ کا حصہ ہے۔ اس میں ہماری علمی تاریخ کے ساتھ ادبی و تہذیبی تاریخ بھی شامل ہے۔ اس میں ایک بڑا حصہ ملکی سیاسیات کا بھی آگیا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ علامہ شبلی اور ان کی فکر و نظر کس درجہ مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم ہے کہ ہر شعبہ زندگی میں اس کا پرتو صاف نظر آتا ہے اور ہر بڑی اور ممتاز شخصیت اس کے ہالہ کے درمیان نظر آتی ہے۔ یہی مطالعہ و تحقیق اس کتاب کا ماحصل ہے۔

۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے وفات پائی۔ اس وقت ان کے تلامذہ و منتسبین کی ایک بڑی جماعت موجود تھی۔ دہلی، علی گڑھ، حیدرآباد، لکھنو اور خاص طور پر اعظم گڑھ میں تلامذہ شبلی فکر شبلی کی ترویج و اشاعت کے لئے کمربستہ تھے۔ ۲۱ر نومبر ۱۹۱۴ء کو امام حمید الدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی نے اخوان الصفا کے اجلاس میں

اعلان کیا کہ وہ اپنے استاد علامہ شبلی کے نامکمل علمی و تعلیمی اور تصنیفی و تحقیقی منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں گے۔ بالخصوص سیرت نبوی کی تکمیل کا عام اعلان ہوا۔ تمام مشتاقان سیرت نبویؐ نے اطمینان کا سانس لیا۔ بیگم سلطان جہاں نے بھی اطمینان ظاہر کیا۔ تلامذہ شبلی کا یہ عزم بالجزم ان کی زندگی یعنی بیسویں صدی کے آخری عشروں تک قائم رہا اور نصف صدی سے زاید عرصہ تک وہ اس عزم و حوصلہ پر کاربند رہے۔ مگر اس کے بعد کی نصف صدی کی ہماری تہذیبی و تمدنی تاریخ علامہ شبلی کے منصوبوں پر محض ان کے اخلاص نیت اور افادیت کی بنیادوں پر قائم رہی اور اب تک قائم ہے۔ اس میں سب سے اہم کردار رفقائے دارالمصنفین اور فضلائے ندوہ کے ساتھ قوم پرور مسلمانوں کی کاوشوں کا مرہون منت رہا ہے۔ اس دوران بعض دوسری تحریکیں بھی وجود میں آئیں۔ زمانہ نے کروٹ لی اور علمی و تعلیمی شعبوں میں انقلابات رونما ہوئے، مگر اس دور میں بھی دبستان شبلی پوری قوت کے ساتھ ملت کی ذہنی تاریخ میں اپنا کردار ادا کرتا رہا۔ شبلی کالج اعظم گڑھ اور مرحوم شبلی کالج لاہور نامساعد حالات میں بھی کام کرتے رہے۔ علامہ شبلی کی یادگار اور آخری آرام گاہ دارالمصنفین، اس دور تاریکی میں بھی منارۂ نور بنے رہے۔ ان تمام پہلوؤں کی تاریخ کے اہم واقعات چند بڑے اہل قلم کی زبانی اس کتاب میں آگئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی اثرات شبلی کی یہ داستان جلد اول کے مقابلہ میں ممکن ہے کم اثر رکھتی ہو، مگر اپنی افادیت میں جلد اول کے مقابلہ میں ذرہ برابر بھی کم رتبہ نہیں۔

اثرات شبلی کے یہ اوراق ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد میں بالاقساط شائع ہوئے تو اہل علم بالخصوص قدردانان شبلی نے اس کی بھرپور پذیرائی کی اور ناچیز کی محنت کو سراہا۔ اسی حوصلہ و ستائش نے اسے کتابی صورت میں پیش کرنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ اس عنایت کریمی پر ناچیز سربہ سجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور تمغہ زندگی سے نوازا۔

ناچیز
محمد الیاس الاعظمی
شبلی انسٹی ٹیوٹ اعظم گڑھ

۲۵ راگست ۲۰۲۲ء

اثراتِ شبلی

(۱۰۶)

ڈاکٹر سید رفیق حسین

[۱۹۱۳-۱۹۹۰ء]

ڈاکٹر سید رفیق حسین سابق صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کا ذکر اردو کے ادیب، شاعر اور نقاد کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ عظمت مراثی، پہلی تنقید پہلا نقاد، اردو غزل کی نشو ونما[۱۹۴۲ء] میر حسن کی حیات اور سحر البیان کا تنقیدی جائزہ[م:۱۹۶۰ء]، گلزار عقیدت[م:۱۹۶۶ء]، افسانوی اصول اور فسانہ عجائب[م:۱۹۷۵ء]، مثنوی سحر البیان قصہ بے نظیر و بدر منیر[م:۱۹۷۸ء]، گلزار نسیم مع تشریح و مقدمہ، ان کی ادبی وتنقیدی کتابوں کے نام ہیں۔

۱۹۸۷ء میں انھوں نے ارن کمار اگروال پبلشر الہ آباد کی فرمائش پر علامہ شبلی کی مشہور زمانہ کتاب موازنہ انیس و دبیر کو ایڈٹ کیا اور ایک مقدمہ اور دو ضمیموں کے اضافوں کے ساتھ شائع کیا۔ پہلا ضمیمہ مرثیہ فردوسی مشمولہ موازنہ انیس و دبیر ہے۔ جبکہ دوسرا مرثیہ محتشم کاشی کا ترجمہ ہے۔ انھوں نے علامہ شبلی اور موازنہ کی تحسین وستائش بھی کی ہے اور بعض تنقیدیں بھی، مگر انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

> ''مولانا شبلی کی فروگذاشتوں کا جو ذکر میں نے اپنے مقدمہ میں کیا ہے یا کہنے نہ کہنے کی باتوں میں جو تنقیدی نکات آگئے ہیں، ان سے میری مراد مولانائے محترم

کی منقصت نہیں ہے اور نہ ان پر طنز کرنا ہی مقصود ہے، بلکہ تصنیف کو بہتر بنانا ہے۔"

ڈاکٹر رفیق حسین نے موازنہ کا تعارف اور اس کی اہمیت کا ذکر کیا ہے۔ البتہ تحسین و ستائش کے ساتھ متعدد کمیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ان کمیوں کا معاملہ ذوقی ہے، مثلاً علامہ شبلی نے مراثی انیس و دبیر سے اتنی کثرت سے مثالیں دی ہیں کہ قاری اسی میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ میر انیس کی جتنی تعریف کی گئی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ کے مستحق تھے۔ انیس کے خیالات عالیہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ مرزا دبیر کے جتنے نقائص بیان کئے گئے ہیں وہ اس کے مستحق نہ تھے۔ علامہ شبلی نے حسینی مراثی کا ذکر نہیں کیا۔ مرثیہ گوئی کی صحیح تاریخ نہیں لکھی گئی۔ اس طرح کے ان کے کچھ اور بھی اعتراضات ہیں، مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان تمام باتوں کے باوجود "موازنہ انیس و دبیر" مولانا شبلی کا بہت بڑا کارنامہ ہے جو سیکڑوں سال تک زندہ رہے گا۔ اور ایک صدی سے زندہ ہے۔

ڈاکٹر سید رفیق حسین نے علامہ شبلی کی بعض خوبیوں اور ان کی بعض تصنیفات کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ علامہ شبلی کی سب سے بڑی خوبی ان کا آرگنائزر ہونا بتاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی شخصیت گوناگوں اوصاف کی حامل تھی۔ وہ بہت بڑے آرگنائزر تھے، جن اداروں کی تاسیس انھوں نے فرمائی وہ ان کے انتقال کے ستر سال بعد بھی ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ قیام حیدر آباد کے دوران انھوں نے کل ہند انجمن ترقی اردو کے بنیادی معتمد کے گراں قدر عہدہ کا بار اپنے کاندھوں پر رکھا اور کافی دنوں تک اس کی ترویج و ترقی کے لئے کوشاں رہے، لکھنؤ کے زمانہ قیام میں انھوں نے ندوۃ العلمائے ہند کی بنیاد رکھی۔ یہ بہت بڑا ادارہ ہوگیا۔ بروقت انتقال اپنا ذاتی کتب خانہ اس ادارے کو مفت بخش گئے۔ تیسرا بڑا ادارہ دارالمصنفین اپنے وطن اعظم گڑھ میں قائم کیا جو اب شبلی اکیڈمی کے نام سے موسوم ہے۔ اسی کی ایک شاخ شبلی پوسٹ گریجویٹ کالج ہے جہاں ہزاروں طلبہ اور طالبات تحصیل علم و ادب میں مصروف ہیں، یہ اتنا بڑا کالج ہے کہ اسے یونیورسٹی کا درجہ ملنا چاہئے۔ اداروں کو منظم کرنے کی صلاحیت رکھنے کے سلسلہ میں شبلی اپنے تمام معاصرین سے پیش پیش رہے۔"

(موازنہ انیس ودبیر، مقدمہ، ص: ز)

علامہ شبلی کی ہمہ جہتی اور کثیر الجہات شخصیت پر وہ حیرت کا اظہار کرتے ہیں:

''محل استعجاب ہے کہ اتنا کثیر المشاغل انسان کیسے اتنا کثیر التصانیف ہوگیا اور پھر یہ بھی کہ مولانا شبلی نے عمر بھی بہت طویل نہ پائی۔ وہ بیک وقت ادیب وشاعر، مورخ ونقاد، سیرت وسوانح نگار تھے۔''

(مقدمہ موازنہ انیس ودبیر ص ۱۶)

ڈاکٹر سید رفیق حسین نے شعر العجم کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ

''شعر العجم چار جلدوں میں پروفیسر براؤن کی تاریخ فارسی ادب سے پہلے شائع ہوگئی تھی۔ پروفیسر براؤن ایران میں کافی دنوں مقیم رہے اور شبلی نے ایران کی سرزمین پر قدم بھی نہ رکھا۔ شعر العجم میں مولانا نے ایسے پھول کھلائے ہیں کہ پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب کی تیسری جلد میں تحریر فرمایا ہے کہ شعر العجم ایسی گراں بہا تصنیف کو پہلے دیکھ لیتے تو شاید وہ اپنی گراں بہا تصنیف نہ تحریر فرماتے۔ یہ الگ بات ہے کہ محمود شیرانی نے اپنا زور قلم دکھانے کے لئے اس پر چار ضخیم جلدوں میں تنقید شعر العجم لکھی، جسے اب کوئی جانتا بھی نہیں اور شعر العجم آج بھی ویسی ہی تازہ اور شگفتہ ہے جیسے پہلے تھی۔'' (ایضاً)

حافظ محمود خاں شیرانی کی کتاب ''تنقید شعر العجم'' کو کوئی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، کم از کم ڈاکٹر رفیق حسین سابق صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی تو نہیں جانتے تھے۔ ورنہ وہ اسے چار ضخیم جلدوں پر مشتمل قرار نہ دیتے۔ گویا انہوں نے تنقید شعر العجم دیکھی ہی نہیں تھی، محض سنی سنائی باتوں پر انحصار کرلیا ہے۔ بہر حال اس کمی کے باوجود انھوں نے موازنہ کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ خوبیاں اور کمیاں دکھائی ہیں اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

''یہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور سب تصانیف سے زیادہ مقبول ومطبوع ہے۔''

(۱۰۷)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

[۱۹۱۳-۱۹۹۹ء]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی معروف بہ علی میاں بیسویں صدی کے ہندوستان کی انتہائی ممتاز، برگزیدہ، نامور اور جامع کمال شخصیت تھے۔ وہ ندوہ کے نامور فرزند تھے اور تاحیات اس کی رہبری، رہنمائی اور سربراہی کرتے رہے۔ اور ندوہ کو بہت کچھ ترقی دی۔

وہ دبستان شبلی کے نمائندہ ادارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کی مجلس انتظامیہ کے بھی مدۃ العمر صدر رہے۔ وہ ایک بڑے محقق و مصنف تھے۔ ان کے قلم سے اردو اور عربی میں بے شمار کتابیں اور مضامین و مقالات اور خطبات شائع ہوئے۔ ان کی بعض کتابوں نے دنیا بھر میں شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ ایک ایک کتاب کے کئی کئی ایڈیشن طبع ہوئے۔ اور دنیا کی مختلف زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے۔ چونکہ علامہ شبلی ندوہ کے بانیوں اور ان کے والد کے دوستوں میں تھے، اس لئے ان سے مولانا علی میاں کا متاثر ہونا ایک فطری بات ہے۔ ہمارے کرم فرما اور ممتاز مصنف پروفیسر محمد محسن عثمانی ندوی نے اپنے ایک مفصل مضمون میں ان پر جو ''اثرات شبلی'' مرتب ہوئے، ان کی نشاندہی کی ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان ''مولانا ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت پر مولانا شبلی کے اثرات'' ہے۔ یہ کتابچہ کی صورت میں بھی شائع ہوا ہے، لیکن موصوف سے یہ کہے بنا نہیں رہا جاتا کہ انہوں نے موضوع کا حق ادا نہیں کیا اور بہت سی اہم تحریریں اور واقعات انہوں نے چھوڑ دیے ہیں۔

علمی و تصنیفی میدان میں علامہ شبلی نعمانی کے ایسے عظیم الشان کارنامے ہیں کہ ان سے کسی ذی علم اور صاحب شعور کا متاثر نہ ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ مثلاً الفاروق، شعرالعجم اور سیرۃ النبی جیسی لازوال کتابیں کسی بھی صاحب شعور و دانش کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ الفاروق کی تاثیر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اب تک اس کے تیس تراجم دوسری زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ الفاروق سے متاثر ہونے کا ذکر مولانا علی میاں نے کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''انہیں دنوں کے کچھ بعد میرے ہاتھ میں مولانا شبلی مرحوم کی الفاروق آ گئی۔ مطبع نامی کان پور کی چھپی ہوئی۔ سراپا تصویر، پڑھی اور کئی بار پڑھی۔ عراق کی جنگوں، بویب، حسیر، قادسیہ وغیرہ کے میدان جنگ کی تصویر مولانا نے جن چھوٹے چھوٹے بے ساختہ وبرجستہ جملوں میں کھینچی ہے۔ شاید اس سے زیادہ اثر فردوسی، شاہنامہ میں مسلسل اشعار اور پرشکوہ الفاظ اور مبالغہ سے پیدا نہیں کرسکا۔ الفاروق کے جان دار اور گرم جملے اور لفظ شمشیر وسناں کا کام کرتے ہیں۔ مولانا نے نظام خلافت پر جو کاوش کی ہے، اس کے سمجھنے کی اس وقت صلاحیت نہ تھی اور اب اس سے کوئی دلچسپی اور علمی تاثیر نہیں ہے، لیکن واقعات کے حصہ کا اثر اس وقت بھی تھا اور اب بھی ہے۔'' (مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ص:۱۶۱)

مولانا علی میاں نے الفاروق کا ذکر اپنی ایک اور کتاب میں زیادہ موثر انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی کی زندہ جاوید تصنیفات میں ان کی کتاب الفاروق خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کو ان کی انشا پردازی کا شاہ کار کہا جاسکتا ہے، اس کتاب نے بہت سے جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کے دل میں اسلام کی محبت کا بیج بویا اور ایمان کی آبیاری کی اور وہ مغرب کے فکری وتہذیبی حملوں کا مقابلہ کرنے کا ذریعہ بنی۔''

(اسلامیات اور مغربی مستشرقین ومسلمان مصنفین، ص:۴۵)

مولانا علی میاں نے اپنے کئی دیباچوں کا آغاز علامہ شبلی کے اقتباس سے کیا ہے۔ مثلاً پروفیسر خلیق احمد نظامی کی کتاب ''اسلامی فکر اور تہذیب کا اثر ہندوستان پر'' اپنے پیش لفظ کا آغاز اس طرح کیا ہے:

''مولانا شبلی نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب شعر العجم کے مقدمہ کو ان الفاظ کے ساتھ شروع کیا ہے:

''اسلام ایک ابر کرم تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا، مگر فیض بقدر استعداد پہنچا، جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیضیاب

ہوئی۔عرب، ایران، افغانستان، ہند، ترکستان، تاتار، مصر، شام، روم، سب اس کے حلقہ میں آئے، لیکن قبول اثر میں سب یکساں نہ تھے، فرق مراتب تھا۔اور فرق مراتب کی حیثیتیں بھی مختلف تھیں۔جس قوم میں جس قسم کی قابلیت تھی اسلام نے اس کو اسی قدر چمکایا۔ترک شجاع تھے شجاع تر ہوگئے۔ایرانی ہمیشہ سے تہذیب و معاشرت اور علوم وفنون میں ممتاز تھے، اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا۔ بوعلی سینا، غزالی، رازی، طوسی، امام بخاری، مسلم سیبویہ، جوہری سب ایران ہی کی خاک سے اٹھے تھے۔آج تمام اسلامی دنیا میں ایران ہی کی تہذیب اور معاشرت جاری ہے۔ترکوں نے بڑی بڑی پرزور سلطنتیں قائم کیں، لیکن دفتر کی زبان اور دربار کے دستور و آئین سب فارسی ہی رہے۔''

(اسلامی فکر اور تہذیب کا اثر ہندوستان پر،ص:۵)

پھر اس اقتباس پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ البتہ اس موضوع پر سب سے پہلے شائع ہونے والے مقالے''ہندوستان میں اسلامی تہذیب وتمدن کا اثر'' جو علامہ شبلی کے قلم سے نکلا ہے، اس مقدمہ میں اس کا نام تک نہیں آیا ہے۔؟

اسی طرح مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی کے حمد و نعت کے مجموعہ پر پیش لفظ کا آغاز مولانا علی میاں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''مولانا شبلیؒ نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب شعر العجم کے حصہ پنجم میں صوفیانہ شاعری کے باب کا آغاز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''فارسی شاعری اس وقت تک قالب بے جان تھی جب تک اس میں تصوف کا عنصر شامل نہیں ہوا۔شاعری اصل میں اظہار جذبات کا نام ہے، تصوف سے پہلے جذبات کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔قصیدہ مداحی اور خوشامد کا نام تھا۔ مثنوی واقعہ نگاری تھی۔غزل زبانی باتیں تھیں۔تصوف کا اصلی مایہ خمیر عشق حقیقی ہے، جو سرتاپا جذبہ اور جوش ہے۔عشق حقیقی کی بدولت مجازی کی بھی قدر ہوئی اور اس آگ نے سینہ و دل گرما دئے۔اب زبان سے جو کچھ نکلتا تھا گرمی سے خالی

نہیں ہوتا تھا۔ارباب دل ایک طرف اہل ہوش کی باتوں میں بھی تاثیر آ گئی۔"

(عرفان محبت،ص:۳۰)

مولانا علی میاں نے مذکورہ بالا دونوں اقتباسات کے بعد ان پر نقد وتبصرہ بھی کیا ہے جو ہمارا موضوع نہیں۔البتہ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس سے نہ صرف مولانا مرحوم کے گہرے مطالعہ شبلی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کے تاثر لینے کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔اس کی مزید تفصیلات طوالت کے باعث قلم انداز کی جاتی ہیں۔

---

(۱۰۸)

عبدالرزاق قریشی

[۱۹۱۳-۱۹۷۷ء]

عبدالرزاق قریشی اعظم گڑھ کا فخر اور اردو زبان وادب کا تابندہ ستارہ تھے۔انہوں نے خود کو بنایا اور سنوارا تھا۔ان کے پاس نہ کوئی سند تھی اور نہ انہوں نے کسی کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا تھا۔خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔اردو اور فارسی زبان اور ان کے ادب پر بڑی گہری نگاہ تھی۔انہوں نے نہ صرف بلند پایہ ادبی وتحقیقی کتابیں سپرد قلم کیں بلکہ سلیقہ تحقیق پر اردو میں پہلی کتاب "مبادیات تحقیق" بھی انہی کے قلم سے منظر عام پر آئی۔اس کتاب کے بعد تحقیق اور اصول تحقیق پر بعض عمدہ مضامین ومقالات لکھے گئے ہیں مگر اولیت کا شرف بہرحال اب تک انہیں کو حاصل ہے۔ان کی بلند پایہ ادبی وتحقیقی کتابوں سے ان کے علمی وادبی مقام ومرتبے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔جن کے نام یہ ہیں:

(۱) مبادیات تحقیق،(۲) میرزا مظہر جان جاناں اور ان کا اردو کلام،(۳) اردو زبان کی تمدنی اہمیت،(۴) مکاتیب میرزا مظہر،(۵) دیوان عزلت،(۶) نوائے آزادی،(۷) راگ مالا از عزلت،(۸) تاثرات،(۹) خلاصہ حیات شبلی۔

ان کی زندگی کا بیشتر حصہ بمبئی اور انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے وابستگی میں

گذرا۔ انجمن کے رسالہ نوائے ادب کی ادارت بھی کی اور اس کے لئے اداریئے، مضامین، تبصرے اور وفیات بھی لکھے۔ انہوں نے انجمن اسلام کے مکاتب میں تدریسی خدمت بھی انجام دی اور اس کے لئے نصابی کتابیں بھی لکھیں۔ ایک کتاب ''برگ ادب'' حصہ سوم راقم کی نظر سے گذری ہے۔

ان کا انداز تحقیق و تصنیف اور اسلوب نگارش دبستان شبلی کا تھا۔ دارالمصنفین کے سابق ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے ان کی کتاب اردو زبان کی تمدنی اہمیت کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''ان کا طرز تحریر دبستان شبلی ہی کے رنگ کا ہے۔'' (اردو زبان کی تمدنی اہمیت، ص:۱)

آخر میں وہ دارالمصنفین کے رفیق ہو کر اعظم گڑھ آ گئے تھے، مگر عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہی ۱۹۷۷ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اپنے گاؤں بسہم کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

ان کا نہ صرف اسلوب نگارش دبستان شبلی کے رنگ کا تھا بلکہ ان کا انداز غور و فکر اور سلیقہ تصنیف و تالیف سب دبستان شبلی کا تھا۔ اصلاً وہ اسی دبستان کے ایک فرد تھے۔ وہ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی سے بے حد متاثر تھے اور ان کو اپنا استاد تسلیم کرتے تھے۔ اہل علم واقف ہی ہیں کہ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی علامہ شبلی کے شاگرد تھے۔ دارالمصنفین کے عہد بہار میں اس کے رفیق رہے اور مقدمہ رقعات عالم گیر جیسی بلند پایہ کتاب لکھی۔ یہی وجہ ہے کہ عبدالرزاق قریشی بھی دبستان شبلی کے رنگ میں رنگ گئے۔ ہمارے بزرگ کرم فرما پروفیسر خورشید نعمانی رودولوی جن کے ایام شباب دارالمصنفین میں گذرے ہیں۔ انہوں نے پی ایچ۔ڈی کے مقالے کے لئے ''دارالمصنفین کی ادبی خدمات'' کا انتخاب کیا۔ اور ایک عمدہ مقالہ لکھا جو ۱۹۷۷ء میں بمبئی سے شائع ہوا۔ اس کا تعارف عبدالرزاق قریشی مرحوم کے قلم سے ہے۔ اس کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ واقعی دبستان شبلی کے ایک مرد جلیل تھے اور علامہ شبلی اور ان کے دبستان کے ایک ایک انداز سے وہ واقف تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''دارالمصنفین اعظم گڑھ پر لکھنے کے لئے کسی اعتذار کی ضرورت نہیں۔ یہ ادارہ مولانا شبلی کے خوابوں کی حسین و جمیل تعبیر ہے۔ اس ادارے نے اپنی ساٹھ سالا زندگی میں بیش بہا دینی، علمی و ادبی خدمات انجام دیں۔ اس کی تصانیف نے

مسلمانوں کو اپنے شاندار ورثہ پر فخر کرنے اور اسلاف کے کارناموں پر سردھنا سکھایا۔اس ادارے نے نئے حالات میں مذہبی مسائل وعلمی پہلوؤں پر جدید طرز کی کتابیں شائع کیں۔اردو میں تالیف وتصنیف کا ایک نمونہ قائم کیا اور تعلیم یافتہ طبقہ میں سنجیدہ علمی مذاق پیدا کیا۔اسلامی عقائد اور اسلامی تاریخ وتہذیب کو دلنشیں انداز میں پیش کیا کہ مخالف بھی اس کی عظمت ماننے کے لئے تیار ہو جائے ادب وتنقید کو تقلیدی عنصر، تکلف اور تصنع سے نکال کر ایک نیا رنگ وآہنگ دیا۔ ادب وشاعری کو اعلیٰ نصب العین اور مقصد عطا کیا۔مجموعی طور پر اس ادارے نے اپنے صالح اور وقیع لٹریچر کی تخلیق سے اردو زبان وادب کو مالا مال کر دیا۔

اس ادارے کے رفقاء اور مصنفین مشینری اسپرٹ کے ساتھ انتہائی خاموشی سے، پروقار طریقے پر اپنا کام کرتے ہیں۔انہوں نے نہ کبھی ستائش کی تمنا کی ہے اور نہ صلہ کی پرواہ۔یہی وجہ ہے کہ ان کی پر خلوص خدمات ہماری زبان و ادب کا قابل فخر سرمایہ بن گئیں۔'' (دارالمصنفین کی ادبی خدمات، ص:۸)

مولانا سید سلیمان ندوی کی ضخیم ''حیات شبلی'' سے استفادہ آسان کام نہیں ہے۔شیفتگان شبلی کی اس مشکل کے حل کے لئے عبدالرزاق قریشی نے محض ۱۵۴ر صفحات میں ''حیات شبلی'' کی تلخیص کی ہے جو ۱۹۶۰ء میں بمبئی سے شائع ہوئی ہے۔دیباچہ میں اس کے اسباب تالیف میں عبدالرزاق قریشی نے لکھا ہے کہ

''ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد مسلمان نہ صرف سیاسی حیثیت سے بلکہ مذہبی وتہذیبی لحاظ سے بھی بہت پستی کی حالت میں آگئے تھے۔سرسید پہلے شخص تھے جنہیں مسلمانوں کی اس زبوں حالی کا احساس ہوا اور انہوں نے اپنی ساری عمر اپنی قوم کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔سرسید نے جو کام شروع کیا تھا وہ اہم بھی تھا اور وسیع بھی۔اس کو انجام دینے کے لئے انہیں متعدد رفقا کی ضرورت تھی۔ان کے رفقاء میں مولانا شبلی کا نام سب سے اہم اور نمایاں ہے۔مولانا نے مسلمانوں کی حیات بخش روایات کو

زندہ رکھتے ہوئے موجودہ عہد کے تقاضوں کی تکمیل کی بھی پوری کوشش کی۔یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد جو پود تیار ہوئی اس نے سب سے زیادہ شبلی کا اثر قبول کیا اور آج بھی انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ اثر شبلی ہی کا ہے۔'' (خلاصہ حیات شبلی، ص:د)

---

(۱۰۹)

مولانا حسن مثنیٰ ندوی

[۱۹۱۳-۱۹۹۸ء]

مولانا حسن مثنیٰ ندوی ندوہ کے ممتاز فرزند، عالم دین اور اہل قلم تھے۔انہوں نے مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی کی مشہور و مقبول سیرت ''پیغمبر انسانیت'' جسے ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے شائع کیا ہے، اس کا مقدمہ سپرد قلم کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ بڑا عالمانہ اور محققانہ مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں برصغیر کے سیرت نگاروں کا تعارف و تجزیہ اور ان کی کتاب سیرت کے معیار و مقام پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔اس ضمن میں علامہ شبلی، ان کی سیرۃ النبی اور جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

''اسی زمانہ میں دوسری طرف مولانا شبلی نعمانی بھی سیرت النبیؐ مرتب کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے بلکہ کچھ کام شروع بھی کر دیا تھا، لیکن ان کا پیمانہ عمر جلد ہی لبریز ہو گیا۔شبلی نے ابتدا کی مگر وہ ان کا آخری دور تھا اور کچھ ہی عرصے بعد بستر مرگ پر پہنچ کر انہوں نے یہ امانت سید سلیمان ندوی کے سپرد کی اور آنکھیں موند لیں۔

جب پہلی مرتبہ لوگوں کو معلوم ہوا کہ مولانا شبلی نعمانی بھی سیرت النبی لکھ رہے ہیں تو ایک اخبار (الوطن، لاہور مدیر انشاء اللہ خاں) نے لکھا کہ ''جب قاضی سلیمان منصور پوری سیرت لکھ ہی چکے تو اب اس کی کیا ضرورت ہے اور اس سے

زیادہ کیا کچھ لکھا جاسکتا ہے؟''

لیکن اخبار مذکور نے یہ محسوس نہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اتنی جامع ہے اور سیرت پاک ایک ایسا نگینہ ہے، جس کے ہزاروں پہلو ہیں اور لکھتے وقت انسان کی محدود نگاہ ایک یا چند پہلو سے آگے نہیں بڑھتی۔ خود یورپ میں حضور کی سیرت پر بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ بعضوں کا تو خیال ہے کہ ڈھائی ہزار سے کم نہیں لکھی گئیں۔ اس بیان کو انتہائی مبالغہ بھی قرار دیا جائے جب بھی ان کی تعداد کچھ معمولی نہیں رہتی۔ مشہور سیرت نگاروں میں ایڈورڈ گبن، جان ڈیون پورٹ، لیپارڈ، کارلائل، وغیرہ کو کون نہیں جانتا؟ انہوں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ ایک مورخ پہلے سیرت لکھ چکا ہے تو اب ہمارے لئے کوئی گنجائش کہاں باقی ہے؟

بہر حال مولانا شبلی نے سیرت النبی کا آغاز کیا لیکن اس کی تکمیل نہ کر سکے، قرعہ فال پھر ایک سلیمان ہی کے نام پڑا اور فضائے علم وتحقیق علامہ سید سلیمان ندوی کے نام گونج اٹھی۔............

سیرت کی ساری جلدیں آپ کے سامنے ہیں۔ اس کی عالم گیر مقبولیت واہمیت کا اندازہ لگانا بھی دشوار نہیں۔ ایک سرسری نظر اس کی خصوصیات پر ڈالئے:

۱۔ اس کی زبان ایسی معیاری اور اتنی بلند ہے کہ اردو ادب بہت کچھ ترقیاں کرنے کے باوجود ابھی تک اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

۲۔ سیرت نگاری میں جذبات کا عنصر اتنا ہی رکھا گیا ہے، جتنی اس کی ضرورت ہے۔ دل سے زیادہ دماغ کو پیش کیا گیا ہے۔ اس دور عقلیت کے عقلیت پسندوں، جدید تعلیم یافتوں، روشن خیالوں، مسلمانوں اور نامسلمانوں سب کے لئے یکساں موثر، اپیلنگ اور تسکین بخش ہے۔

۳۔ روایات پر محققانہ، مورخانہ اور ناقدانہ بحثیں ہر جگہ نمایاں ہیں۔ جس روایت کو رد کرنا مقصود ہو اس کے لئے عمدہ عقلی توجیہ پیش کی گئی ہے۔ اور ایسے

نازک موقعے پر بھی علمی سنجیدگی میں ذرا فرق نہیں آتا۔ غیر ضروری اور مبالغہ آمیز روایات سے احتراز کیا گیا ہے، وہ بھی دلیل کے ساتھ

۴۔ مغربی مفکرین کی تمام قدیم وجدید متعصبانہ نکتہ چینیاں پیش نظر رہی ہیں بلکہ ان مباحث میں عموماً ہتھیار تک ان ہی کے استعمال کئے گئے ہیں، مگر بحث کے انداز میں کہیں جوابی رخ نہیں ہے۔ اور بحثیں اس حسن کے ساتھ کی ہیں کہ مسائل زیر بحث کے تمام پہلو ابھرتے اور نکھرتے چلے جاتے ہیں۔

۵۔ ملت کو عقلی ارتقا کی طرف لے جانے کی غرض سے قدیم انداز کو جدید اقدار کے قالب میں ڈھالنے کا ایک عمدہ نمونہ پیش کیا گیا اور جدید علم کلام کی شاندار رہنمائی کی گئی ہے۔

۶۔ رسول پاک کی سیرت پر ہر جگہ انسانی نگاہ ڈالی گئی ہے اور پڑھنے والا یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انسانیت کا ہمدرد، بلند اقبال کا محافظ، اعلیٰ کردار کا حامل، سعی پیہم کا پیکر، افکار عالیہ کا مخزن بن کر اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے اگر کوئی واحد نمونہ ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ کی پاک سیرت ہے:

ولقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ

مسلمانوں ہی کے لئے نہیں ساری دنیا کے لئے کافۃ للناس بشیراً و نذیراً

معجزات نبوی کے لئے ایک پوری جلد وقف کی ہے اور اس میں معجزے کی حقیقت اور مقام پر عقلی حیثیت سے ایسی پر مغز بحث کی ہے کہ اردو میں تو کیا دوسری زبانوں میں بھی ایک جگہ اتنا بڑا اور ایسا ذخیرہ نہیں ملے گا۔ پھر تمام صحیح معجزات ایک ایک کر کے اس طرح سمیٹا ہے کہ دوسری تمام کتابوں سے بے نیاز کر دیا۔ پھر ان سب پر مدلل عقلی اور سائنٹفک بحثیں کی ہیں۔

....

۱۰۔ سیرت النبی کی یہ تمام جلدیں اپنی وسعت مضامین ومعلومات اور جامعیت مسائل حیات کے لحاظ سے اسلامی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔"

(پیغمبر انسانیت، ص:۳-۸)

(۱۱۰)

سید جمیل احمد نقوی

[۱۹۱۴-۱۹۹۹ء]

سید جمیل نقوی نے منشی محمد امین زبیری کی کتاب ''شبلی کی رنگین زندگی'' کو نئی ترتیب دے کر ۱۹۵۲ء میں دوبارہ شائع کیا۔ اس پر انہوں نے چند صفحات کا دیباچہ بھی لکھا ہے۔ اس میں اولاً ایشیائی سوانح نگاروں کو اس بات کے لئے کوسا گیا ہے کہ وہ صاحب سوانح کو دیوتا بنا کر پیش کرتے ہیں اور اس طرح وہ فطرت سے انصاف نہیں کرتے۔ پھر لکھتے ہیں:

''اس مختصر تبصرہ کی بنیاد کلیتاً ان خطوط پر ہے جو مولانا شبلی نے خاندان فیضی کی خواتین کو لکھے تھے۔ جوں جوں ہم ان کا غائر نظر سے مطالعہ کرتے ہیں یہ حقیقت واضح ہوتی جاتی ہے کہ ان کے ساتھ مولانا شبلی کو جو لگاؤ تھا اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مولانا اپنے سابقہ خشک زاہدانہ ماحول سے نکل کر دفعتاً ایک زیادہ خوشگوار اور حیات افروز ماحول سے دوچار ہوئے، جس نے ان کے خوابیدہ جمالیاتی احساسات کو بیدار کر دیا۔ ہم ان کے اس لگاؤ کو زیادہ سے زیادہ فلاطونی وضع کا معصوم عشق ہی قرار دے سکتے ہیں۔'' (شبلی کی رنگین زندگی، ص:۶)

جن لوگوں نے علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ کی حیات و خدمات اور کارناموں کا گہرائی سے مطالعہ نہ کیا ہو ان کے غلط راہ پر ڈالنے اور علامہ شبلی کی روشن شبیہ کو داغدار کرنے کے لئے مذکورہ بالا اقتباس کافی ہے۔ لیکن جو اہل ذوق علامہ شبلی کی ذات اور کارناموں سے واقف ہیں وہ ان خیالات کو کبھی خاطر میں نہیں لائیں گے۔ مثلاً عطیہ فیضی سے ان کی خط و کتابت کا سلسلہ ۰۸-۱۹۰۷ء میں قائم ہوا۔ کیا اس وقت علامہ شبلی جیسے عالم و مصنف کی عمر عشق و عاشقی کی طرف توجہ کے قابل رہی ہوگی؟ اور وہ بھی اس وقت جب انہوں نے ندوۃ العلما کے کاموں کو اپنے سر لے رکھا تھا۔ ہاں ان کے والد سے علامہ شبلی کے جو تعلقات تھے اس کو سامنے رکھا جائے تو دوست کی بیٹی کے ساتھ بیٹی جیسے معاملات کسی لاعلم کو دھوکہ میں ڈال سکتے ہیں۔

علامہ شبلی ایک زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ کیا دوسرے زمینداروں کو فواحش کے جو سامان میسر تھے کیا وہ علامہ شبلی کو حاصل نہیں ہو سکتے تھے؟ یا حاصل نہیں تھے؟ علامہ شبلی اس نظام کے بھی خلاف رہے اور مدۃ العمر انہیں نصیحتیں کرتے رہے کہ رعایا پر ظلم و جبر کسی صورت جائز نہیں۔ دراصل علامہ شبلی کی بلند شخصیت کو داغدار کرنے کے لئے یہ ایک بڑی سازش تھی، جسے کبھی ادب کے نام پر، کبھی تحقیق کے نام اور کبھی شاعری کے نام پر روا رکھا گیا۔

---

(۱۱۱)

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی

[۱۹۱۵-۱۹۹۸ء]

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، رودولی کے ایک ممتاز خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ابتدائی تعلیم رودولی میں حاصل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے ایم اے او کالج علی گڑھ گئے۔ وہاں سے ایم اے، پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ تحصیل علم کے بعد ڈھاکہ یونیوٹی کے شعبہ اردو میں استاد مقرر ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ ۱۹۹۸ء میں وہیں وفات پائی۔

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی پہلے شخص ہیں جنہوں نے علامہ شبلی پر تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی لکھا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکھا۔ چونکہ رودولی اور علی گڑھ دونوں مقامات سے علامہ شبلی کا تعلق تھا۔ غالباً اسی بنا پر انہوں نے اپنے مقالے کے لئے علامہ شبلی کا انتخاب کیا۔ ان کے متعدد مضامین بھی علی گڑھ میگزین، ماہنامہ خاور ڈھاکہ اور دیگر رسائل میں شائع ہوئے۔ ان کی تین اہم ادبی کاوشیں شائع ہوئیں۔ شبلی ایک دبستان، گلہائے داغ اور صہبائے مینا۔ ''شبلی ایک دبستان'' کو عموماً لوگ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ دیتے ہیں، مگر وہ اس کا اختصار ہے۔ شبلی ایک دبستان کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں ڈھاکہ سے شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن دارالمصنفین نے شبلی صدی ۲۰۱۴ء کے موقع پر شائع کر دیا ہے جو دستیاب ہے۔ البتہ ان کے شاندار تحقیقی مقالہ تصانیف کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ کی طرف اب تک کسی نے توجہ نہیں دی اور وہ اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔

(۱۱۲)

علی جواد زیدی

[۱۹۱۶-۲۰۰۴ء]

علی جواد زیدی اپنے عہد کے نامور ادیب، شاعر، نقاد اور ادبی مورخ تھے۔ان کا وطن ضلع اعظم گڑھ کا ایک مشہور اور قدیم قصبہ محمد آباد گہنہ ہے۔ابتدائی اور ثانوی تعلیم محمد آباد میں اور اعلی تعلیم لکھنو یونیورسٹی سے حاصل کی۔مختلف عہدوں پر کام کیا اور نیک نام رہے۔اردو زبان وادب اور تصنیف وتالیف سے ہمیشہ سروکار رکھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار اردو کے بڑے اور کثیر التصانیف مصنفین میں ہوتا ہے۔انہوں نے متعدد اہم کتابیں لکھیں، جن کے نام یہ ہیں:

مثنوی نگاری، دہلوی مرثیہ گو، میر انیس، فکر وریاض، دو ادبی اسکول، کمال ابوالکلام، انوار ابوالکلام، اسلامی ترقی پسندی، تعمیری ادب، غبار کارواں، اردو میں قومی شاعری کے سو سال، اتر پردیش میں اردو مرثیہ نگاری، نغمہ آزادی، آپ سے ملئے، انتخاب رند، قصیدہ نگاران اتر پردیش ،تاریخ ادب کی تدوین، تاریخ مشاعرہ، پیام آزادی وغیرہ۔

متعدد شعری مجموعے جیسے میری غزلیں، دیار سحر، رگ سنگ وغیرہ شائع ہوئے۔ان کا شمار ہماری شاعری کے اچھے مجموعوں میں ہوتا ہے۔

یہ علامہ شبلی نعمانی سے متاثر تھے۔اپنی متعدد تصنیفات وتالیفات میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اوران کے اذکار سے محسوس ہوتا ہے کہ علامہ کے فکروفن پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔انہوں نے اپنی کتاب ''قومی شاعری کے سو سال'' میں علامہ شبلی کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''شروع شروع میں کانگریس پر اعتدال پسندوں کا قبضہ تھا جو اصلاحات ہی کے دائرے میں سوچتے تھے۔اودھ پنچ کا گروہ اس کی حمایت کرتا ہی رہتا تھا، لیکن اور بھی بہت سے مقامی اخبارات اور شاعر وادیب ایسے تھے جو اس اعتدال پسندانہ سیاست کے نقیب تھے۔یہ مراعات کے طالب تھے۔یہ برطانیہ کی لائی ہوئی نئی زندگی سے متاثر اور اس کے مداح تھے، لیکن آہستہ آہستہ ایک آزادی پسند طبقہ بھی

نشو ونما پا رہا تھا۔ اور اس کو حکومت برطانیہ کے نمائندے محسوس کرنے لگے تھے۔ اس کے توڑنے کے لئے انہوں نے سر آکلینڈ کالون لفٹننٹ گورنر صوبہ جات شمالی مغربی (اتر پردیش) کے زمانے (۱۸۸۸ء) سے ہی یہ پروپگنڈا شروع کر دیا تھا کہ مسلمان کانگریس کے خلاف ہیں۔ سر سید اور ڈپٹی نذیر احمد نے اس خیال کو کچھ تقویت ہی دی۔ سر سید تو صرف بالواسطہ اپنی اصلاحی اسکیموں کے باعث اس تصویر میں آگئے، لیکن ڈپٹی نذیر احمد نے تو باقاعدہ کانگریس کی مخالفت کی، لیکن جس نے ان دونوں کی آوازیں اپنی آواز کی گرمی اور تیزی سے دبا رکھی تھی وہ شبلی نعمانی تھے۔ شبلی نے اس مسلم لیگ کی بھی شدید مخالفت کی اور اس کی سرکار پرستی کا خوب خوب بھانڈا پھوڑا جو ۱۹۰۶ء میں وجود میں آئی۔''

(اردو میں قومی شاعری کے سو سال، ص: ۴۵)

علامہ شبلی کے اردو و فارسی دونوں کلیات میں متعدد مثنویاں شامل ہیں۔ علی جواد زیدی کی کتاب مثنوی نگاری میں نہ صرف ان کی مثنویوں کا ذکر ہے بلکہ مثنوی کی اقسام اور خصوصیات پر انہوں نے شعر العجم میں جو مباحث لکھے ہیں ان کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ علی جواد زیدی نے اس بات کو اہمیت دی ہے کہ بقول علامہ شبلی صنف مثنوی تمام اصناف شاعری میں سب سے زیادہ مفید، زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے۔ (مثنوی نگاری ص: ۴۸)

اسی طرح قصیدہ نگاران اتر پردیش میں بھی علامہ شبلی اور ان کے قصائد کا ذکر کیا ہے۔ ایک مقالہ میں علامہ شبلی کے سیاسی رجحانات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

'مالک رام ایک مطالعہ' کے عنوان سے مقالات کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اس کے مرتب علی جواد زیدی ہیں۔ اس کے مفصل مقدمہ میں انہوں نے ایک بڑی عمدہ بات لکھی ہے کہ

> ''محمد حسین آزاد سے پہلے کسی کو مربوط طریقے سے تاریخ ادب پیش کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ آزاد نے ادب فارسی پر بھی نظر ڈالی لیکن اس میدان میں شبلی نعمانی کی شعر العجم مدتوں حرف آخر بنی رہی اور بعض شخصیتوں سے آج بھی ہے۔ آزاد اور شبلی دونوں کے کام رہبرانہ تھے۔ ان کے تسامحات بھی رہنمایانہ ثابت ہوئے۔

کیونکہ بعد میں لکھنے والوں کی ایک طویل قطار کا کام نکتہ چینی یا خوشہ چینی رہا۔
اگر چہ دونوں تاریخ سے سروکار رکھتے تھے، لیکن یہ دونوں ہی بنیادی طور سے تنقید
کے ہراول بنے رہے اور خالص تحقیق کے مردمیداں قرار نہیں دیے گئے۔"
(مالک رام ایک مطالعہ، ص:۵)

---

(۱۱۳)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

[۱۹۱۶-۱۹۹۴ء]

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ادیب، نقاد، محقق و مصنف کی حیثیت سے معروف ہیں۔ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سربراہ اور کولمبیا یونیورسٹی میں وزٹنگ پروفیسر رہے۔ اردو میں ایک درجن سے زیادہ کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ان کی مشہور کتاب ہے۔ جو اصلاً ان کا تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ. ڈی ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی کی کتاب "شبلی ایک دبستان" پر مقدمہ لکھا ہے۔ یہ کتاب پہلے ڈھاکہ سے غالباً ۱۹۵۷ء میں مکتبہ عارفین سے شائع ہوئی تھی۔ ۲۰۱۵ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ نے دوسرا خوب صورت ایڈیشن شائع کیا ہے۔ انھوں نے "علامہ شبلی اور اردو" اور "علامہ شبلی نعمانی" دو اہم مضامین بھی لکھے ہیں، لیکن شبلی ایک دبستان کا مقدمہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اس میں یہ واضح کیا ہے کہ علی گڑھ تحریک سے اردو کو بہت فائدہ پہنچا اور اس نے بڑی ترقی کی، جس میں علامہ شبلی کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ سرسید کے بعد اپنے معاصرین میں علامہ شبلی کو کئی وجوہ سے تفوق حاصل ہے۔ اس کی وضاحت میں وہ لکھتے ہیں:

"سرسید کے بعد اپنے معاصرین میں شبلی ہی ایک ایسے شخص ہیں جنھیں سرسید کا
پرتو کہا جا سکتا ہے۔ جن کی شخصیت سرسید کی طرح متنوع، جن کا علم اور مطالعہ

سر سید کی طرح وسیع اور دقیق اور جن کی نظر سر سید ہی کی طرح دور بیں اور حقیقت شناس تھی اور یہی وجہ ہے کہ سر سید کے ان ساتھیوں میں کسی اور کے ہاتھوں کوئی ایسی تحریک شروع نہیں ہوئی جس نے ایک تحریک یا دبستان کی حیثیت حاصل کی ہو۔شبلی کی ایک تحریک تھی جو ندوہ اور دارالمصنفین کی صورت میں بڑھی اور پروان چڑھی تھی۔ان کا ایک دبستان تھا،جس میں ان کے لائق جانشین سید سلیمان ندویؒ اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ ملک کے دور دراز گوشوں میں اسلامی تاریخ و ثقافت، زبان وادب، مذہب ومعاشرت پر لکھنے والے شبلی کے نظریات کے علمبردار ہیں اور ان کی تحریروں سے روشنی کے ایک بلند مینار کی طرح ہدایت پاتے ہیں۔" (شبلی ایک دبستان،ص:۹)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے علامہ شبلی کی متنوع شخصیت اور پھر ان کی انفرادیت کا بھی ذکر کیا ہے۔یہی نہیں ان کا خیال ہے کہ علامہ شبلی نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"شبلی صرف ایک شاعر،ادیب،انشاپرداز یا نقاد نہیں۔وہ صرف ایک مضمون نگار اور مورخ بھی نہیں۔دراصل سر سید کے بعد وہ دوسرے آدمی ہیں جنہیں عالم کہا جاسکتا ہے اور ان کے علم میں قدیم اور جدید کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔مزاج کے اعتبار سے خالص مشرقی ہوتے ہوئے بھی ان کا طریق مطالعہ،استدلال اور طرز جدید ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ محض نقال یا مقلد نہیں ہیں اور نہ ان کی تحریریں محض مغربی مصنفین کے خیالات کا خلاصہ یا ان کی صدائے بازگشت ہیں۔انھوں نے ہمیں بہت کچھ سکھایا۔" (ایضاً ص:۹-۱۰)

اس کے بعد انھوں نے علامہ شبلی کے ان کارناموں کا ذکر کیا ہے جس کے لئے وہ دنیا بھر میں مشہور ہیں۔مثلاً تاریخ کے ساتھ اعتنا اور سیرت وسوانح عمریاں لکھنا۔ادب اور تنقید کے جمود میں حرکت اور شاعری میں مقصدیت وغیرہ۔

بعض لوگوں نے خاص طور پر شیخ محمد اکرام نے انھیں سر سید تحریک کا حریف بلکہ باغی بتایا ہے۔ان کی تقلید میں بعض دیگر اہل قلم نے بھی بلا سوچے سمجھے غیر شعوری طور پر اس بات کو دہرایا

ہے۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ان لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ شبلی سرسید اور علی گڑھ تحریک کے باغی تھے۔ بغاوت کا جذبہ ان میں ضرور تھا لیکن اسے بغاوت کہنے کے بجائے آزادی فکر اور اپنی رائے پر خود اعتمادی کے جذبہ کے نام سے بھی پکارا جا سکتا ہے۔"

(شبلی ایک دبستان، ص:۱۱)

---

(۱۱۴)

مولانا محمد یوسف کوکن

[۱۹۱۶-۱۹۹۰ء]

مولانا محمد یوسف کوکن دبستان شبلی کے ایک اہل قلم اور محقق و مصنف تھے۔ان کی کتب اور تحقیقی مقالات خاص طور پر ان کے دبستان شبلی کا فرد ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔وہ مدراس کے قصبہ مینم بور میں ۴؍نومبر ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔دارالسلام عمرآباد سے تکمیل کے بعد افضل العلماء کی سند مسلم کالج مدراس سے حاصل کی۔تصنیف و تالیف کی مشق و ممارست کے لئے دارالسلام نے دارالمصنفین بھیجا۔چنانچہ وہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک دارالمصنفین میں مولانا سید سلیمان ندوی کے زیر تربیت رہے۔اس زمانہ میں انہوں نے ماہنامہ معارف میں بڑے تحقیقی اور عالمانہ مقالات لکھے۔اس کے بعد جدید تعلیم کے لئے وہ مدراس واپس چلے گئے اور وہاں نہ صرف جدید تعلیم حاصل کی بلکہ یونیورسٹی آف مدراس کے شعبہ عربی کے سربراہ منتخب ہوئے۔

دارالمصنفین میں انہیں مولانا سید سلیمان ندوی نے امام ابن تیمیہ پر تحقیق و تصنیف کا کام سونپا تھا، مگر وہ پورا کئے بنا ہی مدراس لوٹ گئے تھے۔تاہم ان کے دل سے اس کا خیال نہ گیا اور انہوں نے نہایت محنت و تحقیق سے علامہ ابن تیمیہ پر کتاب لکھی جو ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔

اہل علم واقف ہیں کہ اردو داں حلقہ کو سب سے اول امام ابن تیمیہ سے علامہ شبلی نے واقف کرایا تھا۔اور یہی وجہ تھی کہ دارالمصنفین ان کی مفصل سوانح عمری شائع کرنا چاہتا تھا۔مولانا

محمد یوسف کوکن اس سے بخوبی واقف تھے۔ اس کا ذکر انہوں نے کتاب کے مقدمہ میں اس طرح کیا ہے:

''یہاں کے اردوداں طبقے کو امام ابن تیمیہ کی حقیقی عظمت و منزلت سے جس نے سب سے پہلے روشناس کرایا وہ شاید مولانا شبلی نعمانی مرحوم تھے۔ آپ نے جولائی ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں علامہ ابن تیمیہ حرانی کے متعلق مجددان اسلام کے سلسلے کے تحت ایک بہت ہی دلچسپ مضمون لکھا۔ آپ نے انہیں سب سے بڑا مجدد اور رفارمر قرار دیا تھا۔ اس وقت مولانا نے مجدد اور رفارمر ہونے کی تین ضروری شرطیں قرار دی تھیں، یعنی:

۱۔ مذہب یا علم یا سیاست (پالیٹکس) میں کوئی مفید انقلاب پیدا کرے

۲۔ جو خیال اس کے دل میں آیا ہو وہ کسی کی تقلید سے نہ آیا ہو بلکہ وہ اس کا اپنا اجتہاد ہو۔

۳۔ جسمانی مصیبتیں اٹھائی ہوں۔ جان پر کھیلا ہو اور سرفروشی کی ہو۔

مولانا نے اس وقت یہ بھی لکھا تھا کہ اگر تیسری شرط ضروری قرار نہ دی جائے تو امام ابوحنیفہ، امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب بھی اس دائرے میں آسکتے ہیں، لیکن جو شخص رفارمر کا اصلی مصداق ہو سکتا ہے وہ علامہ ابن تیمیہ ہے۔

مولانا شبلی نے اپنا یہ خیال بھی ظاہر فرمایا تھا کہ بہت سے امور میں امام غزالی وغیرہ کو ابن تیمیہ پر ترجیح حاصل ہے لیکن وہ امور مجددیت کے دائرے سے باہر ہیں۔ مجددیت کی اصلی خصوصیتیں جس قدر علامہ کی ذات میں پائی جاتی ہیں، اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔''

(امام ابن تیمیہ، مقدمہ، ص: ۲۵)

(۱۱۵)

پروفیسر محمد سید صدرالدین فضاؔ شمسی

[۱۹۱۷-۱۹۷۷ء]

پروفیسر سید محمد صدرالدین فضاؔ شمسی اپنے عہد کے ممتاز ادیب، شاعر، نقاد اور استاد ادب اردو تھے۔ بہار اردو اکادمی کے سکریٹری رہے۔ پٹنہ کالج اور پٹنہ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کی صدارت بھی کی۔

پروفیسر فضاؔ شمسی نے پٹنہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ٹرپیل ڈی لٹ تھے۔ پروفیسر عظیم الدین اور پروفیسر کلیم الدین احمد [۱۹۰۸-۱۹۸۳ء] کے تلامذہ میں تھے۔ متعدد ادبی کتب کے مولف و مصنف تھے۔ غزلوں کا مجموعہ نکہت و خلش اور نظموں کا مجموعہ شگفتہ کانٹے شائع ہوئے۔ انتخاب کلام سودا بھی ان کی ایک کاوش ہے۔ اپنے استاد پروفیسر کلیم الدین احمد کی دو کتابوں ۲۵ نظمیں اور ۴۲ نظمیں کا تنقیدی جائزہ شائع کرایا ہے۔

پروفیسر فضاؔ شمسی علامہ شبلی نعمانی سے بہت متاثر تھے۔ وہ علامہ کے مذہبی مقالات کا ایک انتخاب شائع کرنے کے متمنی تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''اگر چہ علامہ موصوف پر ابھی تک کافی ریسرچ ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ حیات شبلی کی اشاعت کے بعد تو علامہ موصوف کی اور سماجی زندگی کا کوئی قابل اعتنا پہلو نہیں چھوٹتا۔ پھر بھی زندگی کی جن قدروں کی طرف علامہ موصوف نے انگشت ہدایت اٹھائی تھی ان پر سائنٹیفک طور سے کام ہونے کی گنجائش باقی ہے۔ قوم کے اس ریفارمر نے سب سے پہلے قومی ترقی کے لئے مذہب کی ضرورت سمجھی اور مختلف عنوانوں سے مذہب کی اہمیت پیش کی۔''
>
> (گذارش: چند مقالات شبلی)

پروفیسر فضاؔ شمسی نے علامہ شبلی کے چند مقالات ان کے مختصر حالات و سوانح کے ساتھ شائع کرائے ہیں۔ اس میں علامہ کے ادبی پہلوؤں کو خاص طور پر اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس میں علامہ مرحوم کے ۸/اہم اور مشہور مقالات شامل ہیں۔ یہ انتخاب بحیثیت مجموعی ایک عمدہ انتخاب ہے۔البتہ سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔

پروفیسر فضا شمسی علامہ شبلی کے مذہبی مقالات کا انتخاب جو ان کی آرزو تھی شائع نہ کر سکے، اس کے لئے انہوں نے دارالمصنفین سے بھی رابطہ قائم کیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس انتخاب کے سوا انہوں نے علامہ شبلی نعمانی شخصیت پر کوئی اور کام کیا ہو۔مگر اس انتخاب سے ان کے مطالعہ شبلی کی گہرائی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ افکار شبلی پر وہ بھر پور نظر رکھتے تھے۔

---

(۱۱۶)

مفتی محمد رضا انصاری

[۱۹۱۷-۱۹۹۰ء]

مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی ،فرنگی محل کے ایک روشن چراغ تھے۔ وہی فرنگی محل جس کے بارہ میں علامہ شبلی نے بڑا عمدہ مقالہ لکھا ہے اور اسے علم وفن کا معدن قرار دیا ہے۔اس کے بانی ملا نظام الدین پر بھی علامہ شبلی نے ایک وقیع مقالہ لکھا ہے۔ جو مقالات شبلی حصہ سوم میں شامل ہے۔

مفتی محمد رضا انصاری نامور عالم دین ،اہل قلم اور اردو و فارسی کے ممتاز ادیب، نقاد اور مصنف و محقق تھے۔ان کا علم بڑا گہرا اور مطالعہ بہت وسیع تھا۔ان کے قلم سے متعدد عمدہ کتابیں نکلیں۔ان میں مفتی صاحب، مجذوب اوران کا کلام، بانی درس نظامی، حضرت سید صاحب بانسوی، انتخاب حسرت موہانی، منتخب غزلیں، حج کا سفر، ادب الجاہلی وغیرہ شامل ہیں۔

ابتدا میں وہ صحافت سے وابستہ ہوئے اور متعدد رسائل وجراید سے وابستہ رہے۔ پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات میں لکچرر ہو گئے اور پھر وہیں سے وظیفہ یاب ہوئے۔اس شعبہ کی بھی انہوں نے بڑی خدمت کی۔

انصاری صاحب اردو اکادمی لکھنو کے چیرمین بھی رہے۔اس حوالہ سے بھی ان کی بڑی خدمات ہیں۔انہی کے زمانہ میں مرزا علی لطف کا تذکرہ گلشن ہند اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو نے

۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔ تذکرہ گلشن ہند کو اولاً علامہ شبلی نے مرتب کیا تھا جس میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے نہ جانے کیوں علامہ شبلی کا مقدمہ ہٹا کر اپنا مقدمہ شامل کردیا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں یہی ایڈیشن شائع ہوا۔ اس کے بعد کی جتنی اشاعتیں ہیں سب اسی کا عکس ہیں۔

اردو میں تحقیق متن کا یہی پہلا کام ہے اور اس کے آغاز کا فخر علامہ شبلی کے حصہ میں آیا، مگر مولوی عبدالحق کی زیادتی کے سبب اس کا سہرا ان کے سر سو برس تک نہ بندھ سکا۔ حالانکہ اب عام اعتراف کیا جاتا ہے۔ مفتی رضا انصاری صاحب نے گلشن ہند کا جو ایڈیشن اکادمی کی جانب سے شائع کرایا ہے اس سے بابائے اردو کا مقدمہ نکال دیا ہے۔ اور اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ

"البتہ زیرنظر عکسی ایڈیشن میں علامہ شبلی کے حواشی بجنسہ درج ہیں لیکن مولوی صاحب کا مقدمہ شامل اشاعت نہیں کیا گیا ہے۔، جس میں نہ صرف فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور صاحبان انگریز کی اردو خدمات کا ذکر تاریخی سے زیادہ مداحی کے انداز میں کیا گیا ہے، بلکہ علامہ شبلی نعمانی کے بعض حواشی پر نکتہ چینی کا انداز بھی معاصرانہ چشمک کا پہلو لئے ہوئے ہے۔" (تذکرہ گلشن ہند، ص:۲)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی رضا انصاری صاحب نہ صرف علامہ شبلی اور ان کے افکار اور کارناموں سے پوری طرح واقف تھے بلکہ وہ ایک جراَت مند اہل قلم بھی تھے۔

ناچیز نے گلشن ہند از علامہ شبلی پر پہلی دفعہ مفصل مقالہ لکھا، اس سے اہل علم کو واقفیت ہوئی کہ بابائے اردو نے علامہ شبلی کا مقدمہ موقوف کر کے اپنا مقدمہ شامل کیا تھا اور اس میں بھی جا بجا ان پر نقد کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی کا یہ مقدمہ دارالمصنفین میں محفوظ تھا۔ خدا جانے اب محفوظ ہے یا نہیں۔

---

(۱۱۷)

شمس بریلوی

[۱۹۱۷-۱۹۹۷ء]

مولوی شمس الحسن شمس بریلوی بڑے عالم فاضل شخص تھے۔ عربی و فارسی پر دست رس تھی۔

انہیں تراجم کا بہت شوق تھا، چنانچہ انہوں نے کئی اہم کتابوں کا ترجمہ کیا۔ترجمہ غنیۃ الطالبین، ترجمہ عوارف المعارف، ترجمہ تاریخ الخلفا، ترجمہ لطائف اشرفی وغیرہ ان کے نکلے۔علاوہ ازیں کئی طبع زاد کتابیں بھی ان کے قلم کی مرہون منت ہیں۔ان میں نظام مصطفےٰ، امام احمد رضا کی حاشیہ نگاری، سرورکونین کی فصاحت وغیرہ شامل ہیں۔ان کے اعتراف کمال میں حکومت پاکستان نے ستارۂ امتیاز اور ہلال قائداعظم ایوارڈ سے نوازا۔

انہوں نے دیوان حافظ کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے۔اوراس میں مقدمہ نہ لکھ کر علامہ شبلی نے شعرالعجم میں حافظ پر جو کچھ لکھا ہے اسے بطور مقدمہ شامل کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے خواجہ صاحب کے کلام اوران کی شاعری پر نقد وتبصرہ کرنے کے بجائے یہ بدرجہ اتم مناسب سمجھا کہ دیوان کے شروع میں مولانا شبلی مرحوم کے اس نقد و تبصرہ کو پیش کردوں جو شعرالعجم کی جلد سوم میں خواجہ صاحب پر مولانا شبلی مرحوم نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔اورحق یہ ہے کہ زبردست داد تحقیق دی ہے۔اورنقد کا حق ادا کردیا ہے۔اس سے بہتر مفید تبصرہ میری نظر سے ابتک نہیں گذرا۔اس لئے میں نے یہ خیال کیا کہ شعرالعجم کے پڑھنے والے آخر صرف چند نفوس ہیں۔بس اگراس دیوان کے ساتھ اس تنقید کو شامل کردیا جائے تو شعرالعجم کی صورت میں چند نظروں سے گذرنے والا یہ تبصرہ ہراس شخص کی نگاہوں سے گذر جائے گا جواس مترجم دیوان حافظ کا مطالعہ کرے گا۔''
>
> (دیوان حافظ مترجم محشی ،ص:۹)

---

(۱۱۸)

سلام سندیلوی

[۱۹۱۹-۲۰۰۰ء]

قصبہ سندیلہ میں علامہ شبلی کے متعدد چاہنے والے پیدا ہوئے۔انہیں میں ایک ممتاز

ادیب وشاعراور نقاد پروفیسر سلام سندیلوی بھی ہیں۔ سلام سندیلوی شعبہ اردو گورکھ پور میں استاد تھے۔ ان کا مطالعہ بڑا گہرا تھا۔ اور لکھنے پڑھنے کا بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ انہوں نے بڑے اچھوتے موضوعات پر قلم اٹھایا اور متعدد کتابیں لکھیں۔ ان میں اردو شاعری میں منظر نگاری، اردو شاعری میں نرگسیت، اردو شعرا کی بے خوابی، اردو شاعری میں لا ادریت، اردو شاعری میں خودداری، مطالعہ ومشاہدہ، مزاج وماحول، اردو رباعیات، ادب کا تنقیدی مطالعہ، ادبی اشارے، مراثی انیس: جذباتی تاویل، تصوف اور اصغر گونڈوی وغیرہ۔

سلام سندیلوی کے متعدد شعری مجموعے بھی شائع ہوئے۔ ساغر ومینا۔ خواب وخمار، برگ وبار، کعبہ میں صنم خانہ، شام وشفق، نکہت ونور وغیرہ ان کے مجموعہ ہائے کلام کے نام ہیں۔

انہوں نے علامہ شبلی پر کئی مضامین لکھے۔ ادبی اشارے میں علامہ شبلی کی اردو شاعری کا مفصل جائزہ شامل ہے۔ دوسری کتابوں میں بھی ذکر آیا ہے۔ اردو شاعری میں بھی منظر نگاری بہت عمدہ کتاب ہے۔ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''منظر نگاری کے سلسلہ میں مولانا شبلی نے بہت اہم خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے شعر العجم جلد چہارم میں بتایا ہے کہ منظر نگاری کے لئے یہ ضروری ہے کہ تخئیل کے بجائے محاکات سے کام لیا جائے۔ مولانا شبلی نے تخئیل اور محاکات کی حد بندی بھی کی ہے اور دونوں کے دائرۂ اختیار سے بحث کی ہے۔ دراصل مولانا شبلی کے خیالات منظر نگاری کے سلسلہ میں بہت اہم ہیں۔''
>
> (اردو شاعری میں منظر نگاری، ص:۱۰)

---

(۱۱۹)

علاء الدین خالد

[***]

علامہ شبلی کے مقالات کے متعدد مجموعے شائع ہوئے۔ ایک مجموعہ مقالات دہلی ولاہور

کے کئی پبلشرز نے شائع کیا۔ البتہ مولانا سید سلیمان ندوی نے تمام مقالات کا احاطہ کرتے ہوئے آٹھ جلدوں میں دارالمصنفین سے شائع کیا۔ ان کے علاوہ بھی اور مجموعہ مقالات یا انتخابات شائع ہوئے، راقم نے ''آثار شبلی'' میں ان کا تعارف و تجزیہ پیش کیا ہے۔

اسی طرح کا ایک مجموعہ کلام رضی کاظمی نے مرتب کر کے اردو پبلشرز لکھنو سے شائع کرایا ہے۔ اس کا دیباچہ علاء الدین خالد نے لکھا ہے۔ اس سے علاء الدین خالد کی علامہ شبلی سے گہری دلچسپی اور ذہنی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''شبلی نے تن تنہا وہ کچھ کیا ہے جو کسی علمی ادارہ یا اکیڈمی کے کرنے کا کام تھا۔ ان کی تمام تصانیف ایک خاص منصوبہ بندی کا نتیجہ ہیں۔ ان کا سب سے اہم مقصد اسلام کے علمی کارناموں اور مسلمانوں کی ذہنی وفکری فتوحات کو عہد حاضر کے تحقیقی انداز میں مدون کرنا تھا۔ اسی مقصد کے پیش نظر انہوں نے علم کلام اور اکابر اسلام کی سوانح عمریوں اور فارسی شاعری کی تاریخ مرتب کی۔ اس سلسلہ میں سیرۃ النبی اور مقالات شبلی کا اضافہ کر لیجئے۔ علم کلام کا ذوق شبلی میں سرسید کی صحبت سے پیدا ہوا تھا، لیکن اس علم کی تدوین شبلی کی اولیات میں سے ہے۔''

(انتخاب مقالات شبلی، ص:۸-۹)

''شبلی کے بغیر ہم اردو نثر کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ شبلی نے عربوں کی علمیت اور سوز دروں، یونانیوں کے تصور حسن، عجم کے حسن طبیعت اور ہندوستانی ذہن کی شوخی کے رنگوں سے اردو ادب کے در و بام کو سجایا۔'' (ایضاً ص:۱۲)

---

(۱۲۰)

پروفیسر ممتاز حسین

[۱۹۱۸-۱۹۹۲]

نامور ترقی پسند ادیب و نقاد اور محقق و مصنف پروفیسر ممتاز حسین نے مفتون احمد کی کتاب

''مولانا شبلی: ایک مطالعہ'' پر دیباچہ لکھا ہے۔ گو وہ مفتون احمد سے واقف نہیں تھے، مگر ان کے تنقیدی مضامین سے بہت متاثر ہیں۔ اوران کی تصنیفی صلاحیت کی داد دی ہے۔

مفتون احمد [۱۹۲۹-۱۹۷۴ء] مولانا عبدالسلام ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۶ء] کے نواسے اور علامہ شبلی کے چچازاد بھائی کے پوتے تھے۔ موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی اور تاریخ میں ایم اے اور قانون میں ایل ایل بی کی اسناد لیں۔ پاکستان سول سروس کا امتحان پاس کر کے اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے۔ مختلف وقتوں میں ڈپٹی کمشنر، ڈائرکٹر فیملی پلاننگ، ڈپٹی سکریٹری وزارت خوراک، ایسوسی ایٹ سمینٹ لاہور کے فائنانس ڈائرکٹر کے عہدوں پر فائز رہے۔ ۹ رنومبر ۱۹۷۴ء کو ہارٹ اٹیک سے انتقال کیا۔ اور خفتگان خاک کراچی کی صف میں شامل ہو گئے۔

مفتون احمد صاحب کا مطالعہ وسیع تھا اور ادبیات پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ انھیں تحریر و تصنیف کا بھی عمدہ سلیقہ تھا۔ وہ نیاز فتحپوری کے نگار کے بڑے مضمون نگاروں میں تھے۔ علامہ شبلی کی شخصیت اوران کے افکار وخیالات پر انھوں نے متعدد اہم مضامین لکھے۔ ''مولانا شبلی ایک مطالعہ'' انھیں مضامین کا مجموعہ ہے۔ علامہ شبلی سے متعلق مضامین کے جو مجموعے ۸۰ء کے عشرے میں شائع ہوئے، ان میں اس مجموعہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ البتہ مفتون احمد صاحب نے علامہ شبلی پر بعض بڑی بے باکانہ تنقیدیں کی ہیں۔

پروفیسر ممتاز حسین نے بھی اس مجموعہ کی تحسین کی ہے اوراس کے مطالعہ کے لئے مہمیز کیا ہے۔ علامہ شبلی کے متعلق کئی باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً ان کا خیال ہے کہ

> ''اگر شبلی کا قیام کچھ دنوں تک علی گڑھ میں نہ ہوتا اور اس زمانے میں انھیں براہ راست سرسید احمد خاں سے استفادہ کرنے کا موقع نہ ملا ہوتا تو وہ ایک ماڈرن یا روشن خیال مولوی نہ بن پاتے، لیکن شبلی کے ذہنی ارتقا کی یہ کڑی ان کی تصنیفات کے مطالعہ کے سلسلے میں اتنی اہم نہیں ہے جتنی کہ ان کی قوت مدافعت کہ انھوں نے اپنے جذبہ آزادی کو سرسید احمد خاں کی تعلیم غلامی سے محفوظ رکھا۔ ہر چندیہ بھی صحیح ہے کہ سیدی مصلحت اندیشی کا کچھ اثر ان میں بھی نفوذ کر گیا تھا۔''

(دیباچہ مولانا شبلی ایک مطالعہ، ص:۱۰)

پروفیسر ممتاز حسین کی ترقی پسندی کے نقطہ نظر نے علامہ شبلی پر بعض تنقیدیں روا کردی ہیں مثلاً وہ علامہ شبلی کو ایک متعصب مسلمان مورخ قرار دیتے ہیں اور بطور شہادت ''مضامین عالم گیر'' کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسی طرح علامہ شبلی کی تاریخی کتابوں کو اسلامی رومانیت بتاتے ہیں اور پھر اس رومانیت پر تبصرہ کرتے ہیں کہ

''اس اسلامی رومانیت سے جہاں ایک فائدہ ہندی مسلمانوں کو یہ پہنچا کہ مغرب کے مقابلے میں ان کا احساس کمتری کم ہوا، وہاں یہ نقصان پہنچا کہ وہ ماضی کے سحر زدہ ہو گئے۔ روشن مستقبل کا خواب دیکھنے کے بجائے سنہرے ماضی کا خواب دیکھنے لگے۔'' (ایضاً، ص:۱۱)

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ علامہ شبلی نے مغرب کو قبول کیا، مگر جس قدر قبول کیا وہ ترقی کے لئے ناکافی تھا۔ البتہ وہ علامہ شبلی کی شاعری کے کسی قدر مداح ہیں۔ وہ علامہ کی شاعری کو مہر و وفا کی شاعری قرار دیتے ہیں اور یہ بھی کہ اس میں خوئے آزادی کا جذبہ موجود تھا، لیکن بحیثیت مجموعی انھیں بڑا شاعر تسلیم نہیں کرتے بلکہ ایک نئی اصطلاح میں خوشگوار شاعر قرار دیتے ہیں۔ وہ علامہ شبلی کو بڑا مفکر بھی تسلیم نہیں کرتے، لیکن ان کے ادبی مذاق کے بڑے قائل ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اگر شبلی بحیثیت ایک ناقد کے اردو ادب کے کوچے میں قدم نہ رکھتے تو شاعری سے متعلق ہمارا مذاق صحیح کب کا بگڑ چکا ہوتا۔ کیا شعرالعجم اور کیا موازنہ انیس و دبیر، ان دونوں کتابوں نے ہمیں اس بدمذاقی سے بچایا ہے جو یاروں نے پیروی مغرب میں پیدا کر رکھی تھی اور جس کا سلسلہ ابھی تک بعض حلقوں میں جاری ہے اور پھر شبلی کا انداز بیاں کتنا فطری، واضح، سبک اور گوارا ہے۔ تنقید میں شبلی سے بہتر اسلوب تو کسی اور کا نظر آتا نہیں ہے۔''

(ایضاً، ص:۱۲)

(۱۲۱)

مولانا مجیب اللہ ندویؒ

[۱۹۱۸-۲۰۰۶ء]

حضرت الاستاد مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی بانی جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا شمار ہندوستان کے نامور علماء میں ہوتا ہے۔ وہ ایک بڑے فقیہ اور مصنف تھے۔ ایک درجن سے زیادہ بلند پایہ اور محققانہ کتابیں انہوں نے لکھی ہیں۔ مولانا کی متعدد کتابیں ایسے موضوعات پر ہیں جن پر پہلی بار قلم اٹھایا گیا ہے۔ ان کی اس انفرادیت کا بڑے بڑے اہل علم ودانش نے اعتراف کیا ہے۔ ان کی تصنیفات کے نام یہ ہیں:

اہل کتاب صحابہ وتابعین، فتاوی عالمگیری اوران کے مولفین، تبع تابعین حصہ اول، اسلام کے بین الاقوامی اصول وتصورات، اتحاد ملت کیوں اور کیسے، اجتہاد اور تبدیلی احکام، اسلامی تعلیم (۶ر حصے)، اسلامی فقہ (۴ر حصے)، اسلامی قانون اجرت، اسوۂ حسنہ، افکار سلیمانی، انوار محمدی ترجمہ شمائل ترمذی (مرتبہ)، اہل دل کی باتیں، ایمان وعقیدہ، ثبوت رجم، تذکرہ حضرت مولانا کرامت علی جون پوری، جان ومال اور عزت وآبرو کا تحفظ، خدمت حدیث میں خواتین کا حصہ، خطبہ نکاح، دینی مدارس اوران کی ذمہ داریاں، ذکرودعا، ریاض الحدیث، سیرت نبویؐ، سرمد اور ان کی رباعیاں، عبادت وخدمت، فقہ اسلامی اوردور جدید کے مسائل، قرآن پاک کی تعلیم اوراس کی عظمت، کاروان رفتگاں، مسئلہ کفائت، نقوش زندگی، نماز اور خشوع وتواضع، وقت ایک دولت ہے، اسفار مجیب وغیرہ

مولانا مرحوم کا اگرچہ وطن ضلع غازی پور کا ایک موضع کسمی تھا، لیکن وہ اعظم گڑھ کے ایک قصبہ گھوسی میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد داروغہ کے عہدہ پر تعینات تھے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ یعقوبیہ جامع مسجد اعظم گڑھ میں ہوئی۔ پھر قرآن پاک حفظ کرنے کے لئے غازی پور گئے۔ عربی وفارسی کی ثانوی تعلیم مظہر العلوم بنارس میں اوراعلی تعلیم ندوے میں ہوئی۔ فراغت کے بعد ۱۹۴۴ء میں سید صاحب کی خواہش پر دارالمصنفین آئے۔ اور رفیق مقرر ہوئے۔ ۲۲ر برس بعد ۱۹۶۶ء میں

ناظم شاہ معین الدین احمد ندوی سے بعض ناچاقیوں کے سبب انہیں سبکدوش کر دیا گیا۔ بقیہ زندگی انہوں نے جامعۃ الرشاد کی نظامت، الرشاد کی ادارت اور تصنیف و تالیف میں گذاری۔ ۱۲رمئی کو لکھنو میں وفات پائی اور ۱۳رمئی کو جامعۃ الرشاد کے پیچھے مسلمانوں کے عام قبرستان میں تدفین ہوئی۔

وہ علامہ شبلی اور ان کی تصنیفات سے مظہر العلوم کی دور طالب علمی میں واقف ہوئے اور ان کا مطالعہ کیا۔ ندوہ کی طالب علمی اور دارالمصنفین کی رفاقت نے انہیں علامہ شبلی کا شیدائی بنا دیا۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنی خودنوشت ''نقوش زندگی'' میں کیا ہے۔ دارالمصنفین سے سبکدوش ہونے میں ان کی شبلی نوازی کا بھی دخل ہے۔ سوانح مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوہ پر انہوں نے ماہنامہ معارف میں تبصرہ کیا ہے، جس میں انہوں نے مصنف پر علامہ شبلی کے ساتھ ناانصافی پر احتجاج کیا اور ان پر تاریخ سازی کا الزام عائد کیا ہے۔ دراصل اسی بنیاد پر ان کی سبکدوشی عمل میں آئی تھی۔

مولانا مرحوم نے علامہ شبلی پر کئی مضامین لکھے۔ ''شبلی کی سوانح نگاری'' یہ مقالہ ماہنامہ ادیب علی گڑھ کے شبلی نمبر میں شائع ہوا تھا، راقم نے اسے الرشاد اکتوبر ۱۹۹۹ء میں بھی شائع کیا۔ اپنی دیگر تحریروں میں بھی متعدد مقامات پر انہوں نے علامہ شبلی کے علم و فضل پر روشنی ڈالی ہے۔ افکار سلیمانی میں حیات شبلی پر لکھتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''سید صاحب کو اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی سے جو والہانہ تعلق اور گہری محبت تھی وہ کم شاگردوں کو اپنے استاذ سے ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ حیات شبلی کی ایک ایک سطر سے ہوتا ہے۔ یہ کتاب سید صاحب نے اس وقت لکھی جب وہ مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے بیعت ہو چکے تھے اور علامہ اور علمائے دیوبند کے درمیان اختلاف ذوق اور بعض مسائل کی تعبیر کی وجہ سے کچھ حجاب تھا مگر انہوں نے حیات شبلی میں اس کا کوئی اثر نہیں آنے دیا بلکہ استاذ کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ مقدمہ میں دونوں کا جو مقام انہوں نے مقرر کیا اس سے بہتر اس کی تعبیر ممکن نہیں ہے۔ کچھ روایتی قسم کے علماء نے علامہ شبلی کی دینی زندگی پر کچھ اعتراض کئے تو حضرت سید صاحب نے اس کا بھرپور جواب دیا آخر میں لکھا ہے کہ شبلی شبلی تھے، جنید و شبلی

نہ تھے۔ان کا مقصد یہ تھا کہ گو وہ رواتی ذکر وفکر میں کچھ کم رہے ہوں مگر باطل کے مقابلہ میں وہ تیغ بے نیام تھے۔وہ سعدی کے اس قطعہ کے مصداق تھے۔

صاحب ولے بمدرسہ آمد زخانقاہ ۔ بہ شکستہ صحبت اہل طریق را
گفتم میان عالم عابد چہ فرق بود ۔ تا کردی اختیار ازاں ایں فرق بود
گفت او گلیم خویش بدر میبرد زموج ۔ ویں جہدی کند کہ بگیرد غریق را

(افکار سلیمانی،ص:۳۰)

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے زمانہ قیام کا ایک اور واقعہ مولانا مرحوم کی عقیدت شبلی کی غمازی کرتا ہے۔۱۹۴۵ء میں وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ گجرات کے سفر پر گئے۔راندیر میں قیام رہا۔سید صاحب سے ملاقات کے لئے مولانا محمد یوسف بنوری [۱۹۰۸-۱۹۷۷ء] راندیر تشریف لائے۔ایک مجلس میں مولانا بنوری نے اپنا ایک خواب بیان کیا جو مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''ایک مجلس میں مولانا بنوری نے ایک لمبا چوڑا خواب بیان فرمایا،جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک پہاڑی ہے،اس پہاڑی کے ایک طرف جنت ہے اور دوسری طرف علامہ شبلی اور کچھ لوگ ہیں جو مشقت سے جنت کی جانب جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔یہ خواب سن کر سید صاحب تو خاموش رہے مگر مجھے بہت غصہ آگیا اور ادب کے دائرے سے باہر ہو کر میں نے عرض کیا کہ مولانا معاف کیجئے گا،آپ حضرات کو چوں کہ علامہ شبلی کے ساتھ حسن ظن نہیں ہے،اس لئے آپ لوگوں کو اس طرح کا خواب نظر آتا ہے۔ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی نے جس پر شور جذبہ سے سیرت نبویؐ کی تدوین شروع کی اور پھر اس کی تکمیل کے بعد انہوں نے اس پر حب نبویؐ میں ڈوبا ہوا جو والہانہ سرنامہ لکھا اور جو قطعہ کہا، جنت کے فرشتوں نے جب اسے کراماً کاتبین سے سنا ہوگا یا ان کا نوشتہ پڑھا ہوگا تو وفات کے ساتھ ہی اذن الٰہی کے بعد اپنے جلو میں لے جا کر جنت میں ان کے مقام بلند کی سیر کرادی ہوگی،اس لئے مشقت سے جنت میں جانے کے

خواب کو اضغاث احلام [خواب پریشاں] ہی کہا جاسکتا ہے۔میرا رخ دیکھ کر حضرت سید صاحب نے چپ رہنے کے لئے ہاتھ سے اشارہ فرمایا اور گفتگو کا رخ پھیر دیا۔" (نقوش زندگی،ص:۷۷)

---

(۱۲۲)

حافظ نذر احمد

[۱۹۱۹-۲۰۱۱ء]

حافظ نذر احمد مرحوم پاکستان میں علامہ شبلی نعمانی کے شاید سب سے بڑے شیدائی گذرے ہیں۔علامہ شبلی کے نام سے لاہور میں شبلی کالج قائم کیا۔اور اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا اور بڑی ترقی دی۔خود ہی اس کے مہتمم بھی رہے اور پرنسپل بھی۔

۸رمئی ۱۹۶۸ء کو یوم شبلی کا بڑے پیمانہ پر انعقاد کیا،جس میں پاکستان کے نامور اہل قلم ڈاکٹر سید عبداللہ،ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار،مولانا سید مرتضی حسین فاضل اور پروفیسر شیخ محمد عثمان وغیرہ نے شرکت کی اور اپنے مقالات پیش کیے۔اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر سید عبداللہ نے کی۔سمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ "مقالات یوم شبلی" خود حافظ نذر احمد نے مرتب کیا، جسے ان کی قائم کردہ مسلم اکادمی لاہور نے شائع کیا ہے۔اس کا دیباچہ "پیش نہاد" کے عنوان سے ہے،جس کی سطر سطر سے عقیدت شبلی کے پھول جھڑتے ہیں۔فرماتے ہیں:

"لاہور علم وفن کا مرکز ہے۔یہاں ہر روز دو چار علمی ادبی مجالس منعقد ہوتی رہتی ہیں اور آئے دن مشاہیر کی یاد میں تقاریب کا انعقاد ہوتا ہے،لیکن کس قدر ستم ظریفی ہے کہ ہم نے ایک عظیم جامع الصفات شخصیت کو یکسر بھلا دیا اور کبھی بھول کر بھی انھیں یاد نہیں کیا۔میری مراد علامہ شبلی نعمانی کی عظیم شخصیت سے ہے۔"

(مقالات یوم شبلی،ص:۷)

کئی اہل قلم بالخصوص علامہ شبلی نعمانی کے خانوادے کے ایک فرد مفتون احمد نے اپنی

کتاب ''مولانا شبلی :ایک مطالعہ'' میں علامہ شبلی کی محرومیوں کا ذکر کیا ہے، مگر حافظ نذر احمد نے علامہ شبلی کی خوش بختیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ

''شبلی کو بجا طور پر ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کہا جا سکتا ہے۔ وہ معلم بھی تھے اور مصنف بھی۔ سیرت نگار بھی تھے اور مورخ بھی۔ ادیب شہیر بھی تھے اور تاریخ ادبیات کے ماہر بھی۔ وہ یگانہ محقق بھی تھے اور ماہر نقاد بھی۔ انھوں نے ایک طرف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چمن کی آبیاری کی، دوسری طرف ندوۃ العلما کی منفرد درس گاہ کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے دار المصنفین جیسا عظیم تصنیفی ادارہ قائم کیا اور اپنے پیچھے مشہور زمانہ شاگردوں کی جماعت چھوڑ گئے، یہ خوش بختی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔'' (ایضاً)

علامہ شبلی نے ندوہ کا جو نصاب تعلیم تیار کیا تھا حافظ نذر احمد اس کے بڑے مداح ہیں۔ مقالات یوم شبلی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی نے ندوۃ العلما میں جو نصاب رائج کیا اور اس منفرد دار العلوم کی بنیاد جن خطوط پر رکھی وہ ہمارے لئے آج بھی سنگ میل اور روشنی کا مینار ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ ہم پاکستان میں بھی اس پایہ کا کوئی تعلیمی و تربیتی ادارہ قائم کر سکتے جو بے شک اپنے مقاصد کے اعتبار سے قدیم ہوتا، لیکن عمل اور طریقہ عمل میں جدید۔''

(ایضاً، ص:۸)

۱۹۴۷ء میں مملکت خداداد قائم ہوئی۔ اس کے ۲۱ ؍برس بعد پہلی بار شبلی کالج لاہور نے علامہ شبلی پر پہلی تقریب منعقد کی۔ یہی نہیں حافظ نذر احمد کو اس کا سبب بھی بتانا پڑا، مگر دیکھیں علم کے اس شیدائی نے کیا کہا:

''قیام پاکستان کے بعد پہلی بار لاہور میں علامہ شبلی نعمانی کی پیدائش کے دن ۸؍ مئی ۱۹۶۸ء کو یوم شبلی کی تقریب ہوئی۔ اس کی صدارت ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے فرمائی۔ اس تقریب کا انعقاد واہتمام شبلی کالج کے طلبا کی انجمن بزم ادب نے کیا۔ شبلی کالج کے بانی یا منتظمین کا اگر چہ علامہ شبلی کی ذات سے کوئی خونی رشتہ

نہیں، لیکن ہم پر علامہ کے دو گونہ حق ہیں ۔ ایک اس لحاظ سے کہ ہم بھی ان کے علمی ورثہ کے خوشہ چینوں میں سے ہیں ۔ دوسرے یہ کہ ہمارے کالج کی نسبت ان کے نام نامی سے ہے۔" (ایضاً،ص:۸)

اس وقت تک علامہ شبلی کی تاریخ پیدائش کی تعیین نہیں ہوئی تھی ۔ غالباً اسی وجہ سے ۸رمئی کی تاریخ کو تقریب منعقد ہوئی ۔ اب صحیح تاریخ پیدائش ۴رجون ۱۸۵۷ء کی تعیین پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب سابق ڈائرکٹر دارالمصنفین کی تحقیق سے ہوئی ہے۔

حافظ نذر احمد ۲۰رنومبر ۱۹۱۹ء کو قصبہ نگینہ ضلع بجنور اتر پردیش میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اردو و فارسی کی تعلیم بھی نگینہ ہی میں حاصل کی ۔ پھر وہیں مدرسہ عربیہ قاسمیہ سے ۱۲-۱۳ سال کی عمر میں قران مجید حفظ کیا اور قاری محمد سلیمان دیوبندی سے تجوید و قرأت پڑھی۔ ۱۹۳۵ء میں اپنی بہن کے ہاں لاہور چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے ، بلکہ اسی کی خاک کا پیوند بھی ہوئے۔

تحصیل علم کے بعد عملی زندگی کے آغاز میں دارالاسلام پٹھان کوٹ چلے گئے ۔ وہاں سے ایک سال گذار کر واپس آئے اور لاہور میں دفتری ہو گئے ۔ بعد ازاں اسلامیہ کالج لاہور میں نائب ناظم دینیات مقرر ہوئے ۔ پھر بوجوہ اسلامیہ کالج کی ملازمت کو خیر باد کہہ دیا اور عبدالسلام قریشی [م:۸راپریل ۱۹۶۲ء] کے تعاون سے ۱۹۴۸ء میں شبلی کالج لاہور کی بنیاد رکھی۔

حافظ نذر احمد نے متنوع خدمات انجام دیں اور سب کی سب اہم ہیں، تاہم ان کی شخصیت کے تین پہلو خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ایک قرآن پاک کی خدمت ، دوسرے شبلی کالج لاہور کے ذریعہ تعلیمی خدمات اور تیسرے تصنیف و تالیف و ترجمہ اور ان کی اشاعت۔

حافظ نذر احمد نے تفہیم قرآن کے لئے درس دیئے اور اس کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے قرآن پاک کا سلیس اور آسان زبان میں ترجمہ کیا۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی انہوں نے بڑی علمی کاوشیں کیں اور مختلف النوع موضوعات پر متعدد کتابیں اور رسالے قلم بند کئے ۔ ان کی معلوم کتابوں اور رسالوں کے نام یہ ہیں:

۱- آؤ مدینہ چلیں ، ۲- سیرت مبارکہ کے چند پہلو ، ۳- طب نبوی ، ۴- ارض مقدس

[فلسطین] ۵- دیواریں اور غاریں، ۶- اربعین نووی، ۷- مؤطام امام محمد، ۸- اللہ کے احکام ۹- تعلیمی مقالات، ۱۰- مقالات یوم شبلی، ۱۱- ہمارے فرائض اور ہمارے حقوق، ۱۲- اشاریہ تفسیر ماجدی، ۱۳- فرہنگ عصریہ، ۱۴- پیارے نبی کی پیاری زبان، ۱۵- سورۃ البقرہ، ۱۶- آسان ترجمہ قرآن کریم، ۱۷- عبادت کیوں اور کیسے؟ ۱۸- شفا اللہ کے ہاتھ میں، ۱۹- ہمارے مشاہیر، ۲۰- جائزہ مدارس عربیہ [دوجلدیں] ۲۱- انبیائے قرآن، ۲۲- اسلام کا نظام عدل وتعزیرات، ۲۳- ہماری مکمل نماز، ۲۴- فلسفۂ نماز، ۲۵- انتخاب آیات واحادیث، ۲۶- سیرۃ النبی ایک نظر میں [چارٹ]، ۲۷- نصاب اسلامیات بی. اے، ۲۸- نصاب اسلامیات ایف. اے، ۲۹- نصاب اسلامیات میٹرک، ۳۰- نصاب اسلامیات پرائمری و مڈل، ۳۱- ہماری اردو [مڈل کلاسز] ۳۲- ہماری اردو [پرائمری جماعتوں کے لئے] ۳۳- مسیحیت پاکستان میں، ۳۴- مؤطا امام مالک مع اردو ترجمہ واسماء الرجال۔

حافظ نذر احمد بڑے نیک اور عابد وزاہد شخص تھے۔ مدۃ العمر دین وملت کی خدمت کرتے رہے اور اس راہ میں اپنا سب کچھ نچھاور کردیا۔ ۲۳ ر ستمبر ۲۰۱۱ء کو لاہور میں ۹۲ ر سال کی عمر میں وفات پائی۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حافظ نذر احمد علامہ شبلی کے عاشق زار تھے، اسی طرح ان کی خودنوشت ''سرگذشت ایام'' کے مرتب ڈاکٹر سفیر اختر صاحب بھی ایک بڑے شبلی شناس ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں انہوں نے حافظ نذر احمد کی خواہش پر ''کتاب نامہ شبلی'' مرتب کی جس سے شبلی شناسی کا کارواں تیز گام ہوا اور جس سے خود مجھے ''کتابیات شبلی'' مرتب کرنے میں بڑی مدد ملی۔

''کتاب نامہ شبلی'' کے محرک حافظ نذر احمد صاحب تھے۔ سرگذشت ایام کے مقدمہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''علامہ شبلی نعمانی کی علمی، تعلیمی اور فکری خدمات سے زمانہ آگاہ ہے۔ حافظ صاحب علامہ شبلی کی ان خدمات کی تجلیل کرتے رہتے تھے۔...... میں ان کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا کہ ایک روز انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ علامہ شبلی نعمانی

کے سوانح وافکار کے حوالے سے کتابیات شائع ہونا چاہئے۔ میں نے اس کی بھر پور تائید کی تو ان کے دل کی بات زبان پر آ گئی کہ یہ کام تم کرو۔ میں نے ان کی خواہش کو حکم سمجھا اور اپنی طالب علمانہ صلاحیت کے مطابق کتاب نامہ شبلی مرتب کیا جو انہوں نے اپنے ادارے مسلم اکادمی اور شبلی کالج کی بزم ادب کی جانب سے شائع کیا۔ انہوں نے کتاب نامہ شبلی اصحاب ذوق بالخصوص علامہ شبلی نعمانی کے فکر ودانش سے دلچسپی رکھنے والوں میں تقسیم کیا اور جب بھی کسی نے ان سے کتاب نامے کے لئے رابطہ کیا، انہوں نے نسخہ بھیج کر مسرت محسوس کی۔''

(سرگذشت ایام، ص:۲۷)

''کتاب نامہ شبلی'' سے حافظ نذر احمد کی دلچسپی کا اندازہ ڈاکٹر سفیر اختر صاحب کے درج ذیل اقتباس سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جن دنوں ''کتاب نامہ شبلی'' کی کتابت ہو رہی تھی، حافظ صاحب ریڑھ کی ہڈی کے عارضے میں مبتلا تھے۔ چند مہرے ہل گئے تھے اور ڈاکٹروں نے تخت پر چت لیٹے رہنے کا مشورہ دے رکھا تھا۔ اسی حال میں انہوں نے لیٹے لیٹے پروف دیکھے اور کتاب نامے کا پیش لفظ ''علامہ شبلی اور ان کا کارنامہ'' قلم برداشتہ لکھا۔''

(ایضاً، ص:۲۷)

حافظ نذر احمد کے اس پیش لفظ کا ایک ایک لفظ عقیدت شبلی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ شبلی اور ان کے کارناموں کی عظمت ان کے دل میں جاگزیں ہو گئی تھی۔ وہ علامہ شبلی کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شبلی اپنی ذات میں انجمن نہیں بلکہ انجمن ساز تھے۔ حق تو یہ ہے کہ انجمن ساز نہیں ادارہ ساز تھے۔ ادارے بھی وقتی یا عام سطح کے نہیں بلکہ مستقل اور دائمی نوعیت کے ادارے جو اپنے قیام کی گولڈن جبلی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ایسے ادارے جو صدی گذر جانے کے باوجود اپنی جگہ منفرد اور یکتا ہیں۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ برصغیر پاک و ہند کی وہ علمی درسگاہ ہے جس کا نصاب،

بنیادی فکر اور ذریعہ تعلیم آج بھی انفرادیت کا حامل ہے۔ .... دارالمصنفین اعظم گڑھ تحقیقی، تربیتی اور تصنیف وتالیف کا ادارہ ہے، جس کی اپنی چھاپ ہے، جس کی مطبوعات زبان حال سے اپنے ارادے کی نشان دہی کردیتی ہیں۔ یہ سب علامہ شبلی کی ادارہ ساز شخصیت کا پرتو ہے۔'' (ایضاً، ص:۲۸)

حافظ نذر احمد نے علامہ شبلی کے فضل وکمال کے ساتھ ان کی جامعیت کا ذکر خاص طور پر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

''علامہ شبلی کی شخصیت کا دوسرا منفرد پہلو ان کی ہمہ گیری اور ہمہ جہتی ہے۔ وہ جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے۔ یہ وصف خاص بہت کم افراد کو حاصل ہوتا ہے۔ شبلی معلم بھی تھے اور مصنف بھی، سیرت نگار بھی تھے اور مورخ بھی، ادیب شہیر بھی تھے اور شاعر بھی۔ تاریخ ادبیات کے ماہر بھی تھے اور یگانہ محقق ونقاد بھی۔'' (ایضاً، ص:۲۹)

حافظ صاحب مرحوم علامہ شبلی کی تصنیف وتالیف کے میدان میں انفرادیت اور کمالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انہوں نے جو کچھ لکھا بڑی تحقیق سے لکھا اور جو موضوعات ہیں ان میں اولیت کا سہرا ان کے سر بندھا ہے۔ ان کا لکھا مستند تھا اور اپنے موضوع پر حرف آخر کہلایا۔ علامہ شبلی کا دائرہ نگارش بہت وسیع ہے۔ انہوں نے سیرت کا موضوع اپنایا تو اسے کسی ایک دائرے یا کسی ایک دور تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس میں پہلی صدی ہجری سے لے کر اپنے دور تک مختلف ہستیوں کو چنا، ان میں ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلیفہ ثانی بھی ہیں اور سلاطین اسلام بھی، مشاہیر اسلام بھی ہیں اور شعرائے کرام بھی۔'' (ایضاً، ص:۲۹)

علامہ شبلی سے ان کے گہرے لگاؤ کا ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو، جس سے اس حقیر کا بھی یک گونہ تعلق ہے۔ ۱۹۹۳ء میں میں نے 'کتابیات شبلی' مرتب کرنے کا ارادہ کیا تو اس سلسلے میں ایک خط محترم ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کو لکھا جو اس وقت مقتدرہ قومی زبان کے ڈائرکٹر اور ماہنامہ 'اخبار اردو' اسلام آباد کے مدیر تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس خط کو ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد میں شائع

کردیا۔ حافظ نذر احمد نے وہ خط پڑھا تو اس کے تراشے کے ساتھ ڈاکٹر سفیر اختر صاحب کو خط لکھا کہ

''کتابیات شبلی کے بارے میں ایک اعلان ہے جو محمد الیاس الاعظمی اعظم گڑھ کی طرف سے ہے۔ ان کا پتہ مکمل نہیں چھپا کہ میں خود انہیں آپ کے کتاب نامہ شبلی کے بارے میں لکھ دیتا۔ اب مقتدرہ سے پتہ حاصل کر کے آپ خود لکھ دیں تو اچھا ہے۔'' (ایضاً، ص:۲۶)

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے مجھے خط لکھا کہ جب کتابیات شبلی مکمل ہو جائے تو اس کا ایک نسخہ مجھے بھیج دیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مقتدرہ سے شائع شخصی کتابیات کے ۱۵ر کتابچے بھی ارسال کیے۔ جواب میرے ذاتی کتب خانہ میں ان کی یادگار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلہ میں ڈاکٹر سفیر اختر صاحب کو بھی خط لکھا۔ چنانچہ ڈاکٹر سفیر اختر صاحب نے ''کتاب نامہ شبلی'' کا نسخہ مجھے بھیجا، مگر افسوس وہ ڈاک کی نذر ہو گیا۔

اس سے حافظ جی کے علامہ شبلی سے گہرے شغف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ مباحث ضمناً آ گئے لیکن موضوع سے ہٹ کر نہیں ہیں بلکہ ان کا ذکر ضروری تھا۔

شبلی کالج لاہور ۱۹۴۸ء میں بڑی بے سروسامانی میں قائم ہوا۔ حافظ نذر احمد نے اس کی سرگذشت لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''۵۰ر میور روڈ (حال علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو) میں بارون بلڈنگ کے نام سے مشہور عمارت تھی۔ بلڈنگ میں نیچے ایک وسیع تہہ خانہ تھا۔ کسی زمانے میں یہاں چٹنیاں اور مربے کا کارخانہ تھا۔ ۱۹۴۸ء کے آغاز میں تہہ خانہ ہم نے بڑی جدوجہد سے کرائے پر حاصل کر لیا اور یہاں تعلیم بالغاں اور میٹرک [آرٹس] کی تین شبینہ کلاسز شروع کر دیں۔ پہلے سال ہمارے ۳۸ طلبہ میٹرک کے امتحان میں شریک ہوئے اور نتیجہ ستر فیصد کے قریب رہا جو بہت بڑی بات تھی۔''

(ایضاً، ص:۱۴۳)

کچھ دنوں بعد حافظ صاحب نے ایک اور ہال کرائے پر لیا اور بی اے تک کی کلاسز شروع

کرادیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''دو سال بعد ہمیں سکیٹنگ ہال بھی کرائے پر مل گیا۔ ہم نے ٹاٹ کے عارضی پردے ڈال کر ہال کو چار کمروں میں تقسیم کیا۔ ٹاٹ کے عیب چھپانے کے لئے اس کے دونوں طرف سفیدی پھیر دی، اس طرح دسویں کے ساتھ نویں اور ایف اے بی اے کی کلاسز شروع ہوگئیں۔ تعلیم بالغاں کو جونیئر اور سینئر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ دراصل یہ پرائمری اور مڈل کے دو حصے تھے۔ ان میں صرف اردو ،حساب اور انگریزی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس طرح ہمارے طلبہ عام طور پر چار سال میں میٹرک پاس کر لیتے تھے۔'' (ایضاً ص:۱۴۴)

اس کے بعد حافظ صاحب نے شبلی کالج کو مزید ترقی دی۔ ادیب عالم اور منشی فاضل کی کلاسز شروع کرادیں۔ بعد ازاں شبینہ کلاسز کے ساتھ ڈے کلاسز کا بھی آغاز ہوا۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں:

''اب ہم نے شبینہ کلاسز کے ساتھ مستقل ڈے کلاسز کا بھی اجراء کر دیا دن میں چھٹی سے دسویں تک آرٹس رسائنس دونوں ایف اے اور آئی کام کی کلاسز شروع کر دیں۔'' (ایضاً ص:۱۴۴)

شبلی کالج جن حالات میں قائم ہوا اور اس کی کس درجہ ضرورت تھی وہ حافظ نذر احمد نے اس طرح بیان کی ہے:

''یہ پاکستان کا دور ابتلا تھا۔ باقاعدہ، تعلیمی ادارے معدودے چند تھے۔ جب کہ طلب علم کی خواہش مندوں کی تعداد کثیر تھی۔ اندازہ کیجئے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہم نے میٹرک کے امتحان میں ایک سو سے زیادہ پرائیویٹ طلبہ کے داخلے بھیجے اور نتائج بھی حوصلہ افزا ہوئے تھے۔'' (ایضاً ص:۱۴۴)

شبلی کالج لاہور دور ابتلا میں قائم ہوا، تاہم حافظ نذر احمد کی جدو جہد رنگ لائی۔ اس سے ہزاروں طلبہ نے استفادہ کیا۔ تعلیم بالغاں سے سیکڑوں لوگوں نے اپنی تعلیمی پیاس بجھائی۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں:

''شبلی کالج سے تعلیم بالغاں حاصل کرنے والے اور میٹرک ایف اے، بی اے، ادیب، عالم منشی فاضل اور آئی کام کے طلبہ کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ قیام پاکستان کے بعد مغل پورہ، باغبان پورہ، صدر بازار، دھرم پورہ، گڑھی شاہو اور قلعہ گوجر سنگھ یعنی سرحد پاکستان سے ریلوے اسٹیشن تک کوئی اور نجی تعلیمی ادارہ نہ تھا جہاں سے مقامی اور مہاجرین کسب فیض کر سکتے۔ ایسے نوجوانوں کی متعدد مثالیں ہیں جو سڑکوں کے کنارے پنکچر لگاتے لگاتے اور گلی کوچوں میں ریڑھیاں لگاتے پھرتے پھراتے، دفاتر میں ملازمت کرنے کے قابل ہوگئے۔ میری نگاہوں میں آج بھی ایسے چار نوجوانوں کی تصویر پھر رہی ہے جو پاکستان ریلوے سوسائٹی اور لاہور کارپوریشن میں نائب قاصد بھرتی ہوئے تھے، شبلی کالج سے میٹرک ایف اے اور بی اے کے امتحان پاس کر کے اپنے ہی دفاتر میں سپرینٹنڈنٹ کے عہدے تک پہونچے۔'' (ایضاً ص:۱۴۴-۱۴۵)

شبلی کالج بے سہاروں کا سہارا تھا۔ اس نے نہ جانے کتنوں کی زندگیاں بدل دیں۔ ایک واقعہ سنئے:

''ایک دن کلاسز چیک کرتے ہوئے میں میٹرک [آرٹس] کے کمرے میں گیا۔ دیکھا کہ ایک ڈیسک پر تین طالب علم بیٹھے ہیں، لیکن ان کے پاس کتاب ایک ہی ہے۔ میں نے باز پرس کی تو بولے ہم باپ بیٹا اور داماد ہیں۔ ہم غریب آدمی ہیں۔ ایک کتاب سے گذارا کر لیتے ہیں۔ میٹرک کا نتیجہ نکلا تو باپ محکمہ معلومات عامہ پنجاب میں نائب قاصد تھا، اسے کلرکی کی جگہ مل گئی۔ داماد سڑک کے کنارے پنکچر لگاتا تھا وہ ایک دفتر میں ملازم ہوگیا۔ بیٹے کا حال مجھے معلوم نہ ہو سکا۔

شبلی کالج کے متعدد ابنائے قدیم آج بھی لاہور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ یہ اللہ تعالی کا احسان ہے۔ ہم جس قدر شکر ادا کریں کم ہے۔'' (ایضاً ص:۱۴۵)

حافظ نذر احمد نے ''سرگذشت ایام'' میں شبلی کالج کے بہت سے تجربات ومشاہدات اور

واقعات قلم بند کئے ہیں اور شبلی کالج کی انفرادیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"شبلی کالج گو ایک پرائیویٹ ادارہ تھا لیکن یہ ایک بامقصد ادارہ تھا۔ تعلیم و تدریس کے علاوہ طلبہ کی تربیت اس کے پیش نظر تھی۔ کسی فخر کے طور پر نہیں بلکہ تحدیث نعمت کے طور چند ایک تجربات کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا۔"

(ایضاً ص: ۱۴۵-۱۴۶)

ایک محیر العقول واقعہ کے عنوان سے ایک ایسے طالب علم کا ذکر کیا ہے جسے بورڈ کی طرف نقل کرنے کی نوٹس آ گئی تھی۔ چنانچہ حافظ نذر صاحب نے اس سے چند سوالات کئے کہ کیا آپ کسی کاغذ سے نقل کرتے ہوئے پکڑے گئے؟ کہا نہیں۔ پھر پوچھا نگراں کو تمہارے پاس سے کوئی کاغذ ملا؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا کیا تمہاری میز کے پاس سے کوئی کاغذ ملا؟ کہا نہیں۔ تو میں نے اس سے پوچھا پھر تم پر نقل کا کیس کیسے بن گیا۔؟ تو اس نے بڑی معصومیت سے کہا کہ میرا انگریزی کا پرچہ چک کرنے والے نے لکھا ہے کہ اس طالب علم نے فلاں فلاں سوال کتاب سے نقل کیا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ اس نے یہ بات کیسے لکھ دی۔ اس نے جواب دیا، اللہ تعالی نے مجھے ایسا حافظہ عطا کیا ہے کہ میں ایک بار کچھ پڑھ لوں تو وہ کتاب بند کر کے ہو بہو لکھ سکتا ہوں، جو جوابات میں نے لکھے تھے وہ میں نے کتاب میں پڑھے تھے۔ اب میں نے اس کا امتحان لیا اور ایک کتاب کا کوئی صفحہ اس سے پڑھوایا، پھر کتاب لے لی اور لکھنے کے لئے کاغذ دے دیا۔ چنانچہ اس نے جو پڑھا تھا ہو بہو لکھ دیا۔ (ایضاً ص: ۱۴۵-۱۴۶)

شبلی کالج کے بانی پرنسپل حافظ نذر احمد صاحب تھے۔ انہوں نے طلبہ اور پرنسپل کے درمیان کی تمام رکاوٹیں ختم کر کے ایک دوسرے سے پرنسپل کے بجائے ہمدرد اور مونس و غم خواری کا رشتہ قائم کیا۔ اس کے بھی متعدد فوائد کالج اور طلبہ کو میسر آئے۔ (ایضاً ص: ۱۴۸)

شبلی کالج کی ایک اور انوکھی ادا تھی۔ یہاں طلبہ کے معاملات و مسائل زبانی سنے جاتے تھے۔ درخواست کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور درخواست کے بغیر رخصت منظور ہو جاتی تھی۔

(ایضاً ص: ۱۴۸)

صباحی خطاب کا اہتمام ہوتا تھا، مگر اس میں حاضری کی کوئی قید نہیں ہوتی تھی۔ مقصد یہ تھا

کہ طلبہ جبر اور جرمانے کے مقصد کے بغیر خوشی سے اس میں شامل ہوں۔ صباحی خطاب کے بارے میں حافظ نذر احمد لکھتے ہیں:

''طلبہ کالج ہال میں جمع ہو جاتے تو کوئی طالب علم ڈائس پر آ کر چند آیات کی تلاوت کرتا۔ اس کے بعد تمام طلبہ تختہ سیاہ سے اس دن کے درس کی آیت رحدیث اپنی خاص کاپی میں نوٹ کر لیتے۔ طلبہ یہ نوٹ بک اپنے کسی دوسرے موضوع کی کاپی سے زیادہ حفاظت اور ادب کے ساتھ رکھتے تھے۔ بندہ نے ایک سو آیات قرآن اور ایک سو احادیث نبوی کا انتخاب کر کے طبع کرایا۔ اس کی کوئی آیت اور حدیث پانچ سے زیادہ الفاظ پر مشتمل نہیں۔'' (ایضاً ص:۱۴۹)

صباحی خطاب کے بعد شبلی کالج میں قرآن مجید کی اجتماعی تدریس ہوتی تھی۔ اس میں پہلی جماعت سے منتہی جماعت تک کے طلبہ شریک ہوتے۔ حافظ صاحب نے لکھا ہے کہ

''قرآن مجید کی تدریس جو ہجے کے بغیر براہ راست اور تکرار کے انداز سے کی جاتی تھی، الحمدللہ سال میں قرآن مجید ختم ہو جاتا اور طلبہ کی اکثریت تلاوت کے قابل ہو جاتی۔ (ایضاً ص:۱۵۰)

علامہ شبلی نے علی گڑھ میں برسوں درس قرآن دیا تھا، غالباً حافظ صاحب کے ذہن میں یہ بات وہیں سے آئی ہوگی۔ یہاں یہ بات عرض کر دوں کہ اعظم گڑھ میں علامہ کا قائم کردہ شبلی کالج ہے اور علمی و تعلیمی خدمات کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، مگر اس میں درس قرآن کا اہتمام آج تک نہ ہو سکا۔ ایک سے ایک نام نہاد اللہ والے پرنسپل ہوئے مگر علامہ شبلی کی یہ سنت جس کے اجرا کے لئے وہ ڈھاکہ تک چلے گئے تھی مگر خودان کے کالج میں اس کا اہتمام نہیں ہو سکا۔ اور اب تو جو حکومت آ گئی ہے وہ شروع بھی نہیں کرنے دے گی۔ لاہور والے شبلی کالج میں غیر مسلم طلبہ بھی زیر تعلیم تھے اور اکثر اس ماحول سے متاثر۔ دو طلبہ بخوشی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ (ایضاً ص ۱۵۰)

اس میں نماز تراویح کا بھی اہتمام ہمیشہ ہوتا رہا اور خود پرنسپل حافظ نذر احمد صاحب تراویح پڑھاتے تھے۔ بعض غیر مسلم طلبہ بھی اس میں شریک ہوتے بلکہ منع کرنے کے باوجود شریک ہوتے اور انہیں اس عمل میں لطف آتا تھا۔ (ایضاً ص:۱۵۱)

حافظ نذر احمد صاحب شبلی کالج میں اکثر تقاریب کا انعقاد کیا کرتے تھے۔اس طرح کی دو تقاریب کا سرگذشت ایام میں انہوں نے ذکر کیا ہے۔ایک یوم شبلی اور دوسرے یوم والدین۔یوم شبلی مئی ۱۹۶۸ء میں بڑے اہتمام سے منعقد کیا گیا تھا۔اس موقع پر اہل علم سے مقالات بھی حافظ صاحب نے لکھوائے جو کتابی صورت میں شائع ہوئے اور اہل علم میں تقسیم ہوئے۔یہ مجموعہ راقم کے ذاتی ذخیرہ میں محفوظ ہے اور واقعی بہت عمدہ مقالات کا مجموعہ ہے۔اس میں مذکورہ بالا اہل علم کے مقالات شامل ہیں۔ان مقالات میں تنوع ہے اور علامہ شبلی کے فکر وفن کے بیشتر نقوش ابھر کر سامنے آتے ہیں۔اس میں علامہ شبلی کی بعض غیر مطبوعہ تحریریں بھی شامل ہیں۔

شبلی کالج لاہور کی کامیابی سے حافظ صاحب خوش خوش دنیا سے گئے۔ان کی یہ تحریر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''شبلی اس کالج کے بانی کا نام نہ تھا، نہ مولانا شبلی سے ہمارا کوئی نسبی رشتہ تھا، لیکن ان کی علمی عظمت اور اپنی عقیدت کے اعتبار سے ہم نے علامہ شبلی کے نام سے اس کالج کو منسوب کیا تھا۔سچی بات یہ ہے کہ نسبت اثر سے خالی نہیں ہوتی۔'' (ایضاً ص:۱۵۳)

علامہ شبلی کے نام منسوب ہندو پاک میں اور بھی کالج ہیں جن کا ذکر راقم نے اپنی کتاب ''شبلی شناسی کے سو سال'' میں قدرے تفصیل سے کیا ہے، مگر اعظم گڑھ کے کالج کے بعد سب سے زیادہ مقبولیت مرحوم شبلی کالج لاہور ہی کو ملی۔کالج کی یہ شاندار تاریخ، ہماری تعلیمی تاریخ میں حافظ نذر احمد کا نام ہمیشہ زندہ رکھے گی۔اور اسی کے ساتھ ان کی عقیدت شبلی بھی۔

---

(۱۲۳)

پروفیسر غلام محمد

[۱۹۲۱-۱۹۹۳ء]

پروفیسر غلام محمد مولانا سید سلیمان ندوی کے خلفاء میں سے ہیں۔''تذکرہ سلیمان'' انھیں

کے قلم سے ہے۔ انھوں نے سید صاحب کے مجموعہ کلام ''ارمغان سلیمان'' پر دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

''(سید صاحب) مروجہ نصاب تعلیم ختم کر کے جب لکھنؤ پہنچے تو گویا شعر وسخن کے اصل گہوارہ میں آگئے اور یہاں آکر دامن تربیت بھی ملا تو شبلی جیسے استاذ فن کا، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں پختہ شاعری کے جوہر دکھانے لگے۔'' (ارمغان سلیمان، ص:۴)

مولانا سید سلیمان ندوی رنگ شبلی ہی میں نظمیں کہنے لگے۔ پروفیسر غلام محمد لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی کی رحلت کے بعد بعض نظمیں من وعن شبلوی رنگ میں لکھیں اور اہل فن سے استاذ کی ہمرنگی پر داد پائی، مگر فرماتے تھے کہ عمادالملک بلگرامی نے یہ تحریر فرمایا کہ آپ کی نظمیں مولانا شبلی کی یاد تازہ کرتی ہیں مگر آپ اپنی توجہ شاعری پر صرف نہ فرمائیں تو طبیعت شعرگوئی سے بالکل ہٹ گئی۔'' (ایضاً، ص:۶)

---

(۱۲۴)

سلیمان اریبؔ

[۱۹۲۲-۱۹۷۰ء]

سلیمان اریبؔ اردو کے ایک ممتاز ادیب، نامور شاعر اور ماہنامہ صبا حیدرآباد کے مدیر تھے۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے اس احساس کے ساتھ کہ علامہ شبلی جس پائے کے عالم ومورخ تھے اب تک ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا، ماہنامہ صبا کا ''شبلی نمبر'' شائع کیا۔ یہ خصوصی شمارہ کئی حیثیتوں سے بہت اہم ہے۔ خاص طور پر اس میں شامل عالم خوندمیری کا انتہائی اہم مضمون ''اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں شبلی کا حصہ'' قابل ذکر ہے۔ اس کی اشاعت کا سبب بیان کرتے ہوئے سلیمان اریب نے لکھا ہے کہ

''شبلی کا شمار اردو کی عہد آفریں اور تاریخ ساز شخصیتوں میں ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔سرسید

کے بعد اگر ان کے گروہ میں کوئی شخصیت اپنے نظریات کی انفرادیت کی وجہ سے سب سے ممتاز نظر آتی ہے تو وہ مولانا شبلی کی شخصیت ہے۔ جنھوں نے ایک مورخ کی حیثیت سے مسلمانوں میں ان کے عہد عروج کی سیاسی اور قومی زندگی کی مثالیں پیش کر کے بیداری کی نئی طرح ڈالی۔ شعر العجم لکھ کر اردو میں تنقید شعر کا ایک نیا اور بہت اونچا معیار قائم کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو تنقید آج تک حالی کے مقدمہ اور شبلی کی شعر العجم کی ایسی وقیع اور مستقل اہمیت رکھنے والی تصنیفات پیش نہیں کر سکی۔ حالی کو تو وہ اہمیت مل گئی، جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے، لیکن شبلی کی شخصیت اور ان کے کام کے ساتھ صحیح معنوں میں اب تک ہم نے انصاف نہیں کیا۔ شبلی صرف مورخ و نقاد ہی نہیں تھے خود شاعر بھی تھے۔ اور انھوں نے باوجود اسلامی نقطہ نظر رکھنے کے ہندوستان کی مسلم فرقہ وارانہ سیاست پر کانگریس کی غیر مذہبی سیاست کو ترجیح دے کر اس سے اپنا سیاسی رشتہ جوڑا۔ اس منزل پر ہم کو شبلی سرسید سے بھی آگے نظر آتے ہیں۔'' (صبا، حیدر آباد، شبلی نمبر، ص:۶-۷)

---

(۱۲۵)

ڈاکٹر حسن الدین احمد

[۱۹۲۳-۲۰۱۹ء]

ڈاکٹر حسن الدین احمد حیدر آباد کے رہنے والے گزیٹیڈ آفیسر اور اردو کے نامور اہل قلم اور مصنف تھے۔ مختلف موضوعات پر دو درجن سے زاید علمی و ادبی کتابیں لکھیں۔ حیدر آباد کے اہل علم اور ارباب کمال پر ان کی کاوشیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ بالخصوص انہوں نے ریاست حیدر آباد کے ذخائر اور دستاویزات سے انہوں نے متعدد کتابیں مرتب اور شائع کی ہیں۔ ان کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

انجمن [م:۱۹۷۴ء]، محفل [م:۱۹۸۲ء]، بزم [م:۱۹۸۴ء]، انگریزی شاعری کے

منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ برائے پی ایچ ڈی [م:۱۹۸۴ء]، چار نغمے، فطری علاج [م:۱۹۵۴ء]، ہندوستان کا معاشرتی نظام [م:۱۹۴۲ء]، جامعہ عثمانیہ [م:۱۹۸۸ء]، اردو ترجمہ شریمد بھگوت گیتا [م:۱۹۴۷ء] احسن البیان فی علوم القرآن [۱۹۸۹ء]، قرآن فہمی آسان راستہ [م:۱۹۸۶ء]، اردو الفاظ شماری [م:۱۹۷۳ء]، زبان زد اشعار [م:۱۹۸۲ء]، ساز مغرب [م: ۱۹۷۶ء]، ساز مشرق اول [م:۱۹۷۹ء]، ساز مشرق دوم [م:۱۹۸۰ء] وغیرہ

ان کے علاوہ انگریزی میں بھی متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر حسن الدین نے شیخ سلیم احمد کی کتاب 'امیر خسرو' کا تعارف لکھا ہے۔ شیخ صاحب نے علامہ شبلی کا مشہور مقالہ جو شعر العجم کے علاوہ بیان خسرو اور حیات خسرو کے عنوان سے علاحدہ بھی شائع ہوا، اسے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد کا خیال ہے کہ "مولانا شبلی نے شعر العجم میں امیر خسرو پر جو مقالہ لکھا ہے اس کو علمی اور تحقیقاتی لحاظ سے بلند درجہ دیا جا سکتا ہے، اس مقالہ کی شمولیت کی وجہ سے زیر بحث مجموعہ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔" (امیر خسرو، ص:۴)

---

(۱۲۶)

ڈاکٹر ابن فرید

[۱۹۲۵-۲۰۰۳ء]

ڈاکٹر ابن فرید کا شمار اردو کے انتہائی اہم ادیبوں اور ناقدوں میں ہوتا ہے اور وہ بلا شبہ بڑے وسیع المطالعہ اور صاحب فکر ونظر ادیب تھے۔ انھوں نے نامساعد حالات کے باوجود قلم وکاغذ کا رشتہ ہمیشہ استوار رکھا اور اہم موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ ان کے مضامین کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں چہرہ پس چہرہ، میں ہم اور ادب، نیرنگ جہاں، یہ جہاں اور ہے، صواب دید وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

منشی محمد امین زبیری، مولوی عبد الحق، ڈاکٹر وحید قریشی اور شیخ محمد اکرام نے علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر ونظر پر جو ناروا حملے کیے، یا کردار کشی کی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی نقطہ نظر سے ڈاکٹر

ابن فرید نے ان کا ایسا مسکت جواب لکھا کہ ان مصنفین کو اپنے خیالات بدلنے پڑے۔ ان کے مقالے کا نام ''شبلی چوں بہ خلوت می رود'' ہے۔ یہ مقالہ ادیب علی گڑھ کے ''شبلی نمبر'' میں شائع ہوا ہے۔ اب ان کے مجموعہ مضامین ''میں، ہم اور ادب'' میں شامل ہے۔

علامہ شبلی کے حوالہ سے ان کا بڑا اہم کارنامہ ماہنامہ ''ادیب'' کے ''شبلی نمبر'' کی ترتیب و اشاعت ہے۔ آج تک اس بلند معیار کا خصوصی شمارہ شاید ہی کسی رسالے نے علامہ شبلی کی شخصیت اور کارناموں پر شائع نہیں کیا ہو۔ ضخامت اور مشمولات ہر دو لحاظ سے یہ بہت وقیع ہے۔ اس کا مفصل جائزہ راقم کی کتاب ''شبلی شناسی کے سو سال'' میں شامل ہے۔

ادیب ''شبلی نمبر'' کے دیباچہ کے ایک ایک حرف سے ان کی شبلی شناسی کا اظہار ہوتا ہے، جس طرح انھوں نے مقالات کے حصول کے لئے خط و کتاب کی، برابر رابطہ کرتے رہے اور اس نمبر کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے جدوجہد کی، طباعت و اشاعت کے مراحل سے جس طرح نبرد آزما ہوئے، اداریہ میں اس کی تمام تفصیل انھوں نے قلم بند کی ہے۔

علامہ شبلی کے چھوٹے بھائی محمد مہدی حسن [م:۲۹ رجون ۱۸۹۷ء] کے مکاتیب لندن ان کے ہاتھ آئے تو انھوں نے ان خطوط کی روشنی میں نہ صرف مہدی حسن کی صلاحیتوں کا ذکر کیا بلکہ علامہ شبلی پر کئی اعتراضات کا بھی ان خطوط کی روشنی میں سدباب کیا۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد مضمون ہے۔ ڈاکٹر ابن فرید کو علامہ شبلی کی شخصیت پر لگے داغ دھبہ کو صاف کرنے کے لئے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

---

(۱۲۷)

سید مسیح الحسن

[•••]

سید مسیح الحسن نے ۱۹۹۲ء میں مولانا ابو الکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] کے حواشی کو ''حواشی ابو الکلام آزاد'' کے نام سے مرتب کیا، جسے اردو اکادمی دہلی نے شائع کیا۔ مولانا ابو الکلام

آزاد زیر مطالعہ کتب پر حواشی لکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ علامہ شبلی کی کئی کتابوں پر ان کے حواشی اور فٹ نوٹ ہیں۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ مقالات شبلی جلد اول، مذہبی

۲۔ مقالات شبلی جلد دوم، ادبی

۳۔ مقالات شبلی جلد ہفتم، فلسفیانہ

۴۔ رسائل شبلی (کاپی اول و کاپی دوم)

۵۔ سیرۃ النعمان (اول و دوم)

۶۔ شعر العجم (اول)

۷۔ الغزالی

۸۔ مضامین عالم گیر

سید مسیح الحسن نے حواشی ابوالکلام پر ایک طویل مقدمہ لکھا ہے۔ چونکہ اردو کتابوں میں سب سے زیادہ حواشی علامہ شبلی کی کتب پر ہیں اس لئے نسبتاً ان کا ذکر بھی زیادہ ہے۔ یہ اگرچہ اختلافی نوٹ ہیں اور علامہ شبلی کے بعض نقطہ نظر سے مولانا آزاد نے اختلاف کیا ہے، تاہم یہ حواشی مولانا آزاد کی علامہ شبلی اور ان کی کتابوں اور ان کی فکر و نظر سے گہری دلچسپی کا مظہر بھی ہیں۔

سید مسیح الحسن مرحوم نے سب سے پہلے ان کتابوں کے مطالعہ کے زمانہ کی تعیین کی ہے۔ اور تفصیل سے دکھایا ہے کہ کون سی کتاب کس سنہ میں ان کے مطالعہ میں آئی۔ اس میں انھوں نے قیاس سے بھی کام لیا ہے۔ الغزالی علامہ شبلی نے آزاد کو تحفہ میں ۱۹۱۲ء میں دی تھی۔ سید مسیح الحسن صاحب نے اس کا سنہ اشاعت ۱۹۰۱ء لکھا ہے، حالانکہ وہ ۱۹۰۲ء میں شائع ہی ہوئی تھی۔ مقالات شبلی، الغزالی اور مضامین عالم گیر کے سوا جن کتابوں پر حواشی ہیں ان کے زمانہ مطالعہ کی تعیین کرتے ہوئے مقدمہ نگار نے لکھا ہے کہ

''باقی پانچ کتابوں کے متعلق قرائن سے فرض کیا جاسکتا ہے کہ وہ کتابیں مولانا نے ۱۸۹۲-۱۹۱۰ء کے درمیانی زمانہ میں مطالعہ فرمائیں، کیوں کہ ان سب کتابوں پر تفصیلی تبصرے اور اختلافی تنقیدیں ہیں۔ نیز یہی وہ دور ہے جب مولانا مشکوک

وتذبذب سے گذر رہے تھے اور زبردست مطالعہ میں منہمک تھے۔"

(حواشی ابوالکلام آزاد، مقدمہ ص:۳۰)

مولانا ابوالکلام آزاد اگست رستمبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ محض چار سال کی عمر میں علامہ شبلی کی کتابوں کے مطالعہ کا زمانہ قرار دینا سمجھ سے بالاتر ہے۔

علامہ شبلی حنفی تھے۔ ایک زمانہ میں ان میں بڑی شدت تھی۔ سرسید کی صحبت میں کچھ کمی آئی مگر ان پر حنفیت کا ہمیشہ غلبہ رہا۔ مولانا آزاد سلفیت کے ذوق آشنا بھی تھے۔ اس لئے ان کے بہت سے حواشی اس کے زیر اثر وجود میں آئے ہیں۔ سید مسیح الحسن صاحب نے بھی یہ بات لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"رہا الغزالی کا معاملہ، اگرچہ یہ ۱۹۱۲ء میں پڑھی ہوگی تاہم یہ بھی کچھ زیادہ بعد کا زمانہ نہیں ہے۔ اس کتاب پر حاشیوں میں حنفیت کے خلاف اظہار خیال کیا گیا ہے اور علامہ شبلی کے افکار وخیالات کی پرزور تردید کی ہے۔ یونانی فلسفہ کے بارے میں چند تاریخی واقعات سے اختلاف کیا ہے لیکن یہاں اتنے تیز وتند اختلاف نہیں ہیں جتنے سیرۃ النعمان اور مضامین عالمگیر پر ہیں۔" (ایضاً)

"مضامین عالم گیر" پر بھی ان کے اعتراضات کا سبب ان کا ذوق نظر ہے۔ مولانا آزاد علی العموم داراشکوہ کی فکر ونظر کے موید نظر آتے ہیں۔ راقم نے اپنے مضمون مشمولہ متعلقات شبلی میں مضامین عالم گیر پر حواشی آزاد کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے، اس لئے یہاں اس سے قطع نظر کیا جاتا ہے۔ البتہ یہاں یہ ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حواشی آزاد کی اشاعت [۱۹۹۲ء] کے پچیس سال بعد بھی علامہ شبلی نعمانی کے حوالہ سے ان کے اختلافات کا جائزہ نہیں لیا جا سکا ہے۔ خاص طور پر سیرۃ النعمان اور مضامین عالم گیر پر حواشی آزاد کا مطالعہ وجائزہ ضروری ہے۔ ان دونوں کتابوں پر جو اعتراضات ہیں مقدمہ نگار نے ان کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ طوالت کے خوف سے انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

"مقالات شبلی" پر بہت معمولی قسم کے نوٹس ہیں۔ سید مسیح الحسن لکھتے ہیں:

"مقالات شبلی جلد دوم پر محض ایک جگہ معمولی سے سہو پر اعتراض ہے۔

تلسی داس کی جگہ کالی داس کا نام آ گیا ہے۔ عین ممکن ہے یہ چھپائی کی غلطی ہو۔
دوسری کتاب مقالات شبلی اول ۱۹۳۰ء کی مطبوعہ ہے۔ یہ کتاب مذہبی مقالات پر
مشتمل ہے۔ ایک مقالہ میں عیسائی فرقوں کے ناموں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کچھ
اصطلاحوں کے استعمال سے مولانا آزاد نے اختلاف کیا ہے۔ ایک مقام پر عربی
عبارت کا ترجمہ غلط قرار دیا ہے۔ ورنہ بحث ونظر کے تفصیلی تبصرے اس کتاب
میں نہیں ہیں۔ تیسری کتاب مقالات شبلی جلد ہفتم فلسفیانہ مباحث پر مشتمل ہے۔
یہ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہاں ''استقرا'' کے سلسلہ میں ایک جزوی
اختلاف ہے۔ کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے۔'' (ایضاً ص: ۲۹-۳۰)

رسائل شبلی اور شعر العجم پر مولانا آزاد کے زبان وادب سے متعلق اختلافی حواشی کا مطالعہ
ضروری ہے۔ مقدمہ نگار نے اس کے نمونے مقدمہ میں درج نہیں کئے ہیں۔

سید مسیح الحسن نے مسعود الحسن عثمانی کا پہلے یہ بیان نقل کیا ہے کہ'' آخر عمر میں مولانا آزاد کو
علامہ شبلی کی نسبت بہت سی باتوں سے اختلاف بھی ہو گیا تھا اور وہ بہت سے نظریات جو علامہ شبلی کی
زندگی میں ان کے ذہن پر چھائے رہے اب تبدیل ہو گئے تھے۔ پھر مقدمہ نگار نے کسی قدر تفصیل
سے اس بیان کا تجزیہ کیا ہے اور آخر میں سوال قائم کیا ہے کہ وہ کون سی کتابیں ہیں اور کہاں ہیں جن
پر انھوں نے اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں اس عقدہ کشائی سے قاصر رہا۔ (ایضاً ص: ۳۵)

سید مسیح الحسن صاحب مزید لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک علامہ شبلی سے مولانا آزاد کے اختلاف کا تعلق ہے، میری
> نظر میں کم از کم ان حواشی کے سلسلہ میں وہ ان کے ابتدائی دور کا معاملہ ہے اور عین
> ممکن ہے کہ مولانا کے الندوہ سے تعلق سے ذرا پہلے مئی ۱۹۰۵ء سے قبل یا اس کے
> کچھ عرصہ بعد کا ہو۔ زیر بحث حواشی ہرگز مولانا کے آخری دور کی تحریریں نہیں
> ہوسکتیں۔ آزاد بھون کی لائبریری کے علاوہ کوئی دوسری کتابیں عثمانی صاحب کے
> پیش نظر رہی ہوں جن پر مولانا نے اپنے آخری زمانہ میں اعتراضات قلم بند
> فرمائے ہوں تو ٹھیک ہے، مگر میری متلاشی نگاہ ان تک نہیں پہونچ سکی۔''

(ایضاً،ص:۳۵-۳۶)

خدا جانے ہمارے اہل قلم کس طرح تجزیہ کرتے ہیں اور کیا کیا معنی ومفہوم نکالتے ہیں۔ معمولی حواشی کو اختلاف سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کا حوالہ تک نہیں دیتے۔ ایسی کوئی بات قابل ذکر ہوتی تو ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' میں کم از کم مولانا آزاد خود ذکر کر دیتے جیسا کہ وہ بیان کرنے میں بے باکی دکھاتے ہیں اور پھر ان کی انانیت انھیں کب چین لینے دیتی، لیکن علامہ شبلی سے تعلقات کا معاملہ ذرا دیگر ہے۔ جتنا انھوں نے علامہ شبلی کا ادب واحترام کیا شاید ہی کسی کا کیا ہو۔ اور شاید ہی کسی نے علامہ کو اس قدر حرز جاں بنائے رکھا ہو، سوائے تلامذہ شبلی کے۔

علامہ رشید رضا نے جلسہ ندوہ میں جو صدارتی تقریر کی تھی اس کا ترجمہ مولانا آزاد نے کیا تھا۔ اس سلسلہ میں سید مسیح الحسن نے نیاز فتح پوری کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ

> ''علامہ رشید رضا ایڈیٹر المنار ایک عظیم الشان اجتماع میں جو بڑے بڑے علماء پر مشتمل تھا تقریر کرنے جارہے ہیں اور ضرورت ہے ایک ایسے شخص کی جو عربی واردو دونوں کا ماہر ہو اوران کی عربی تقریر کا برمحل ترجمہ کرتا جائے۔ مولانا شبلی کے منصب سے یہ بات فروتر تھی کہ وہ خود یہ خدمت انجام دیں۔ اس لئے وہ اس باب میں متفکر تھے۔ آخر جز قیس کوئی اور نہ آیا بروئے کار۔ مولانا ابوالکلام بے تکلفانہ سامنے آتے ہیں اور اس خدمت کو اتنی خوبی ودلکشی سے انجام دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے وہ ترجمہ نہیں بلکہ خود تقریر کر رہے ہیں۔''

(ابوالکلام آزاد مرتبہ انور عارف، ص:۷-۸)

اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں جو کچھ لکھا ہے مقدمہ نگار نے اسے بھی نقل کیا ہے۔ (حواشی ابوالکلام آزاد مقدمہ، ص:۵۶)

سید مسیح الحسن صاحب نے مقدمہ میں حواشی کے نمونے بھی دیئے ہیں۔ علامہ شبلی پر جو حواشی کے نمونے ہیں وہ ''سیرۃ النعمان'' اور ''مضامین عالم گیر'' کے حواشی سے ہیں۔ ''مضامین عالم گیر'' پر جو حواشی ہیں چونکہ ان کا تنقیدی مطالعہ وتجزیہ پیش کیا جاچکا ہے ان سے قطع نظر بطور نمونہ ''سیرۃ النعمان'' کا ایک حاشیہ نقل کیا جاتا ہے۔ علامہ شبلی کی عبارت یہ ہے:

''امام ابوحنیفہ کا مذہب عقل کے موافق ہے۔امام طحاوی نے جو محدث اور مجتہد دونوں تھے،اس بحث میں ایک کتاب لکھی ہے جو شرح معانی الآثار کے نام سے مشہور ہے اور جس کا موضوع یہ ہے کہ مسائل فقہ کو نصوص اور طریق سے ثابت کیا جائے۔اس دعوی سے امام ابوحنیفہ کا مذہب عقل کے موافق ہے،شافعیہ وغیرہ کو بھی انکار نہیں اور وہ انکار کیوں کرتے ان کے نزدیک احکام شرعیہ خصوصاً عبادات جس قدر عقل سے بعید ہوں اسی قدر ان کی خوبی ہے۔''

(حواشی ابوالکلام آزاد،ص:٦٦)

مولانا آزاد کا نوٹ:

''یہ جملہ کس قدر صریح غلط و تہمت محض ہے۔مؤلف کا پورا مبحث بھی محض مغالطہ ہے۔فقہ حنفی اور مذہب محدثین وائمہ حدیث کے اختلاف کو احکام شریعت کے مطابق عقل وعلل ہونے نہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں اور نہ طحاوی کی تصنیف کا یہ مقصد ہے اور نہ نظر ودرایت سے ان کا یہ مقصود ہے جو مؤلف نے بتلایا ہے۔'' (ایضاً)

اس طرح کی سیرۃ النعمان اور مضامین عالم گیر سے کئی مثالیں نقل کی گئی ہیں۔

حیات شبلی پر بھی مولانا آزاد کے حواشی ہیں۔ایک مثال اس کی بھی یہاں درج کی جاتی ہے۔مولانا سید سلیمان ندوی نے رسالہ ظل الغمام کی ایک عبارت نقل کر کے لکھا ہے کہ علامہ شبلی کے قلم میں علی گڑھ جانے سے پہلے انشاپردازی کا زور موجود تھا۔'' (ایضاً،ص:٧١)

اس پر مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ ''بھلا اس رسالہ کی عبارت کو انشاپردازی سے کیا مناسبت ہے۔'' (ایضا) اسی طرح مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کے عقد ثانی کا ''حیات شبلی'' میں جہاں ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ عقد ثانی کا یہ ارادہ ان کے صاحبزادے حامد حسن کو ناگوار گذرا اور وہ چپکے سے لاپتہ ہوگئے۔مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ''پہلے یہ رشتہ خود حامد کے لئے تجویز ہوا تھا۔'' (ایضاً،ص:٧١)

ہم نے مذکورہ بالا مثالیں بطور نمونہ نقل کی ہیں۔ان کا تجزیہ مقصود نہ تھا تاہم آخرالذکر کے

حاشیہ کے سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ کسی اور ذریعہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی اور نہ اس زمانہ میں مولانا آزاد علامہ شبلی کے عالم السرائر تھے کہ ان کا بیان تسلیم کرلیا جائے۔

آخر میں سید مسیح الحسن نے علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی سے مولانا ابوالکلام آزاد کے گوناگوں تعلقات اور عقیدت مندانہ جذبات کی مثالیں پیش کی ہیں۔ پہلے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام خطوط سے اقتباسات نقل کرکے دونوں کے باہمی محبت آمیز تعلقات کی داستان سنائی ہے۔ پھر مولانا شبلی کے متعلق مولانا آزاد کے تاثرات نقل کئے ہیں۔ اوراس سلسلہ کے کئی اقتباسات درج کئے ہیں۔ ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ہر وقت مولانا مرحوم سے یکجائی رہتی تھی۔ وہ بھی صبح سویرے اٹھنے کے عادی تھے اور میں بھی بچپن سے اس کا خوگر تھا۔ جاڑے کا موسم تھا، صبح چار بجے میں ان کے کمرے میں چلا جاتا۔ اسی وقت چائے کا دور چلتا۔ طرح طرح کے علمی تذکرے رہتے۔ شام کو کبھی قیصر باغ یا اور کہیں دور کا چکر لگانے نکل جاتے اور یہ تمام وقت بھی علمی وادبی تذکروں میں بسر ہوتا۔ حقیقۃً وہ ایسی صحبتیں تھیں جن کا لطف وکیفیت عمر بھر فراموش نہ ہوگی۔ مجھے ان صحبتوں سے بہت فائدہ ہوا۔ مولانا مرحوم کے انتقال سے جہاں کتنی ہی خوبیاں اور کمالات ان کے ساتھ دفن ہوگئے، وہاں ایک سب سے بڑی چیز یہ پر لطف صحبت تھی جو ان کے بعد ایک مرتبہ بھی مجھے کہیں کسی گوشے اور کسی حلقے میں میسر نہ آئی۔ ان کا علمی ذوق جو وسیع اور ہر وادی میں تھا، ان کے ساتھ ہی مدفون ہوگیا۔'' (ایضاً ص: ۷۷-۷۸)

سید مسیح الحسن مرحوم نے مولانا آزاد کا ایک اور اقتباس نقل کیا ہے۔ وہ یہ ہے:

> ''فی الحقیقت مولانا کی ذات نوع بہ نوع کمالات کے رنگا رنگ مظاہر کا ایک عجیب مجموعہ تھی۔ اور جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں سرتا سر بے مغز وپوست تھی۔ بہ مشکل کوئی مہینہ ایسا گذرتا ہے کہ دو تین مرتبہ ان کی یاد ناخن بدل نہ ہوتی ہو۔ وہ کیا گئے کہ علم وفن کی صحبتوں کا سرتا سر خاتمہ ہوگیا۔ ہر وادی میں وہ اپنے ذوق وفکر کی ایک خاص اور بلند جگہ رکھتے تھے اور یہ کتنی بڑی خوبی تھی کہ باوجود ملا یا نہ

طالب علم کے ملائیت کی پرچھائیں بھی ان پر نہ پڑی تھی۔" (ایضاً ص:۸۷)

مولانا ابوالکلام آزاد کے اس طرح کے اور بھی کئی اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔ان کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے بھی کئی اقتباسات نقل کیے گئے ہیں، خود علامہ شبلی نعمانی کے ایک خط کا بھی مقدمہ نگار نے اقتباس دیا ہے۔طوالت کے سبب ان سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔آخر میں سید مسیح الحسن نے خلاصہ کے طور پر لکھا ہے کہ

"یہ عقیدت، یہ خلوص، یہ قربت مولانا شبلی اور مولانا آزاد کے درمیان تھی اور اسی کی بنیاد پر اہل قلم، مفکرین اور ناقدین نے ان دونوں عظیم ہستیوں کے باہمی شخصی اور علمی روابط کا جائزہ لیا ہے۔ بلاشبہ یہ تصویر کا بڑا دلکش اور حسین رخ ہے، مگر اس سے مولانا آزاد کی تصویر کے اس دوسرے رخ کا اندازہ نہیں ہوگا جو ان کے حاشیوں کی تحریروں سے ابھرتا ہے۔

علمی مباحث میں مخالفت یا تردید کوئی عیب نہیں ہے، لیکن طریق اختلاف اور طرز تخاطب جو مولانا آزاد نے ان حاشیوں میں روا رکھا ہے وہ پبلک کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے ہرگز اختیار نہ کرتے۔ ایسی چند مثالیں انانیت اور طنز و مزاح کے مباحث میں پیش کی جاچکی ہیں۔" (ایضاً ص:۸۰)

حواشی ابوالکلام آزاد کی یہی حقیقت بھی ہے کہ وہ ذاتی فٹ نوٹ ہیں، لیکن بہر حال علمی حیثیت سے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔

حواشی ابوالکلام آزاد کی تدوین سید مسیح الحسن مرحوم کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ایسی محنت سے اردو میں کم کتابیں مرتب کی جاتی ہیں۔لیکن اسی کے ساتھ یہ کس قدر افسوس ناک پہلو ہے کہ کوئی شخص حواشی ابوالکلام کے فاضل مرتب سید مسیح الحسن سے واقف نہیں۔اور ان کی وفات پر کسی اردو کے ادیب و شاعر نے آنسو نہیں بہائے۔تمام تر تلاش و جستجو کے باوجود راقم ان کے حالات و سوانح اور دیگر کاوشیں تو دور ان کی تاریخ پیدائش اور وفات تک معلوم نہ کر سکا۔دراصل ہمارا یہ مذاق رہا ہے کہ خالص علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کی طرف ذرا کم توجہ دیتے ہیں ہیں۔

(۱۲۸)

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

[۱۹۲۵-۲۰۱۳ء]

علامہ شبلی نعمانی اردو سوانح نگاری کے بنیاد گذاروں میں ہیں۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی اردو کے ممتاز ادیب وشاعر اور نقاد تھے۔ انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں۔ تجسس سے تجزیے تک، ذوق دہلوی، ذوق سوانح اور انتقاد، لمحوں کی خوشبو، رقص لمحات وغیرہ ان کے نام ہیں۔ ''اردو میں بارہ ماسے کی روایت'' ان کی بہت مشہور کتاب ہے۔ وہ سال نامہ فکر نو دہلی کے مدیر بھی رہے۔ غرض اردو کی بڑی اہم خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے متعدد کتابوں پر پیش لفظ اور دیباچے لکھے ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز فاخرہ کی کتاب ''اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء'' پر مقدمہ لکھتے ہوئے انہوں نے علامہ شبلی کی سوانح نگاری کا بھی تجزیہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''علامہ شبلی نے زیادہ تر مذہبی موضوعات کو لیا اور اس میں زیادہ سے زیادہ داد تحقیق دی، لیکن شخصی سوانح عمریوں میں دھوپ چھاؤں کے جو منظر ہمیں نظر آتے ہیں وہ ان عظیم تاریخی شخصیتوں سے وابستہ کرنا مشکل تھا۔ حضرت عمرؓ کے شہادت کے واقعہ پر شبلی کے قلم نے جو محتاط روش اختیار کی ہے اس سے ان کی مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور اس امر کا بھی کہ وہ بعض واقعات وتجزیہ سے محض اس لئے گریز کر جاتے ہیں کہ عقیدہ وعقیدت شاید انہیں اس کی اجازت نہیں دیتے۔''
>
> (اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء، ص:۱۰)

ڈاکٹر علوی کے تجزیے سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے۔ اور متعدد نقادوں نے اس سے اختلاف بھی کیا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مقدس ہستیوں کی سوانح نگاری میں ان کا تقدس باقی رکھنا ایک مشکل امر ہے اور علامہ شبلی نے اسے جس طرح برتا ہے بس وہ انہی کا حصہ ہے۔

---

(۱۲۹)

ڈاکٹر وحید قریشی

[۱۹۲۵-۲۰۰۹ء]

ڈاکٹر وحید قریشی اردو کے نامور ادیب اور نقاد تھے۔ متعدد اہم کتابیں لکھیں۔ ان میں جدیدیت کی تلاش، اقبال اور پاکستانی قومیت، باغ و بہار ایک تجزیہ، فلسفہ اور ادبی تنقید، مطالعہ حالی، مقالات تحقیق، نذر غالب دیوان جہاں دار، وغیرہ

ڈاکٹر صاحب متعدد اہم عہدوں پر فائز رہے۔ اسلامیہ کالج لاہور اور گجرانوالہ میں تاریخ کے استاد، پنجاب یونیورسٹی میں اردو کے استاد اور اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں فارسی کے صدر شعبہ رہے۔ غالب پروفیسر اور اقبال اکادمی لاہور کے ناظم بھی رہے۔ اور بھی بہت سے شعبوں میں کام کیا۔ متعدد ادبی و تعلیمی اداروں کے رکن رہے۔ کئی رسائل وجراید کی ادارت کا فریضہ بھی انجام دیا۔

ان کی اولین شہرت ان کی کتاب ''شبلی کی حیات معاشقہ'' کی وجہ سے ہوئی، جس نے ایک حلقہ میں بڑی شہرت پائی۔ دراصل بابائے اردو مولوی عبدالحق اور منشی محمد امین زبیری نے خطوط شبلی کی اشاعت ۱۹۲۶ء سے تنقیص شبلی کے جس سلسلے کا آغاز کیا تھا، وحید قریشی کی کتاب جو ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی اس سلسلہ کی انتہا تھی۔ ساٹھ اور ستر کے عشرے میں اس کتاب اور منشی محمد امین زبیری کی کتاب ''شبلی کی رنگین زندگی'' اور ان کتابوں کے حوالہ کے ساتھ شیخ محمد اکرام کی ''شبلی نامہ'' نے علامہ شبلی کی شخصیت کو مجروح کیا۔ ان کتابوں کے بعض ناکافی جوابات بھی لکھے گئے، اور آخر میں ڈاکٹر وحید قریشی کو خدا جانے کیا احساس ہوا کہ انہوں نے اپنی اس کتاب کو اپنی تصنیفات سے خارج قرار دیدیا۔ اور پھر اسے کتب خانوں سے غائب بھی کرایا۔
(شبلی کی حیات معاشقہ، ص:۱۶)

یہ قصہ اپنی جگہ ہے، انہوں نے اپنی تحریروں میں کئی مقامات پر بڑے اچھے انداز میں علامہ شبلی کا ذکر کیا ہے۔ مارچ ۱۹۸۸ء میں ان کی کتاب 'مقالات تحقیق' مغربی پاکستان اردو اکیڈمی سے

شائع ہوئی تو اس میں علامہ شبلی کے ادارہ دارالمصنفین کو ایک تحقیقی ادارہ قرار دیا اور لکھا کہ

> ''دوسرا دبستان جس کا مرکز اعظم گڑھ ہے، اس لحاظ سے دکنی دبستان سے مختلف ہے کہ وہاں اردو کو صرف زبان کی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی علمی زبان کے طور پر دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ اور اس صورت حال کا علمی جائزہ مذہبی رجحانات اور مذہبی علوم کی روشنی میں لیا گیا۔ علامہ شبلی کی مورخانہ روایت ان لوگوں کے لئے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ متن کی ترتیب وتصحیح کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ اس کے مقابلہ میں اردو ادب کے بنیادی مسائل کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا گیا۔'' (مقالات تحقیق، ص: ۱۰)

یہ رفقائے دارالمصنفین کے عظیم الشان کارناموں کا ایک بڑا اعتراف ہے۔

---

(۱۳۰)

رشید حسن خاں

[۱۹۲۵-۲۰۰۶ء]

رشید حسن خاں ہمارے عہد کے ممتاز ترین محقق ونقاد تھے۔ تحقیق اور خاص طور پر متنی تحقیق کے میدان میں انھوں نے جو کاوشیں کی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں اور جو تاریخ ادب اردو میں سنہرے حرفوں میں لکھی جائیں گی۔ حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی کو وہ اپنا معنوی استاذ تسلیم کرتے تھے اور انھیں کے نہج پر وہ تحقیقات کا آغاز کرتے ہیں، مگر سچ یہ ہے کہ متنی تحقیق میں رشید حسن خاں صاحب اس بلند مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں ان کے معنوی اساتذہ نہ پہنچ سکے تھے۔

رشید حسن خاں نے علامہ شبلی کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ ادبی زندگی کے آغاز اور پچیس سال کی عمر میں انھوں نے شبلی کی فارسی شاعری کا بڑی گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیا تھا جو مئی ۱۹۵۰ء کے نگار میں ''شبلی کا فارسی تغزل'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے قدرے تفصیل سے شبلی کے جذبات اور احساسات کا تجزیہ کیا ہے اور کئی اور نقادوں کی طرح ان کی

شاعری کو حافظ وسعدی سے جاملایا ہے۔ ان کے شاعرانہ جذبات کے مطالعہ میں وہ بھی بمبئی پہونچے ہیں لیکن دادسخن دی ہے اوروں کی طرح بات سے بات پیدا نہیں کی ہے، اپنے وسیع وعمیق مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

''شبلی اپنے رنگ کے بے مثل فنکار ہیں، انھوں نے اپنے اشعار میں احساسات وجذبات کی بے لاگ تصویریں پیش کی ہیں۔ ایسی تصویریں جو حسین ترین رنگوں سے مزین ہیں اور جن کے امتزاج میں انھوں نے اس مذاق سلیم کا ثبوت دیا ہے جو کم دیکھنے میں آتا ہے۔ آپ پورا مجموعہ فارسی غزلیات کا پڑھ جائیے ایک شعر میں بھی اس حدیث شوق کے علاوہ کسی دوسری بات کا بیان نہیں ہوگا۔ یہی بات ان کے مذاق سلیم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔''

(مقالات رشید خاں، جلد اول، ص: ۶۷)

یہ مضمون بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے آغاز میں شائع ہوا۔ خاں صاحب نے بیس سال بعد شبلی کے مضامین کا انتخاب اس وقت کیا جب وہ ایک ممتاز متنی محقق کی حیثیت سے تسلیم کئے جاچکے تھے۔ انتخاب مضامین شبلی ۱۹۷۱ء میں مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا۔ یہیں سے ۱۹۹۳ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن طبع ہوا جو راقم کے پیش نظر ہے۔ اب اس کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہوگیا ہے۔

موازنہ انیس ودبیر کے متعدد محقق ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ رشید حسن خاں نے بھی اسے مرتب کیا ہے جس کا ذکر راقم کی کتاب ''آثار شبلی'' میں شامل ہے۔ یہاں اس کے تعارف و تجزیے کی تفصیلات سے صرف کرتے ہوئے محض رشید حسن خاں کے دیباچہ کے مشمولات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ خان صاحب علامہ شبلی کی جامعیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی کے متعلق یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ وہ مختلف موضوعات پر یکساں دسترس رکھتے تھے، مستقل تصنیفات کے علاوہ ان کے مختلف مضامین کے مجموعے بھی اس پر گواہ ہیں۔ سیرت، سوانح، تنقید اور معقولات پر ان کی تصنیفات معروف ہیں، لیکن مضامین کے مجموعوں میں ان کے موضوعات کا دائرہ وسیع تر نظر آتا ہے، مذہبیات اور اردو ہندی کی بحث، عربی کے نصاب کے مسائل

،اسلامی تہذیب کے اہم عنوانات، قرآن پاک کے متعلق فکر انگیز مقالے، قدیم کتابوں پر مختصر اور مفصل تبصرے، ادبی مباحث، مستشرقین کی غلط کاریوں کی تردید، سیاسی افکار، غرض بیسیوں اہم موضوعات پر بحث کی گئی ہے، اور ہر جگہ ان کے مخصوص انداز تحریر کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا، ذہن کس درجہ پر نکتہ رس تھا، نظر کیسی باریک تھی اور قلم میں کس قیامت کی توانائی تھی۔'' (تعارف، موازنہ انیس ودبیر، ص۵)

علامہ شبلی کی شخصیت کا ایک اہم پہلو قدیم صالح اور جدید نافع کا امتزاج ہے۔ وہ اپنے عہد میں اس کے سب سے بڑے علمبردار تھے اور ابتدا سے تھے۔ علی گڑھ پہنچنے کے بعد ہی ان کی تحریروں میں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ علی گڑھ سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا، لیکن علی گڑھ تحریک نے بھی ان سے بہت کچھ حاصل کیا، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، تاہم ان کا یہی ارتقائی نظریہ ان کی علی گڑھ تحریک سے سولہ سالہ وابستگی کے باوجود انحراف کا باعث ہوا اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تحریک ندوہ میں شمولیت اختیار کی اور یہی وجہ ہے کہ اخیر تک ان کا رشتہ علی گڑھ سے بھی استوار رہا اور اسی وجہ سے قدامت پرستوں نے ان پر کفر کے فتوے لگائے۔ رشید حسن خاں اس امتزاج کو علامہ شبلی کا بڑا کارنامہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شبلی کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے قدیم وجدید کے قصے کو اپنے ذہن پر حاوی ہونے نہیں دیا۔ وہ قدیم کی عظمت کے قائل تھے لیکن اس کی کمزوریوں سے بھی باخبر تھے اور معترف بھی۔ وہ جدید کی اہمیت کو پوری طرح مانتے تھے لیکن اس سے مرعوب نہیں تھے۔ آج شاید اس بات کی اہمیت کا اندازہ نہیں کیا جاسکے گا، لیکن شبلی کے زمانے میں اس توازن کی بڑی ضرورت تھی۔''

(ایضاً، ص:۵-۶)

اس کے بعد خاں صاحب نے عہد شبلی پر روشنی ڈالی ہے۔ قدامت پرستوں کی کمزوریوں اور جدید ذہن اور مغربیت کے سیلاب کا ذکر کیا ہے اور تفصیل سے بتایا ہے کہ ہمارے علماء کا کیا معیار تھا؟ معاشرے کا کیا حال تھا؟ مشنریاں کیا کر رہی تھیں؟ ایسے غیر معتدل ماحول میں علامہ شبلی

نے توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایسے زمانے میں جب کہ یا تو مسائل سے بے تعلقی تھی یا تعلق تھا تو توازن کا پہلو دب گیا تھا، شبلی نے مذہبی مسائل اور سیاسی امور دونوں میں وہ انداز اختیار کیا جس میں توازن کا پہلو نمایاں تھا، وہ سرسید سے بہت متاثر تھے، ان سے بہت کچھ سیکھا بھی تھا، اس کے معترف بھی تھے، لیکن بہت سے سیاسی اور مذہبی مسائل میں ان سے سخت اختلاف رکھتے تھے، وہ مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیتے جاتے ہیں، لیکن یورپ کی علمی فیض بخشیوں اور اس کے احسانات کا اقرار بھی کرتے جاتے ہیں، وہ جدید تعلیم کی سطحیت سے خوش نہیں لیکن قدیم تعلیم کی عدم افادیت کے بھی اسی طرح قائل ہیں اور ندوے میں اس حد تک اصلاح کرنے کے درپے تھے جس کو پرانے خیال کے علماء برداشت نہیں کر سکے۔'' (ایضاً ص:۷)

اس کی اور بھی تفصیل انھوں نے لکھی ہے۔ علامہ شبلی کی وسعت ذہنی اور وسعت قلبی کا بھی ذکر کیا ہے اور قدیم وجدید کے سلسلہ میں ان کے نقطہ نظر کی بھی وضاحت ہے۔ اس تجزیے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''اصلاح کا یہ جذبہ اور صاف گوئی کا یہ انداز شبلی کا قابل قدر عطیہ ہے جو انھوں نے اس زمانے میں نئی نسل کو بخشا، ان کے مضامین میں یہ سارے مباحث ومسائل محفوظ ہیں اور اسی لئے ان کے مضامین کی بڑی اہمیت ہے۔'' (ص:۸)

اور اسی اہمیت کے پیش نظر انھوں نے ''انتخاب مضامین شبلی'' کو بھی مرتب کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے علامہ شبلی کی انشا پردازی کا ذکر کیا ہے اور اسے ایک مسلمہ اور متفق علیہ مسئلہ بتایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ پھر انھوں نے معاصرین شبلی کے اسالیب بیان کی توضیح کے ساتھ اس میں علامہ شبلی کی انفرادیت کا ذکر کیا ہے۔ اس میں یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ اسلوب شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے علامہ شبلی کے اسلوب اور ان کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''ان کی شخصیت کثیر الجہات تھی، سیاست، ادب، مذہب، تاریخ، فلسفہ وغیرہ

بہت سے اطراف وموضوعات ان کی جولان گاہ تھے۔ وہ مولوی تھے، استاذ تھے، سیاسی مسائل سے بھی تعلق رکھتے تھے اور شاعر بھی تھے۔ ان کی سوانح کا سرسری مطالعہ بھی اس بات کی تعیین کے لئے کافی ہوگا کہ پرجوش جذباتیت ان کے مزاج کا غالب عنصر تھا اور اس کے اثرات بھی نمایاں ہوتے رہتے تھے۔ ادب میں ہی نہیں عام زندگی میں بھی، مثلاً وہ سردیوں میں بھی بہت تیز برف کا پانی پینا پسند کرتے تھے اور شیرینی اس قدر زیادہ مرغوب تھی کہ میٹھی سے میٹھی چیز بھی کچھ کم میٹھی معلوم ہوتی تھی۔'' (ایضاً ص:۹)

اس تجزیے سے انھوں نے علامہ شبلی کی انتہا پسندی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور ''حیات جاوید'' کا پرانا قصہ بیان کیا ہے۔ حالانکہ اس وقت آل احمد سرور تجزیہ کر کے لکھ چکے تھے کہ علامہ شبلی کو مصور پسند تھا، اس کی بنائی ہوئی ایک تصویر ناپسند تھی۔ لیکن رشید حسن خاں کی اس بات میں وزن ہے کہ ''حیات جاوید'' کی ہیرو پرستی سے نالاں علامہ شبلی خود بھی تو شخصیت بلکہ عظمت وسطوت کے خوگر ہیں، لیکن پھر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ

''شبلی کی شخصیت اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے کہ وہ قدیم وجدید دونوں کی انتہا پسندیوں سے بیزار ہیں، تنگ نظری کے دشمن ہیں اور منطقیت کو تحریر وتقریر دونوں کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔'' (ایضاً ص:۱۰)

شبلی کی رومانیت کو سمجھنے کی صحیح کوشش اب تک نہیں کی گئی تھی اور جن لوگوں نے اس پر قلم اٹھایا انھوں نے اسے بمبئی کے دلفریب مناظر میں تلاش کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی کے رومان کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جا سکا۔ رشید حسن خاں نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے:

''رومانیت شبلی کے مزاج کا بنیادی عنصر تھی، اس سے شگفتگی کے پھول کھلتے ہیں اور مشتعل طبیعت کی آنچ بھی حرارت کو بکھیرتی ہے، اس عالم میں ان کا قلم تحریر کے ایسے پھول کھلاتا ہے جن میں شراروں کی نہیں شعلوں کی گرمی اور چمک ہوتی ہے، یہ کیفیت ان پر اس وقت خاص طور پر طاری ہوتی ہے جب وہ کسی ایسے معترض کے اعتراضات کا جواب دے رہے ہوں جس نے اسلامیات سے متعلق کسی

مسئلے پر یا تاریخ اسلام کے کسی دور یا فرد پر نکتہ چینی کی ہو، وہ حوالوں سے اپنی بات کو مستند کرتے جاتے ہیں اور ادبیت میں ڈوبے ہوئے اور ترشے ہوئے جملوں سے جلالی کیفیت کا اظہار کرتے جاتے ہیں، جوش بیان اور حسن انشا پردازی کے لحاظ سے ایسے مقامات لائق ذکر بھی ہیں اور قابل رشک بھی۔'' (ایضاً، ص:۱۱)

پھر خاں صاحب نے اس کی مثالیں درج کی ہیں اور ایسی عمدہ مثالیں دی ہیں کہ ذوق و وجدان کو متاثر کر دیتی ہیں۔ بعد ازاں انھوں نے علامہ شبلی کی عظمت اور ان کی بالغ نظری کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

''شبلی کے یہاں اپنے طبقے کی روایت کے برخلاف وسعت فکر و نظر کی جو طاقت پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عربی کی جدید ترین مطبوعات سے برابر استفادہ کرتے رہتے تھے، وہ کوشش کرتے تھے کہ یورپ کی اہم کتابوں سے بھی کسی واسطے سے استفادہ کیا جائے، ان کو سیاسی مسائل سے بھی لگاؤ تھا، ملک میں سیاسی تحریکیں چل رہی تھیں وہ ان میں بھی کچھ نہ کچھ حصہ لیتے رہتے تھے، انھوں نے اسلامی تاریخ کا بڑی توجہ سے مطالعہ کیا تھا اور فلسفے سے ان کو ربط خاص تھا جس نے ان کے اندر تنگ نظری کو شروع ہی سے پیدا ہونے نہیں دیا۔''

(ایضاً، ص:۱۲۔۱۳)

رشید حسن خاں علامہ شبلی کی عظمت و جامعیت اور بالغ نظری کے تو مداح ہیں ہی ان کے حسن انشا کے بھی بڑے مداح ہیں۔ ان کی خوش مذاقی اور شاعرانہ کمالات کا اعتراف بھی بڑے ادبی انداز میں کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''خوش مذاقی اکتسابی چیز نہیں، یہ حصہ جس کو ملا، مل گیا، شبلی کی تحریر میں سخن فہمی، شاعری اور زندگی میں بھی خوش مذاقی ان کی شریک غالب رہی ہے، فارسی کی غزلوں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ آخر دور اکبری کا طوطی خوش نوا بول رہا ہے۔ یا نظیری و عرفی کے قبیلے یا جماعت کا کوئی فرد، اسی کا اثر تھا کہ ان کی تحریروں میں بلا کا حسن ہے۔ انشا پردازی جس چیز کا نام ہے وہ واقعۃً شبلی کا حصہ ہے۔ ایسے شگفتہ

اور ترشے ہوئے۔ جملے لکھتے ہیں جن میں شاعری کا سارا حسن سمٹ آتا ہے۔"

یہی وہ انداز فکر اور انداز نگارش ہے جس نے شبلی کو ان کے طبقے سے نکال کر اس جماعت کی صف اول میں بیٹھا دیا ہے جہاں کے بیٹھنے والے خوش مذاقی، احساس جمالیات اور حسن سے وہ جہاں بھی ہوں اور جس عالم میں بھی ہوں ربط خاص رکھتے ہیں۔" (ایضاً ص:۱۳-۱۴)

پھر خاں صاحب علامہ شبلی کی جذباتیت اور رومانیت کو ان کی کمزوری بھی بتاتے ہیں اور یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ کبھی کبھی خوش بیانی میں وہ منطق کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ شعرالعجم اسی کمزوری کا شکار ہوئی۔ وہ یہ بھی مثال میں پیش کرتے ہیں کہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ بنوامیہ نے آزادی کا گلا گھونٹ دیا، مگر جرجی زیدان کی تنقیدوں کا جب جواب دیتے ہیں تو بنوامیہ کی حمایت کرتے ہیں۔ (ایضاً ص:۱۴)

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ دعویٰ بہت کرتے ہیں۔ اس کی مثالیں بھی رشید حسن خاں نے دی ہیں۔ اسی بنا پر وہ علامہ شبلی کو محقق سے زیادہ انشا پرداز قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تحقیق خاراشگافی اور کافر طبیعتی کی طلب گار ہے اور زود یقینی اور رنگینی کی دشمن جو علامہ شبلی کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی۔ (ص:۱۵)

اس لئے ان کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے مذکورہ باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

۱۹۸۰ء میں پٹنہ کے ایک سمینار منعقدہ بہار اردو اکیڈمی میں انھوں نے حافظ محمود خاں شیرانی پر مقالہ پیش کیا۔ عنوان تھا "شیرانی کی تاریخی اہمیت۔" اس میں انھوں نے شیرانی کو تحقیق کا معلم اول قرار دیا ہے۔ (ص:۵۳۲)

پھر ان سے پہلے کے عہد سرسید کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سرسید تحریک کا اثر تیس برس رہا۔ اس دور میں سرسید اور ڈپٹی نذیر احمد کی غیر جذباتی نثر کے مقابلہ علامہ شبلی و آزاد کی نثر کو زیادہ مقبولیت ملی۔ انداز فکر میں بھی اور پیرایہ بیان میں بھی۔ وہ لکھتے ہیں:

"شعریت اور جذباتیت کے مارے ذہنوں کو سادگی اور متانت غیر مانوس معلوم ہوتی تھی۔ حالی کی سادہ و صاف نثر ابالی کھچڑی کی طرح بے مزہ لگتی تھی۔ شہرہ تھا

شبلی و آزاد کی نثر کا، جس میں ذہنوں کو متاثر کرنے کی ایسی صلاحیت تھی اور ہے کہ آدمی کچھ دیر کے لئے ساری منطق بھول جاتا ہے..........شبلی کا مشتعل اور ذلیبانہ لہجہ اور پر زور جذباتی انداز استدلال ذہنوں کو زیادہ متاثر کرتا ہے۔''

(ایضاً،ص:۵۳۴)

رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ حالی، شبلی، آزاد کا دور جذباتیت کا دور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں انشاپردازوں کو محققین کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت ملی۔ شیرانی کی تنقید شعرالعجم کے خلاف جو آوازیں بلند ہوئی اس کو وہ اس دور کی فضا کا ردعمل قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اس مضمون میں یہ بات پھر دہرائی ہے کہ شبلی حالی اور آزاد میں کسی میں وہ مزاج نہیں پایا جاتا جس کو تحقیق کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''حالی کی سلامت روی، وضع داری اور عفو و درگذر کی پاکیزہ خصلت تحقیق کی کافر طبیعتی اور بے رحمی کی حریف نہیں ہوسکتی۔ شبلی کی بے کراں اور بے اماں جذباتی طبیعت، ہیرو پرستی اور ان کا خطیبانہ اور مجاہدانہ انداز بیان، منطقی استدلال تحقیق پسندی سے میل نہیں کھاتا، شبلی عالم تھے۔ بہت ذہین، بڑے سخن فہم اور بہت بڑے انشاء پرداز تھے۔ ان کی بے مثال خوبیوں کا انکار مقصود نہیں لیکن وہ بھی حالی کی طرف محقق نہیں تھے۔ ان کے مزاج کو تحقیق کے غیر جذباتی عمل سے مناسبت نہیں تھی۔ جذباتیت منطق کی دشمن ہے اور انشاپردازی حقیقت بیانی کی حریف ہے۔'' (ایضاً،ص:۵۳۵)

یہ تجزیہ اور یہ پس منظر دراصل حافظ محمد شیرانی کی تحقیقات کی اہمیت واضح کرنے کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ اس تجزیہ میں کئی باتوں میں خاں صاحب سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ خاں صاحب جب حافظ محمود شیرانی کے مزاج کی تحقیق اور ان کے اسلوب کا ذکر کرتے ہیں یا پھر ان کی تحقیقات کی داد دیتے ہیں تو انھیں یاد آجاتا ہے کہ شیرانی صاحب نے بھی اپنی تحقیقات میں کہیں کہیں انشاپردازی کی ہے۔ وہ دیانت دار تجزیہ نگار کی طرح اس کمی کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ان کی دیانت دارانہ عظمت ہے، مگر انصاف نہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شیرانی اپنی تحقیق کے

اصولوں کا ذکر نہیں کرتے، اس کے باوجود ان کی تحقیقات پر حرف نہیں آتا۔ یہاں یہ بات کہنے کو جی چاہتا ہے کہ علامہ شبلی کی محققانہ حیثیت سے غالباً رشید حسن خاں پوری طرح واقف نہیں تھے۔ مثلاً انھوں نے المامون میں، الفاروق میں، الغزالی میں سوانح مولانا روم میں جس محققانہ انداز کو اختیار کیا ہے اور جو تحقیقات پیش کی ہیں، خاص طور پر تحقیق منسوبات میں وہ اپنے عہد کی ممتاز محقق ہیں۔ پھر خاں صاحب ذہن و مزاج کی بات اٹھاتے ہیں۔ علامہ شبلی نے روایت و درایت، اصول استنباط نتائج اور حوالہ وغیرہ کا جس قدر اہتمام کیا ہے اور ان تحقیقی اصولوں کی پاسداری کی ہے، کم از کم ان کے عہد میں تو اس کی مثالیں نہیں ملتیں۔ دراصل خاں صاحب کے پیش نظر محض شعرالعجم کے وہ مباحث تھے جو شیرانی صاحب نے تنقید شعرالعجم میں پیش کیے تھے۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو علامہ شبلی کے یہاں تحقیق کے ابتدائی اور بنیادی عناصر موجود ہیں۔ ہمارے نقادوں کی نظر شعرالعجم اور موازنہ پر جا کر ٹھہر جاتی ہے اور المامون، الفاروق اور سوانح مولانا روم کی تحقیقات بلکہ جزبہ کتب خانہ اسکندریہ اور اورنگ زیب عالم گیر کو مذہبی اور تاریخی تحقیقات کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کا یہی صرف نظر انھیں حقیقت سے آشنا ہونے میں سدراہ رہا۔

رشید حسن خاں نے تنقید شعرالعجم پر روشنی ڈالی ہے، لیکن اس کے طرف دار ضرور نظر آتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''تنقید شعرالعجم کے عنوان سے اکتوبر ۱۹۲۲ء سے جنوری ۱۹۲۷ء تک جو سلسلہ مضامین شائع ہوا، دراصل اس نے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور علمی دنیا میں شدید ردعمل کا آغاز ہوا۔ ردعمل کی شدت اس پر گواہ تھی کہ عقیدت مندی اور شخصیت پرستی کے جذبے کو ٹھیس لگی ہے۔ روایت درست ذہن نے جس کی اس زمانے میں حکومت تھی یہ محسوس کیا کہ یہ منفی انداز نظر ہے اور حد ادب کی خلاف ورزی ہے۔ جذباتی روایت پرستی نے یہ بات ذہن نشیں نہیں ہونے دی کہ یہ صداقت کی تلاش اور کھرے کھوٹے کی پرکھ ہے۔'' (ص:۵۳۸)

بلاشبہ صداقت کی تلاش اور کھرے کھوٹے کی پرکھ پر قدغن نہیں لگائی جاسکتی، مگر کسی تنقید سے کوئی شخصیت زد میں آئے تو گویا اس پر نقد نہیں کہا جاسکتا۔ یا جو نقد کیا گیا ہے وہ چاہے صحیح ہی

کیوں نہ ہو، شخصیت پرستی کے ضمن میں آجائے گا، جس کی خاں صاحب کے یہاں اجازت نہیں گویا کسی شخص پر اگر کسی نے قلم اٹھایا تو بہرحال خاموش رہنا ہوگا۔ تحقیق وتنقید کے میدان میں یہ اصول ہی کسی طور جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ تنقید شعر العجم کے خلاف بلاشبہ شدید ردعمل ہوا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ شیرانی صاحب نے ایک دو برس نہیں پورے پانچ برس شعر العجم اور شبلی کو تختہ مشق بنائے رکھا۔ پھر اسے تنقید کا نام کیوں دیا گیا۔ اسے تصحیحات شعر العجم کا نام بھی دیا جاسکتا تھا۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ تنقید شعر العجم سے پہلے کئی تنقیدیں شائع ہو چکی تھیں، مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی اس پر تنقید لکھی تھی۔ البتہ ان کا لہجہ انتہائی متانت آمیز ہے اور استاذ کے ساتھ یہی اسلوب ہونا بھی چاہئے، مگر حافظ اسلم جیراج پوری نے حافظ محمود شیرانی سے دس سال پہلے شعر العجم پر سخت تنقیدی مضمون لکھا بلکہ علامہ شبلی کی زندگی میں لکھا۔ وہ عربی کے ساتھ فارسی شعروادب اور تحقیق وتنقید کے مرد میداں تھے۔ ان کی تحقیقات سے اہل علم واقف ہیں۔ انھیں تحقیق کا معلم اول کا درجہ کیوں نہ دیا جائے اور ان کی تنقید شعر العجم کو اتنی اہمیت کیوں نہیں دی گئی ایسا سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ رشید حسن خاں جیسے دیدہ ور محقق مولانا محمد اسلم جیراج پوری اور ان تنقیدات سے ناواقف رہے ہوں گے۔ دراصل ردعمل کی اصل وجہ شیرانی صاحب کی پشت پناہی بابائے اردو مولوی عبدالحق کی وجہ سے تھی، جنھوں نے علامہ شبلی کے ہر کام میں کیڑا نکالنا جو اگرچہ ان کے شان متانت اور مرتبہ کے خلاف تھا تاہم اسے انھوں نے اسے اپنا وطیرہ بنالیا تھا۔

آخر میں انھوں نے شیرانی صاحب کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' پر تبصرہ کیا ہے اور ان میں تقریباً انھیں غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جو ان سے پہلے کے محققین سے سرزد ہوئی تھی۔ اس میں خاص طور پر انھوں نے طے شدہ نظریہ کی بات کہی ہے اور درحقیقت تحقیق کوئی طے شدہ بات نہیں ہوتی۔ رشید حسن خاں نے تو یہ بات نہیں لکھی، مگر حقیقت یہی ہے کہ تنقید شعر العجم میں اسی کمزوری کی وجہ سے شدید ردعمل ہوا تھا۔

آخر میں خاں صاحب نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ

''قابل اعتراض ناقابل قبول بات جو بھی کہے وہ مولانا شبلی ہوں یا حافظ محمود شیرانی اس کو واضح طور پر رد کرنا اور افادیت کو برقرار نہیں رکھ پائے گا۔''

(ایضاً،ص:۵۴۱)

۱۹۸۲ء میں رشید حسن خان نے موازنہ انیس و دبیر کو مرتب کیا جسے مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا۔ یہ علامہ شبلی کے حوالہ سے ان کا دوسرا ادبی کام ہے۔ رشید حسن خاں صاحب ہمارے عہد کے سب سے بڑے محقق و مدون تھے۔ انھوں نے خاص طور پر متنی تحقیق میں جو کاوشیں کی ہیں امید نہیں کہ برسوں کوئی ان کا ہم پلہ پیدا ہوگا۔ لیکن موازنہ انیس و دبیر میں انھوں نے اپنا حق ادا نہیں کیا۔ وہ موازنہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''موازنہ انیس و دبیر پہلی بار ۱۹۰۷ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا تھا، نسخہ جامعہ کی بنیاد اسی ایڈیشن پر رکھی گئی ہے، اصل نسخے میں اشعار کا متن متعدد جگہ مشکوک معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی تصرف نہیں کیا گیا ہے۔

اشاعت اول کے سرورق پر کتاب اور مؤلف کا نام اور کتاب سے متعلق جو عبارت چھپی ہوئی ہے اس نسخے کے اندرونی سرورق پر اس کو بلفظہ نقل کردیا گیا ہے۔'' (تعارف موازنہ انیس و دبیر، ص:۸)

متنی تحقیق سے اس قدر بے اعتنائی تو شاید ہی انھوں نے اپنی کسی اور مدونہ کتاب میں ہوگی۔ بہر حال ان کی بدولت مکتبہ جامعہ کا ایڈیشن شائع ہوا اور اب تک اس کے تین ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں، تاہم انھوں نے موازنہ پر اظہار خیال ضرور کیا ہے۔ چند صفحے کے تعارف میں موازنہ اور اس کے مصنف کا ذکر بڑے مؤثر انداز سے کیا ہے۔ علامہ شبلی کی عظمت و جامعیت اور ادب و انشا کے بارے میں جن خیالات کا انتخاب ''مضامین شبلی'' کے تعارف میں کیا گیا تھا، اس میں بھی اس کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ البتہ اس ضمن میں علامہ شبلی کی بعض انفرادیت، جس کا ذکر انتخاب میں نہ آسکا تھا اس میں بیان کردیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''شبلی کے مزاج میں احساس تناسب بلا کا تھا اور ان کا اسلوب تحریر اس کا آئینہ ہے۔ علمیت، وقار، بلند آہنگی اور جوش بیان کے اجزا، زبان کی صفائی، سلامت اور شستگی میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ خالص علمی انداز بیان کے باوجود ان کی زبان علمیت کے بوجھ سے دہری نہیں ہوتی۔ ان کی تنقید میں بھی اسی شائستگی کی

جلوہ گری نظر آتی ہے۔'' (تعارف، ص:۵)

علامہ شبلی نے موازنہ میں اپنے موقف کی تائید میں کثرت سے اشعار نقل کیے ہیں۔یہ انتخاب بھی ذوقی معاملہ ہے۔علامہ شبلی کے بلند ادبی ذوق کا کون معترف نہ ہوگا۔وہ لکھتے ہیں:

''اچھے اشعار کے انتخاب اور ان کے محاسن کی مختصر لیکن جامع وضاحت میں بہت کم لوگ ان کے حریف قرار دیے جاسکتے ہیں، حیرت انگیز جامعیت کے ساتھ ان کی نگاہ انتخاب ایسے اشعار اور ایسے اجزا کو منتخب کر لیتی ہے جو کسی شاعر کا حقیقی سرمایہ کمال ہوتے ہیں اور ان کی خصوصیات کو اس خوش سلیقگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس شاعر کے ساتھ ساتھ خود شاعری سے اپنے آپ کو قریب تر محسوس کرتا ہے۔'' (ایضاً ص:۶)

خاں صاحب نے شبلی کے نہ صرف ذوق انتخاب کی داد دی ہے بلکہ ہماری ادبی زندگی پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے، ان کی بھی نشاندہی کی ہے۔یہی نہیں ان کے نزدیک میر انیس کی مقبولیت کا راز بھی اسی کتاب سے وابستہ ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''یہ واقعہ ہے کہ شبلی کے حسن انتخاب اور ان کے بے مثال انداز تشریح نے بے شمار لوگوں کے ذوق سخن اور ذوق انتخاب کی تربیت کی ہے، شعرالعجم اور موازنہ انیس و دبیر کو جن لوگوں نے دل لگا کر اور نظر جما کر پڑھا ہے وہ اس کی گواہی دیں گے۔ موازنہ میں انیس کے محاسن شاعری کے ذیل میں انھوں نے جو طویل اور مختصر مثالیں درج کی ہیں بعد کے اکثر لکھنے والے ان پر بہت کم اضافہ کر سکے ہیں۔اور بہتوں نے تو انہی کی تکرار کی ہے۔اب تک انصاف کے ساتھ اس کا اعتراف نہیں کیا گیا کہ خالص شاعرانہ حیثیت سے انیس کے کلام و کمال کی جو شہرت ہے اس میں شبلی کی تصنیف موازنہ انیس و دبیر کا کتنا حصہ ہے۔میر انیس کے کمال شاعری کے قائل سب ہیں، لیکن بہت کم لوگوں نے مراثی انیس کی جلدیں پڑھی ہوں گی، اگر یہ کہا جائے کہ اس قبول عام میں شبلی کی اس تصنیف کا بہت بڑا حصہ ہے تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا۔'' (ایضاً ص:۶)

اس اعتراف کمال کے بعد رشید حسن خاں نے علامہ شبلی کی زندگی کا مرقع پیش کیا ہے۔ انتہائی اختصار کے ساتھ نام، بچپن کا نام اور تاریخ پیدائش مئی ۱۸۵۷ء۔ وفات ۱۹۱۴ء، تحصیل علم، علی گڑھ کی ملازمت، سرسید سے استفادہ، جدید تحقیقات سے آگاہی وغیرہ حالات وواقعات اور بعض افکار مثلاً وہ جدید کی اہمیت کے قائل تھے، مگر سرسید کی مذہبی اور سیاسی فکر سے اختلاف رکھتے تھے۔ اور آخری بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ ان کی قدیم وجدید کی آویزش سے قدیم وجدید دونوں طبقے خوش نہیں رہے اور ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ اسی آویزش کی کہانی ہے۔

علامہ شبلی کی زندگی کے اس حصہ کو بیان کرنے میں رشید حسن خاں نے بڑے اختصار سے کام لیا ہے۔ سبب جو بھی رہا ہو مگر یہاں وہ اپنے بلند معیار تحقیق سے فروتر ہو کر گذر گئے ہیں۔ یہاں تک کہ علامہ شبلی کی تاریخ پیدائش جو ''حیات شبلی'' میں لکھی ہے اسی کو نقل کر دیا ہے۔ حالانکہ اس پر اس سے پہلے بحث وتحقیق ہو کر یہ طے ہو چکا ہے کہ علامہ شبلی کی تاریخ پیدائش مئی ۱۸۵۷ء نہیں بلکہ ۳؍جون ۱۸۵۷ء ہے۔ اور اب یہ تحقیق بھی پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی تحقیق سے کالعدم ہو کر ۴؍جون ۱۸۵۷ء ثابت ہو چکی ہے۔

انتخاب مضامین شبلی میں وہ شبلی کی انشا پردازی کی داد دے چکے ہیں، مگر اس میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر ان کے ہم عصروں سے موازنہ بھی کرتے ہیں اور ان پر علامہ شبلی کی برتری ثابت کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''انشاء پردازی کی حیثیت سے شبلی کا مرتبہ اپنے معاصرین میں نہایت ممتاز ہے، ان کے یہاں نہ تو وہ سادگی ہے جس پر ''ابالی کھچڑی'' کی پھبتی کسی جا سکی اور نہ وہ رنگینی ہے جو تاریخ کو افسانہ بنا دیا کرتی ہے۔ ان کی عبارت میں ان کی شخصیت کی طرح پرشکوہ، بلند آہنگی اور پروقار دل کشی ہے۔ یہ زبان علمی زبان ہے، لیکن شگفتگی آمیز ہے۔'' (ایضاً ص: ۷)

رشید حسن خاں موازنہ کے بڑے مداح ہیں۔ خاص طور پر اس کے تنقیدی مباحث کے۔ اسے وہ ایک منفرد کتاب بتاتے ہیں اور اس کی کئی تنقیدی بحثوں کو تنقید کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ علامہ شبلی انتہائی صفائی کے ساتھ یہ اقرار کرتے ہیں کہ میر انیس کے مقابلہ میں مرزا

دبیر کا نام لینا گویا بدمذاقی ہے۔ پھر وہ لکھتے ہیں:

''اس کتاب کا بڑا حصہ موازنے کے بجائے میر انیس کے کمال شاعری کا مرقع ہے۔جس زمانے میں یہ کتاب شائع ہوئی تھی اس زمانے میں اس کی مخالفت کا خاصا زور وشور رہا تھا اور الزام یہی تھا کہ شبلی نے انصاف سے کام نہیں لیا ہے، اس کی رد میں کئی کتابیں لکھی گئیں، آج وہ کتابیں خاص خاص کتاب خانوں کے سوا اور کہیں نہیں دکھائی دیتیں۔زمانہ سب سے بڑا منصف ہے۔'' (ایضاً ص:۷-۸)

مذکورہ اقتباس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف علامہ شبلی کے ہم نوا ہیں بلکہ ان کے پرستار بھی ہیں۔مخالفت میں لکھی جانے والی کتابوں کا ذکر بھی وہ بڑے سرسری انداز میں کرتے ہیں۔یہاں تک کہ وہ اس سلسلہ میں علامہ شبلی پر عائد اعتراضات سے بھی بحث کرتے ہیں اور پھر مدلل مداحی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ صحیح نہیں ہے کہ اس کتاب میں دبیر کا تذکرہ انیس کے مقابلے میں کم، بہت کم ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ دبیر کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہو، یا دونوں کی شاعری کا موازنہ نہ کیا گیا ہو یا دبیر کے کمال کا مطلق اعتراف نہ کیا گیا ہو، شبلی نے کئی جگہ دبیر کی علمیت، قوت تخئیل اور مضمون آفرینی کا ذکر کیا ہے۔تشبیہات واستعارات کی جدت کا بھی تذکرہ کیا ہے، مثالیں بھی دی ہیں۔'' (ایضاً ص:۸)

''ظاہر یہ ذرا سخت رویہ معلوم ہوتا ہے لیکن اگر دبیر کے مراثی کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تب شبلی کی اس رائے کی صداقت کا صحیح اندازہ ہوگا۔ عام طور سے اظہار ہمدردی بر بنائے روایات کیا جاتا ہے۔محض اس مفروضے کی بنا پر کہ شبلی نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے اور ایسے حضرات میں اکثر نے کلام دبیر کا مطالعہ ذرا کم ہی کیا ہوتا ہے، دبیر کے مرثیے پڑھنے کے بعد شبلی کی سخن فہمی وسخن سنجی پر ایمان لانا پڑے گا۔'' (ایضاً ص:۸)

عظمت شبلی کے یہ اعترافات اگر ایک عام نقاد کے قلم سے ہوتے تو شاید اس قدر دلچسپی نہ پیدا کرتے، چونکہ یہ اپنے عہد کے سب سے بڑے محقق اور صاحب نظر نقاد کے قلم سے ہیں، اس

لئے قابل ذکر ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ واقعی موازنہ انیس و دبیر ہمارے کلاسیکی ادب کا بہترین سرمایہ ہے۔

---

(۱۳۱)

سید سخی احمد ہاشمی

[۱۹۲۵-۱۹۹۵ء]

سندھ یونیورسٹی شعبہ اردو کے سابق استاذ پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی [۱۹۲۵-۱۹۹۵ء] ان اہل علم اور ارباب کمال میں تھے جنہیں علامہ شبلی نعمانی کی ذات سے بڑی عقیدت تھی اور جنہوں نے مطالعہ شبلی میں نمایاں طور پر حصہ لیا، لیکن اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے اس کا کہیں ذکر نہیں کیا۔

پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی سندیلہ، اتر پردیش کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں وہیں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنو میں خاتون منزل میں رہ کر حاصل کی۔ میٹرک پاس کر کے اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہو گئے۔ تقسیم ہند کے بعد یہ محکمہ کراچی منتقل ہوا تو وہ بھی کراچی چلے گئے۔ وہاں انہوں نے تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کیا۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء میں بی اے، ۱۹۵۴ء میں ایم. اے اردو اور ۱۹۵۶ء میں تاریخ اسلام میں ایم اے کیا۔ بعد ازاں سردار بہادر کالج حیدر آباد سندھ میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں [۱۹۱۲-۲۰۰۵ء] کی کوشش سے لکچرر مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں بعد اسی عہدہ پر سندھ یونیورسٹی میں آ گئے۔ تعلیم اور تدریس سب میں ان کے مشفق استاذ اور مشہور صوفی و اہل قلم پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں کی رہنمائی انہیں میسر رہی۔

پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں نے ایک شب علامہ سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] کو خواب میں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حیات شبلی کا دوسرا حصہ تم لکھ دو (شبلی کا ذہنی ارتقاء، ص:۱۱) چنانچہ انہوں نے پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی کو علامہ شبلی کی حیات و خدمات پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کے لئے آمادہ کیا اور خود ہی ''شبلی کا ذہنی ارتقاء'' موضوع منتخب کیا۔ ہاشمی صاحب نے انتہائی محنت سے یہ مقالہ لکھ کر سندھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی نے اپنے مقالہ کی تکمیل کے لئے بڑے جتن کئے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں اعظم گڑھ، لکھنؤ، حیدرآباد اور علی گڑھ کے سفر کئے۔ مولوی ابوالبقا ندوی کے ساتھ علامہ شبلی کے وطن بندول بھی گئے۔ تلامذہ شبلی اور متعدد اہل علم و ارباب کمال سے ملاقاتیں کیں۔ خاص طور پر ان شبلی شناسوں سے خط و کتابت کی جو علامہ شبلی پر علمی و تحقیقی کام کر چکے تھے۔ خانوادہ شبلی اور ان کے بعض اعزہ سے بھی خط و کتابت کی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جن سے ملاقات یا نصف ملاقات کی ان کے نام انہوں نے لکھے ہیں جو یہ ہیں:

مولانا عبدالماجد دریابادی، مولوی مسعود علی ندوی، مولانا عبدالباری ندوی فلسفی، مولوی جواد علی خاں ندوی، مولانا عبدالواحد کان پوری، مولوی حفاظت علی ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولوی عبدالسلام قدوائی ندوی، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، مولوی نصیر الدین ہاشمی، مولانا سعید انصاری، وقار خلیل، محمد اکبر الدین صدیقی، مرزا احسان احمد بیگ، مولوی عبدالحکیم اعظمی بندولی، مولوی ضیاء الدین اصلاحی، مولوی مشتاق حسین، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، عبداللطیف اعظمی، پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی، ڈاکٹر ابن فرید، پروفیسر کبیر احمد جائسی وغیرہ۔
(شبلی کا ذہنی ارتقاء، ص:۱۹)

اسی دلچسپی اور محنت و لگن کی وجہ سے وہ انتہائی اہم مقالہ لکھنے میں کامیاب ہوئے۔ علامہ شبلی کی شخصیت اور کارناموں پر جو چند اہم کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی کا مقالہ "شبلی کا ذہنی ارتقاء" بھی شامل ہے اور آج بھی وہ مطالعہ شبلیات میں بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے مطالعہ سے بیک نظر علامہ شبلی کی شخصیت کا ایک مکمل مرقع سامنے آجاتا ہے۔ اس کی اشاعت کے لئے وہ بے حد فکرمند رہے، مگر افسوس کہ موت نے انہیں مہلت نہیں دی۔ وفات کے بعد ان کے استاذ پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں کی کوششوں سے یہ مقالہ ۱۹۹۶ء میں مجلس یادگار ہاشمی کراچی سے شائع ہوا۔ بلاشبہ یہ مقالہ شبلیات میں ایک گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اسی مقالہ پر بس نہیں کیا بلکہ وہ علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر و فن پر مضامین و مقالات لکھتے رہے۔ جن کے عناوین یہ ہیں:

۱۔ حالات شبلی۔ ادبی آئینے

۲۔شبلی کے قصائد کا تاریخی جائزہ، مجلّہ صریر خامہ سندھ، قصیدہ نمبر، شمارہ ۶، ۱۹۶۷ء

۳۔شبلی کی قومی شاعری، مجلّہ صریر خامہ سندھ، قومی شاعری نمبر، شمارہ ۴، ۱۹۶۶ء

۴۔مولانا شبلی اور ترکی، مجلّہ صریر خامہ سندھ، تنقیدی ادب نمبر، شمارہ ۵، ۱۹۶۷ء

۵۔شبلی ایک مخالف انگریز۔ادبی آئینے، مکتبہ شاہد کراچی، ۱۹۷۴ء

۶۔مولانا شبلی کا مجوزہ دار العلوم۔ادبی آئینے، مکتبہ شاہد کراچی، ۱۹۷۴ء

ان عناوین سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کس قدر اہم موضوعات کا انتخاب کیا۔بلاشبہ پروفیسر سید یحیٰ احمد ہاشمی صاحب نے یہ مقالات بڑی محنت و تحقیق سے لکھے ہیں اور موضوعات کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

---

(۱۳۲)

مشکور حسین یادؔ

[۱۹۲۵-۲۰۱۷ء]

مشکور حسین یادؔ نامور ادیب و انشا پرداز، مصنف اور ماہر غالبیات تھے۔ان کے قلم سے جو کتابیں نکلیں۔ان میں غالب پر چار اور انیس پر دو اور دبیر پر ایک کتاب شامل ہے۔ان کی یہ کتابیں محنت و تحقیق سے لکھی گئی ہیں۔''مطالعہ دبیر'' مشکور حسین یاد کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔اس کے دیباچہ میں انہوں نے موازنہ انیس و دبیر اور علامہ شبلی کے ادبی طرز عمل پر اظہار خیال کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''ہم ''موازنہ انیس و دبیر'' کو کچھ بھی کہتے رہیں، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس میں مولانا شبلی نے مرزا دبیر کے کلام کے بارے میں جو رائے بھی دی ہے اس کی صداقت اپنی جگہ قائم ہے۔اور اس رائے کی صداقت کی وجہ یہ ہے کہ مرزا دبیر کے کلام کی جانب سے ہزار عدم توجہی یا کوتاہ توجہی کے باوصف مولانا شبلی کے قلم سے مرزا صاحب کے آرٹ اور فن کے بارے میں حق بات کا

اظہار بھی ہوتا رہا ہے۔اور اسی حق گوئی کو وہ جادو کہا جاتا ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔" (مطالعہ دبیر، ص:۸)

وہ مزید لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی نے مرزا دبیر کو جہاں تک پڑھا اپنی رائے دینے میں کوئی تکلف سے کام نہیں لیا۔اس لئے موازنہ کو سامنے رکھتے ہوئے آپ شبلی کو کتنا بھی برا بھلا کہیں انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ اب تک مرزا دبیر کے کلام سے متعلق جتنی باتیں ہوئی ہیں ان کا آغاز شبلی کی تنقید سے ہوا ہے۔اور تا حال ہوتا آرہا ہے۔خود میں نے بھی اپنی بات کا آغاز مولانا شبلی ہی سے کیا ہے۔" (ایضاً، ص:۹)

---

(۱۳۳)

مولانا اسیر ادروی

[۱۹۲۶-۲۰۲۱ء]

مولانا نظام الدین اسیر ادروی معروف اہل قلم، نامور ادیب وانشاپرداز اور مصنف ہیں۔ دو درجن سے زاید علمی، تاریخی، سوانحی اور مذہبی کتابیں ان کے قلم سے نکل کر مقبول ہو چکی ہیں۔ وہ عرصہ تک جامعہ اسلامیہ بنارس میں استاذ اور سہ ماہی مجلہ ترجمان الاسلام بنارس کے مدیر رہے۔ وہ بھی علامہ شبلی کے بڑے شیدائی تھے۔انھوں نے ڈاکٹر انیس ادیب [۱۹۳۴-۲۰۱۷ء] کے مجموعہ مضامین "نقوش صد رنگ" پر ایک مختصر سی تقریظ لکھی ہے اور ڈاکٹر انیس ادیب صاحب کے ایک مضمون مولانا شبلی نعمانی کی فارسی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ

"ہم آج ان کے مقالہ کے اس حصہ کو پیش کر رہے ہیں جو شبلی نعمانی کی فارسی شاعری سے متعلق ہے، انھوں نے بالکل صحیح کہا ہے کہ شبلی نعمانی دراصل اردو کے نہیں فارسی کے شاعر تھے۔ان کے جوہر فارسی میں کھلے، راقم الحروف کو موصوف

کی اس صداقت سے حرف بہ حرف اتفاق ہے۔ان کی فارسی غزلوں کو پڑھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حافظ شیرازی بادۂ شیراز کا چھلکتا ہوا جام ہاتھوں میں لئے کھڑے ہیں، وہی سر مستی، وہی شوخی، وہی انداز لب ولہجہ جو زندگی کو کیف وسرور سے بھر دے۔'' (نقوش صدرنگ، ڈاکٹر انیس ادیب، ص:۸،مئو،۲۰۱۱ء)

---

(۱۳۴)

ڈاکٹر محمد حنیف فوقؔ

[۱۹۲۶-۲۰۰۹ء]

ڈاکٹر محمد حنیف فوق کی شخصیت میں بڑی جامعیت تھی۔ وہ ادیب تھے، شاعر تھے، محقق تھے، نقاد تھے، معلم تھے اور ماہر لسانیات بھی تھے۔ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی[۱۹۱۵-۱۹۹۸ء] کی کتاب ''گلہائے داغ'' کا مقدمہ ان کے قلم سے ہے۔وہ علامہ شبلی کی عظمت وجامعیت کے بڑے مداح ہیں۔ لکھتے ہیں:

''شبلی ہمارے ادب کی دیو قامت ہستیوں میں سے ہیں اور ان کا مطالعہ آسان نہیں۔ان کے تخیل میں جلال اور اسلوب میں جمال کے عناصر مل جل کر ایک عظیم وحدت کی تخلیق کرتے ہیں۔وہ مجتہد ہیں، لیکن ان کی پیروی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ پھر بھی انہوں نے اردو ادب پر جو اثرات چھوڑے ہیں انہیں کسی صورت سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اردو ادب میں تاریخی شعور، اردو تنقید کا ادبی مزاج ،اردو ادب کی عالمانہ سنجیدگی اور شگفتہ بیانی بہت کچھ شبلی کی مرہون منت ہے۔''

(گلہائے داغ، ص:۸)

---

(۱۳۵)

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

[۱۹۲۶-۲۰۱۳ء]

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی اردو کے مشہور صحافی، ادیب وشاعر، اور ماہر عروض تھے۔ وہ کشمیر ریڈیو سے ایک عرصہ تک چیف پروڈیوسر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ یہیں انہوں نے ''ریڈیو ٹیلی ویژن میں ترسیل وابلاغ کی زبان'' جیسی اہم کتاب لکھی۔ وہ ایک بڑے اہل قلم تھے۔ کشمیر ایک منظر نامہ، آہنگ اور عروض، بیاض غالب تحقیقی جائزہ، غالب کی شناخت، مقدمہ زبان اردو، بادبان اور دوسری نظمیں، بہترین ادب وغیرہ ان کی بڑی اہم کتابیں ہیں۔ سہ ماہی فکر وتحقیق دہلی اور غالب نامہ دہلی کی ادارت بھی کی۔

وہ شاعر بھی بہت اچھے تھے۔ ان کے چند اشعار زبان زد خاص وعام ہوئے۔ بہترین شاعری کے لئے انہیں غالب ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے پروفیسر ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی کے ادبی مقالات کے مجموعہ ''سخنہائے گفتنی'' پر پیش لفظ لکھا ہے۔ چونکہ اس مجموعہ میں کئی مضامین کا تعلق علامہ شبلی اور ان کے فکر وفن سے ہے، اس لئے پیش لفظ میں ان کا ذکر ناگزیر تھا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''شبلی نعمانی سے وہ (مصنف) ہم وطنی کا علاقہ رکھتے ہیں۔ اس لئے بھی شاید انہوں نے شبلی کو دوسروں سے زیادہ توجہ سے پڑھا۔ شبلی اور ان کے اسلوب کے عاشق کی کمی نہیں، اگرچہ بہتات بھی نہیں۔ شبلی کو ہندوستان کا پہلا یونانی کہا گیا۔ اس میں عقیدت اور انشائی رجحان کی آمیزش ہے۔ عقیدت پر انشا غالب ہے یا انشا پر عقیدت، اس کا فیصلہ کرنا کیا، اندازہ بھی مشکل ہے، لیکن چوں کہ اس وقت یہ سوال اہم نہیں ہے اس لئے ہم کتاب کے پہلے دو مضامین کی طرف آتے ہیں۔'' (سخنہائے گفتنی، ص:۷)

اس اقتباس سے دو باتیں بالکل واضح ہیں کہ علامہ شبلی کے بارہ جو کچھ کہا گیا ہے اسے

کمال احمد صدیقی صاحب تسلیم نہیں کرتے اور خود انہوں نے علامہ شبلی کو گہرائی سے پڑھا نہیں۔ سنی سنائی باتوں کو وہ سچ سمجھتے ہیں اور انہیں بیان کرنے میں کوئی جھجھک نہیں ہوتی۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''اردو میں تنقید حالی اور شبلی کی قدر بندی کرنے والے اہل بصیرت کے دو گروہ ہیں۔ یعنی انیسیوں اور دبیریوں کی طرح حالیے اور شبلیے اور وجہ شاید اس کی یہ ہے کہ شبلی اس سیڑھی کو توڑنا چاہتے تھے جس سے وہ ادب منزل کے بام عروج پر پہنچے تھے۔ سرسید پر سامنے کا حملہ کرنا شدید نقصان کا باعث ہوسکتا تھا، اس لئے انہوں نے حالی کی لکھی ہوئی سرسید کی بیاگرفی ''حیات جاوید'' کو مدلل مداحی قرار دیا۔ اس ایک فقرے کے تیر سے دو شکاروں کو نشانہ بنایا۔ حالی نہایت شریف اور منکسر المزاج اور سنجیدہ انسان تھے۔ انہوں نے جوابی حملہ نہیں کیا، لیکن جنہوں نے حالی کی تحریروں سے روشنی حاصل کی تھی، ان کو مدلل مداحی کا فقرہ کھٹکا اور شبلی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔'' (ایضاً ص:۸)

اول تو حالیے اور شبلیے کی اصطلاح انہی کمال احمد صدیقی کے ذہن کی اپج ہے، ان کے علاوہ کسی اور نے یہ اصطلاح نہیں بیان کی۔ کمال احمد صدیقی دراصل اپنے دل کی باتیں دوسروں کے حوالہ سے کہہ رہے ہیں۔ یہ خود ایک غیر یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہیں اور بات کچھ ہے اور کہہ رہے ہیں کچھ۔

سرسید کے بارہ میں علامہ شبلی کے نقطہ نظر سے تمام اہل علم واقف ہیں۔ وہ سرسید کی ہر بات کو تسلیم کرتے ہیں، مگر ان کے سیاسی نظریے سے اختلاف کرتے ہیں اور وہ بھی سرسید کی زندگی میں ان کا یہ نقطہ نظر تھا، بعد از مرگ نہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ حیات جاوید کو مدلل مداحی قرار دے کر وہ اس سیڑھی کو توڑنا چاہتے تھے، سرے سے غلط بات ہے اور شبلی نافہمی کا نتیجہ بھی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مولانا حالی کی دوسری سوانح عمریوں ''یادگار غالب'' وغیرہ کی داد کیوں دیتے۔؟

اگلے صفحات میں پروفیسر آل احمد سرور کے حوالہ سے گفتگو ہے اور اس میں کمال صاحب نے الطاف احمد اعظمی کی اس لئے تحسین کی ہے کہ وہ سرور صاحب سے اتفاق نہیں کرتے۔

ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی صاحب نے علامہ شبلی کی دو کتابوں شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر

پر تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ان کے ذکر میں کمال احمد صدیقی کو شکوہ ہے کہ علامہ شبلی نے حوالے نہیں دئے ہیں۔ اور موازنہ انیس و دبیر کی اس لئے تحسین فرماتے ہیں کہ موازنہ پر ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی نے تنقیدیں کی ہیں۔ (ایضاً ص:۱۲-۱۶)

راقم اس پوری بحث پر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جہاں علامہ شبلی پر تنقیدیں ہوتی ہیں وہاں وہ کمال احمد صدیقی تحسین وستائش اور معروضی اور غیر جاندانہ قرار دیتے ہیں۔ اور جہاں علامہ شبلی کے فکر ونظر کی تحسین ہوتی ہے اس سے انکار کرتے ہیں اور اسے جانب دارانہ بتاتے ہیں لیکن یہی معاملہ جب حیات جاوید پر آتا ہے تو انہیں اس سیڑھی کو توڑنا بتاتے ہیں جس پر چڑھ کر وہ ادب کی منزل میں آئے۔ یہ کس قدر صریح غیر دیانت دارانہ تنقید اور طرز عمل ہے اہل نظر اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ دراصل کمال احمد صدیقی سرسید اور حالی کے ہم نواؤں کو صحیح ٹھہرانا چاہتے ہیں حالانکہ جس طرح کمال احمد صدیقی خود علامہ شبلی کو سمجھنے سے قاصر رہے، اسی طرح ان کے ہم نوا بھی علامہ شبلی کے فضل وکمال سے چشم پوشی کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر آل احمد سرور نے ان سے سخت اختلاف کیا اور بڑی صائب رائے دی کہ علامہ شبلی کو مصور (حالی) پسند تھا اس کی بنائی ہوئی ایک تصویر (حیات جاوید) ناپسند تھی۔ اور کون ہے جو آج حیات جاوید کے غیر جانب دارانہ مطالعے کے بعد علامہ شبلی سے اختلاف کرے گا۔ اس کے متعدد مباحث صاف مدلل مداحی نظر آتے ہیں۔

تنقید وتحقیق سے کوئی انسانی تخلیق بالاتر نہیں، لیکن کتابوں کے تجزئے میں بہر حال عہد و ماحول کو پیش نظر رکھنا ایک ضروری عمل ہے۔ شعر العجم ہو یا موازنہ ایک صدی بعد ان کے بارہ میں رائے دینا، تنقید کرنا اور ان میں جانبداری کے پہلو تلاش کرنا بہت آسان ہے، لیکن جب مصادر ناپید تھے، تب ان کا لکھا جانا بلاشبہ علامہ شبلی کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں نہ صرف علامہ شبلی کی بلکہ اردو ادب کا شاہ کار ہیں۔ یہی سبب ہے کہ سو سال بعد بھی وہ اہل نظر کی آنکھوں کا سرمہ بنی ہوئی ہیں۔

(۱۳۶)

ڈاکٹر خالد حسن قادری

[۱۹۲۷-۲۰۱۲ء]

ڈاکٹر خالد حسن قادری مولوی حامد حسن قادری [۱۸۸۷-۱۹۶۴ء] کے صاحبزادے ہیں۔ مولوی حامد حسن قادری سے علامہ شبلی نعمانی کے مراسم اور سلسلہ خط وکتابت بھی تھا۔ ناچیز کی کتاب ''شبلی کے مکتوب الیہ'' میں ان کا ذکر آچکا ہے۔ مولوی حامد حسن قادری کو بقول ان کے صاحبزادے کے بیدل عظیم آبادی سے بہت دلچسپی تھی۔ انہوں نے بیدل کی غزلیات کا ایک انتخاب بھی کیا تھا اور بعض اشعار کی تشریح وتوضیح بھی کی تھی۔ ان کے صاحبزادے نے انہیں یکجا کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس کے دیباچہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے والد ہی کی طرح صاحبزادے بھی گرفتار شبلی ہیں۔ البتہ وہ کبھی کمال شبلی کے منکر اور کبھی معترف، گومگو کی کیفیت میں مبتلا رہے ہیں۔ دراصل وہ علامہ شبلی کے سحر کا ایک ہالہ ہے جس سے وہ نکل نہیں پارہے ہیں۔ بڑی ادبیت دکھائی ہے اور پورا دیباچہ علامہ شبلی اوران کی شاعری کے ذکر سے بھر دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ

> ''بیدل کی مشکل پسندی، عمیق فلسفیانہ نظر اوران کا نادر اسلوب شاعری ایسا تھا کہ علامہ شبلی نعمانی جیسا بالغ نظر ادیب اور فارسی شعروشاعری کا مستند نقاد بھی بیدل کے ساتھ انصاف نہ کرسکا۔ اور وجہ ہمیں صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ غزل کی حد تک دونوں کا مزاج بالکل مختلف تھا۔'' (بیدل عظیم آبادی، ص:۶)

اس کے بعد انہوں نے اپنے موقف کی تائید میں چند مثالیں دی ہیں اور پھر لکھا ہے کہ ''شبلی اور مقامات پر بھی بیدل کی بے نظیر معنی آفرینی دقت نظر، بلند پروازی، نازک خیالی اور بے بدل اسلوب کے ساتھ انصاف نہ کرسکے۔'' (ایضاً) اس ناانصافی کا سبب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بات یہ ہے کہ شبلی سوز عشق سے واقف نہ ہوں لیکن عاشقانہ قریحت وسرشت کے حامل تھے۔ اسی وجہ سے خود ان کی غزلوں میں سوزوگداز، محبت سے زیادہ پرجوش جذبہ اور کیف ومستی سے زیادہ سرمستی وسرخوشی پائی جاتی ہے۔'' (ایضاً)

ڈاکٹر خالد حسن قادری کی کج مج بیانی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ علامہ شبلی اور ان کی شاعری کو سمجھ ہی نہیں سکے ہیں۔ اور صاف صاف کچھ کہہ نہیں پا رہے ہیں کہ علامہ ان کے والد کے دوست ہیں۔

---

(۱۳۷)

پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی

[۱۹۲۸-۱۹۹۸ء]

پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی، پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ، سابق صدر شعبہ اردو و فارسی لکھنو یونیورسٹی بڑے ذی علم اور نامور اساتذہ میں تھے۔ مدۃ العمر اگرچہ درس و تدریس سے وابستہ رہے، تاہم تصنیف و تالیف کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ ان کی خاص طور سے اردو زبان و ادب پر بڑی نگاہ تھی۔ ان کے قلم سے متعدد کتابیں نکلیں۔ ان میں ناسخ پر ان کا تحقیقی مقالہ ''تجزیہ و تقدیر'' بہت مقبول ہوا اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ آل رضا کا فن غزل گوئی، باقیات آل رضا، دیوان صد غزل، کلیات حبیب، انتخابات نظم و نثر وغیرہ ان کی ادبی کاوشیں ہیں۔ غالباً شیعیت کا غلبہ تھا۔

نونہروی نے سید ظہور الاسلام کی کتاب ''موازنہ انیس و دبیر کا تنقیدی مطالعہ'' پر پیش لفظ لکھا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ موازنہ انیس و دبیر اور اس کے ذریعہ وجود میں آنے والے رثائی ادب پر ان کی پوری نگاہ تھی۔ ان کی درج ذیل تحریر بھی اس کی گواہی دیتی ہے:

''ہر چند کہ موازنہ انیس و دبیر شبلی کے مجموعی نظام فکر میں ایک ذیلی سیارہ کی حیثیت رکھتا ہے، پھر بھی مختلف اسباب کی بنا پر اس کی اہمیت تسلیم شدہ رہی ہے۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ اردو شعر و شاعری سے متعلق مولانا شبلی کا یہ تنہا مبسوط و مفصل کارنامہ ہے۔ ایک ایسا کارنامہ جس میں بوطیقائی کسوٹی پر اردو شاعری کے بہت سے نظریاتی مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے بلکہ اردو کے دو عظیم شاعروں کے متعلق انفرادی اور تقابلی مطالعہ کے ذریعہ علمی تنقید کا ایک راہ نظام بھی وضع کرنے کی

کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب ایک ایسے عہد میں نمودار ہوئی کہ جب اردو کے تنقیدی کیسہ میں ''مقدمہ شعروشاعری'' اور'' آب حیات'' کے علاوہ کوئی خاص اور قابل ذکر پونجی موجود نہ تھی اور اسی لئے اس تصنیف کو اردو کے ذخیرہ میں ایک قابل قدر اضافہ تصور کیا گیا۔'' (موازنہ انیس و دبیر کا تنقیدی مطالعہ، ص:۷)

---

(۱۳۸)

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

[۱۹۲۸- ۲۰۰۳ء]

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی سابق استاذ شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی ڈاکٹر سید محمد ہاشم استاذ شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ممتحن تھے۔ چنانچہ جب سید ہاشم صاحب نے پی ایچ ڈی کا مقالہ ''سید سلیمان ندوی حیات اور ادبی کارنامے'' ۱۹۹۵ء میں شائع کیا تو پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے اس پر پیش لفظ لکھا۔ اگر چہ یہ پیش لفظ مولانا سید سلیمان ندوی سے متعلق ہے، مگر انھوں نے اس کا آغاز اس طرح کیا ہے:

''دبستان سرسید نے دو نامور فرزندوں کو پیدا کیا۔ حالی اور شبلی۔ دونوں کی شناخت ایک شاعر کی حیثیت سے بھی ہے اور ناقد کی حیثیت سے بھی۔ حالی ایک ادبی نقاد تھے تو شبلی اس کے ساتھ ساتھ ادبی مورخ بھی تھے۔ حالی نے اردو تنقید کی خشت اول رکھی، اس کے باوجود ان کی تنقید کا سلسلہ مولوی عبدالحق پر آ کر رک جاتا ہے جب کہ شبلی کی تنقید کا سلسلہ آج بھی اسی طرح جاری ہے۔''

(سید سلیمان ندوی حیات اور ادبی کارنامے، ص:۷)

میر انیس کی زندگی اور شاعری پر ایک بڑی جامع اور مبسوط کتاب ''تحقیقی مطالعہ انیس'' ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے قلم سے نکلی ہے۔ اسے ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ نے شائع کیا ہے۔ اس کے دیباچہ میں علامہ شبلی اور موازنہ کی تحسین وہ اس طرح فرماتے ہیں:

''شبلی نے موازنہ لکھ کر حرف آخر کی مہر لگادی۔ اگر شبلی کے جذبہ انیس نوازی کو نظرانداز کردیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شخصی تنقید پر ہماری زبان میں اس انداز کی کتابیں بہت کم لکھی گئی ہیں۔شبلی نے موازنہ لکھا اور ملک میں قیامت برپا ہوگئی۔ ہر طرف سے بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ کچھ نے حب علیؑ میں اور کچھ نے بغض معاویہ میں انیس کے ساتھ،شبلی یا شبلی کے ساتھ انیس کو بھی مورد عتاب قرار دیا،مگر شبلی کے خلاف دبیر کی حمایت میں سب سے سنجیدہ کتاب ''المیزان'' تھی جس میں مصنف نے کافی اعتدال اور توازن کے ساتھ شبلی کا جواب دیا ہے۔ورنہ عام طور سے لوگوں نے شبلی کا جواب کیا دیا ہے منہ چڑایا ہے۔''

(تحقیقی مطالعہ انیس ص ۷)

اس کے بعد ظہیر احمد صدیقی نے اپنے عہد کے سلسلہ انیس شناسی کا ذکر کیا ہے۔اردو میں ''موازنہ انیس و دبیر'' جیسی شاید ہی اب کوئی کتاب لکھی جائے جو صدیوں تک اپنے اثرات قائم رکھے اور موافق و مخالف ہر شخص اس کی عظمت کا اعتراف کرے۔وہ لکھتے ہیں:

''انیس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ لکھا جائے گا۔ بڑے بڑے اہل فن اور اہل ذوق نے انیس کو ہر زاویے اور نقطہ نظر سے دیکھا ہے۔شبلی نے موازنہ لکھ کر حرف آخر کی مہر لگادی ہے۔اگر شبلی کے جذبہ انیس نوازی کو نظر انداز کردیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ شخصی تنقید پر ہماری زبان میں اس قسم کی کتابیں بہت کم لکھی گئی ہیں۔'' (ایضاً،ص:۷)

---

(۱۳۹)

ڈاکٹر انور سدید

[۱۹۲۸-۲۰۱۶ء]

ڈاکٹر انور سدید پاکستان کے نامور ادیب،شاعر اور نقاد تھے۔ان کی شہرت ان کی کتاب

"اردوادب کی تحریکیں" سے ہوئی۔اس کے علاوہ اقبال کے کلاسیکی نقوش،اردوافسانے میں دیہات کی پیش کش،پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ،مولانا صلاح الدین احمد،غالب کے خطوط،میرانیس کی اقلیم سخن،ڈاکٹر وزیر آغا وغیرہ کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔

انہوں نے اپنے نام کے ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوط ۱۹۸۵ء میں شائع کئے۔اس کے دیباچہ میں انہوں نے اردو کے نامور مکتوب نگاروں کے مکاتیب پر تبصرہ کیا۔عہد سرسید پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ

> "اس عہد میں شبلی نعمانی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے زندگی کی برف کو نہ صرف پگھلا دیا بلکہ اسے خون کی طرح تیز گردش کرنے کی تحریک بھی دی۔ڈاکٹر خورشیدالاسلام نے انہیں مسلمانوں میں پیدا ہونے والا پہلا یونانی شمار کر کے بالواسطہ طور پر ان کی جمال پسندی کا زاویہ ابھارا ہے۔قوم کا درد شبلی کے دل میں بھی موجود تھا،لیکن ان کے داخل میں اپنی راہ خود تراشنے اور موجود سے بغاوت کرنے کا جذبہ بھی موجزن تھا۔وہ حواس خمسہ کے غلام نہیں تھے،لیکن ان کے ہاں حواس کو سیراب کرنے کی آرزو اہمیت ضرور رکھتی ہے۔اور وہ خون تمنا کا قصاص بھی طلب کرتے تھے۔
>
> شبلی کے خطوط میں اصلاح کا جذبہ ایک اہم قدر کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن وہ آتش شوق میں بے محابا کودنے سے گریز نہیں کرتے اور اس عمل میں وہ عقل کو بالائے بام ہی چھوڑ آئے ہیں۔وہ اپنے خطوط میں ندوہ اور علی گڑھ کے اختلافی نقوش ابھارتے ہیں تو مصلح قوم دکھائی دیتے ہیں۔شعرالعجم پر بحث کرتے ہیں تو ایک فاضل نقاد منظر پر ابھر آتا ہے۔کتابوں کی دریافت ان پر مسرت کا نیا دروازہ کھول دیتی ہے۔اور اچھے لطیف شعر کے ساتھ وہ خود بھی ایک حیوان ظریف دکھائی دینے لگتے ہیں۔"

(وزیر آغا کے خطوط ص:۶۴)

(۱۴۰)

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی

[۱۹۲۸-۲۰۱۹ء]

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں عیدل پور میں پیدا ہوئے۔اپنی محنت اور لگن سے ڈاکٹریٹ کی سند لی اور الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر کے عہدہ تک پہنچے۔ان سے بے شمار طلبہ نے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔

رضوی صاحب ترقی پسند ادیب اور نقاد تھے۔ان کا شمار ترقی پسند تنقید کے معماروں میں کیا جاتا ہے۔ان کے قلم سے متعدد اہم کتابیں اردو مثنوی کا ارتقاء شمالی ہند میں، اصول تنقید، ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ، تنقید اور عصری آگہی، سماجی تنقید اور تنقیدی عمل، غزل کے نئے جہات، اور مرثیہ کی سماجیات وغیرہ

انہوں نے سب رنگ اور اندازے جیسے ادبی رسائل کی ادارت بھی کی۔

مرثیہ، اور مرثیہ نگاروں کی جب بات چلتی ہے تو انیس ودبیر کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔اسی طرح جب انیس ودبیر کی اور مرثیہ کی بات ہوتی ہے تو علامہ شبلی کی موازنہ انیس ودبیر کا ذکر آ ہی جاتا ہے۔اسی طرح ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی کی کتاب مرثیہ کی سماجیات میں علامہ کا ذکر آ گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''شبلی نے پہلی مرتبہ مرثیہ پر ایک کتاب موازنہ انیس ودبیر لکھ کر تقابلی تنقید کی بنیاد رکھی۔اور مرثیے کے فن کو ''بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں'' کے تصور سے آزاد کیا اور پھر مرثیے پر شبلی کی تنقید کی روشنی میں بحث چل پڑی اور ایسی چلی کہ آج تک اس کی گونج باقی ہے۔''

(مرثیے کی سماجیات، ص:۵)

---

(۱۴۱)

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

[پ:۱۹۲۹ء]

ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی آبرو، جانشین مفکر اسلام مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا سے زیادہ عظمت شبلی سے کون واقف ہوسکتا ہے۔ وہ اس ادارے کے سربراہ ہیں جس کے لئے علامہ شبلی نے اپنا تمام تر سرمایہ زندگی نچھاور کردیا تھا۔ وہ علامہ شبلی، ان کی عظمت، فہم وشعور، جدوجہد اور اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے فکرمندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”علامہ شبلی نعمانی برصغیر پاک وہند کی ایک غیر معمولی شخصیت تھے۔ ان کی اہم ترین خصوصیات میں ملت اسلامیہ کی موجودہ پس ماندگی، ملت کے شاندار ماضی کی یاد اور اس کی بحالی کے لئے کچھ نہ کچھ کرڈالنے کا جذبہ اور زمانہ کے قدیم وجدید کے درمیان ایک متوازن ربط پیدا کرنے کی خواہش موجزن تھی، جس کو انھوں نے اپنے مؤثر اور بلیغ شعر ونثر میں ظاہر کیا ہے۔

ان کی ساری تصانیف اور ساری منظومات اس کی آئینہ دار ہیں کہ وہ ایک طرف علم وہنر کے میدان میں یورپ کی ترقی اور طاقت وسیاست میں ان کی برتری کو اس کی پوری آن بان کی حالت میں دیکھ رہے تھے۔ اور دوسری طرف وہ مسلمانوں کے عروج کے عہد کی اپنی خوبی کے ساتھ دنیاوی سربلندی کی تاریخ سے کماحقہ واقف ہونے کے ساتھ ان کی ترقی کے عہد کے بعد ان کی موجودہ پستی اور تمدنی سطح پر ان کی بے بضاعتی اور علمی کم مائیگی اور سیاست وطاقت میں پسماندگی کو دیکھ رہے تھے، پھر اس پر مستزاد یورپین اہل علم کی ان علمی کاوشوں کو بھی دیکھ رہے تھے جو اسلام اور مسلمانوں کے شاندار ماضی کو بگاڑ کر پیش کرنے کو اپنا وطیرہ بنائے ہوئے تھے۔“ (مطالعہ تصنیفات علامہ شبلی نعمانی، مقدمہ، ص:۵)

علامہ شبلی تحریک ندوہ سے کیوں کر وابستہ ہوئے اور ان کے عزائم کیا تھے؟ مولانا مدظلہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''حالات کے صحیح احساس وشعور نے علامہ کو ایک طرف مسلمانوں کو چشم بصیرت وا کرنے کی طرف متوجہ کیا اور اس کے لئے انھوں نے اپنی ادبی وعلمی صلاحیتوں کو صرف کرنے پر آمادہ کیا اور یہی احساس وشعور تھا جس نے ان کو علی گڑھ سے نکل کر ندوہ کی تحریک کو اپنا نصب العین بنا لینے اور اس کے لئے اپنے وقت کو صرف کرنے پر لگا دیا، تاکہ مسلمانوں کے لئے جامع تعلیم کی ایک ایسی صورت بن سکے، جس سے مسلمانوں کے ماضی کے اعلی سرمایہ علمی کے ساتھ جدید علمی ترقی کی صلاحیت کے آدمی تیار ہوسکیں۔ علامہ شبلی نے مسلمانوں کے جامع تعلیمی منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لئے جس فکرمندی اور عملی کاوش سے کام لیا، اس نے اس میدان کار میں خاصا اثر پیدا کیا اور فائدہ پہنچایا اور اس راہ میں ان کے متعدد غیر معمولی صلاحیت کے شاگرد تیار ہوئے جنھوں نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا اور کام انجام دیا۔'' (ایضاً)

علامہ شبلی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قوم کو پستی اور زبوں حالی سے نکالنے کے لئے قوم کو اس کے شاندار ماضی کی داستان سنائی۔ مولانا محترم اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دوسری طرف علامہ نے اپنی تصنیفات اور منظومات سے علم قدیم وعلم جدید کے حلقوں کو بھی قیمتی سرمایہ مہیا کیا، خاص طور پر تاریخ کے راستہ سے انھوں نے مسلمانوں کے ماضی کی سربلندی اور ان علوم میں ان کی جدت ومہارت جس میں انھوں نے دنیا کی اعلی تعلیم کی قوم کی حیثیت سے کئی صدیوں تک نام پیدا کیا، جب کہ یورپ کی قومیں نہایت علمی وتمدنی پستی کی حالت میں تھیں، مولانا نے اپنے تحقیقی کاموں کے ذریعہ مسلمانوں کی اس برتری کا تعارف کرایا اور اس طریقہ سے مسلمانوں میں مغرب کی ترقی وتفوق کو دیکھ دیکھ کر جو احساس کمتری اور پست ہمتی پیدا ہو رہی تھی اس کا خاصا ازالہ کیا۔'' (ایضاً، ص:۶)

مولانا مدظلہ کا خیال ہے کہ یہی کام انھوں نے اپنی تصنیفات اور تحقیقات کے ذریعہ بھی انجام دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"انھوں نے مغربی مصنفین کی تحریروں کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا کی گئی تھیں یا کی جارہی تھیں ان کا عالمانہ طریقہ سے ابطال کیا، کتب خانہ اسکندریہ کے سلسلہ میں مسلمانوں کی علم دوستی کو جو مجروح کیا گیا تھا اس کی حقیقت واشگاف کی، ان باتوں کا یہ غیر معمولی اثر پڑا کہ کالج میں پڑھنے والے مسلم طلبہ کے پژمردہ دلوں میں جان پڑ گئی اور وہ مولانا کے مضمون کے حوالہ سے فخر کرتے کہ اسلام اور مسلمانوں پر مغربی مستشرقین کا الزام جھوٹا ہے اور اس کا جھوٹ اس علمی تحقیق سے ثابت ہے۔ علامہ مرحوم نے المامون لکھ کر مسلمانوں کی سیاسی وتمدنی عظمت وترقی کو نمایاں کیا اور الفاروق لکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں اپنے شاندار ماضی پر فخر کرنے اور حوصلہ مندی کے جذبات پیدا کرنے کام لیا۔ بلا شبہ علامہ شبلی نعمانی برصغیر میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے ایک بڑے کارپرداز اور قائد تھے، جن کے ذریعہ اسی عہد سے اسلامی بیداری کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوئے۔" (ایضاً، ص:۶)

مولانا مدظلہ کے یہ خیالات "مطالعہ تصنیفات علامہ شبلی نعمانی" کے دیباچہ سے لئے گئے ہیں جسے انجمن الاصلاح ندوۃ العلما نے ۲۰۱۸ء میں شائع کیا ہے اور جسے ندوہ کے طلبہ محمد سرفراز عالم اور محمد موسیٰ نے مرتب کیا ہے۔

---

(۱۴۲)

پروفیسر اکبر حیدری

[پ: ۱۹۲۹ء]

پروفیسر اکبر حیدری نامور اہل قلم اور ممتاز محقق و مصنف ہیں۔ رثائی ادب پر ان کی گہری

نگاہ ہے۔ ان کے قلم سے متعدد کتابیں نکل کر اہل علم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔

علامہ شبلی کی شہرۂ آفاق کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' کے جتنے دیرپا اثرات ہماری ادبی تاریخ پر مرتب ہوئے اس کی دوسری مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ اردو کے رثائی ادب کا غالباً پورا ذخیرہ اسی کے اردگرد ہے ڈاکٹر انور سدید کا یہ خیال بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا کہ

''اس سے بڑھ کر میر انیس کے کلام کی قدر ناشناسی کی دلیل کیا ہوگی کہ ان کے فن کی تحسین شبلی کے موازنہ انیس و دبیر سے آگے نہ بڑھ سکی۔''

یہ واقعہ ہے کہ میر انیس کو علامہ شبلی نے جو مقام دیا بعد کے اہل قلم کا قدم اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس نقطہ نظر کو پیش نظر رکھ کر ڈاکٹر تقی عابدی نے '' تجزیہ یادگار انیس'' لکھی اور بڑے اہتمام سے شائع کی۔ اس کا مقدمہ پروفیسر اکبر حیدری کے قلم سے ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

''ڈاکٹر عابدی صاحب کی تازہ ترین تصنیف '' تجزیہ یادگار مرثیہ جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' اردو لٹریچر خاص کر رثائی ادب میں ایک عظیم کارنامہ ہے۔ جو علامہ شبلی کی معرکہ آرا کتاب موازنہ انیس و دبیر کے تقریباً ایک سو سال کے بعد منظر عام پر آرہا ہے۔ کتاب دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جو کمی اور تشنگی موازنہ میں محسوس کی جارہی تھی اسے ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف پورا کیا بلکہ اپنی کاوش فکر کو شبلی سے بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ شبلی نے جابجا انیس کے متعدد مرثیوں پر تبصرہ کیا اور محدود صنائع بدائع کی مختصر خوبیاں بیان کیں۔ برعکس اس کے ڈاکٹر صاحب نے انیس کے صرف ایک مرثیے (جب قطع کی .... الخ) میں صنائع لفظی و معنوی کی تقریباً ایک سو خوبیاں تلاش کر کے نمایاں کی ہیں۔''

(تجزیہ یادگار مرثیہ، ص:۱۲)

ڈاکٹر اکبر حیدری کا یہ محض ایک دعویٰ ہی ہوسکتا ہے۔ بالفاظ دیگران سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے، لیکن علامہ شبلی نے میر انیس کو جس مقام و مرتبہ تک پہنچادیا تھا واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں اور نقادوں کی اب تک وہاں تک رسائی نہیں ہوسکی ہے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری نے ''شاعر اعظم مرزا سلامت علی دبیر تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے

کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب بھی علامہ شبلی کے موازنہ انیس ودبیر ہی کے زیر اثر لکھی گئی ہے، بلکہ یہ اس کا جواب ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے علامہ شبلی اور میر انیس کی حمایت اور تعریف وتحسین میں جو کتابیں لکھی گئیں سب کو لایعنی قرار دیا ہے۔ ان میں مہدی حسن احسن لکھنوی، سید امجد علی اشہری محمد حسین آزاد اور مولانا حالی بھی شامل ہیں۔ (شاعر اعظم مرزا اسلامت علی دبیر ص ۹-۱۰)

اب اس نارسائی کو کیا نام دیا جائے۔ اردو ادبیات میں رثائی ادب بالخصوص میر انیس و مرزا دبیر، ان کے حالات وسوانح اور ان کی شاعری، سب کے ذکر میں موازنہ انیس ودبیر کا نام نوک قلم پر آجانا علامہ شبلی کے لازوال اثر کا ایک نمونہ ہے۔ علامہ کی بعض دوسری کتابوں نے اس سے بھی زیادہ مقبولیت پائی اور عالمی تراجم کے ذریعہ دنیا بھر میں مقبول ہوئیں۔ ناچیز کی کتاب ''تصانیف شبلی کے تراجم'' اس سلسلہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

---

(۱۴۳)

مفتون احمد

[۱۹۲۹-۱۹۷۴ء]

مفتون احمد کا تعلق موضع بندول اور خانوادۂ شبلی سے تھا۔ وہ ادیب شہیر مولانا عبدالسلام ندوی کے حقیقی نواسے تھے۔ شبلی اسکول کے بعد علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ اور ایم اے کرنے کے بعد ان کا تقرر ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو فارسی میں ہوگیا۔ دوران ملازمت انہوں نے پاکستان سول کا امتحان دیا اور کامیاب ہوکر مشرقی پاکستان میں مختلف عہدوں پر کام کیا۔ البتہ ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ علامہ شبلی سے بے حد متاثر تھے۔ چنانچہ ان کی شخصیت پر متعدد مضامین ماہنامہ نگار لکھنو اور نئی قدریں حیدرآباد میں لکھے، جن کا ایک مجموعہ شائع ہوا۔ انہوں نے علامہ شبلی پر بڑی بے باکی سے قلم اٹھایا ہے۔ اس کے دیباچہ میں انہوں نے تین باتوں کی توضیح کی ہے۔ ایک پان اسلامزم، دوسرے ان کے عمرانی نظریہ اور تیسرے جمہوریت۔

ان امور پر انہوں نے مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اور شاید پورے ذخیرہ شبلیات میں ان

موضوعات پر کسی نے اس قدر توضیح وصراحت سے قلم نہیں اٹھایا ہے۔اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔(مولانا شبلی ایک مطالعہ،ص:۵-۹)

---

(۱۴۴)

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد

[۱۹۲۹-۲۰۱۶ء]

ادیب وشاعر اور نقاد پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اگر چہ اردو زبان وادب پر بڑی گہری نگاہ رکھتے تھے اور شبلی نیشنل کالج، گورکھ پور یونیورسٹی، اور لکھنؤ یونیورسٹی میں ادب کے استاد کی حیثیت سے عزت پا چکے تھے،مگر ان کو شہرت عام مشاعروں کی نظامت کی بدولت ملی۔

شہر سخن، شہر ستم اور شہر ادب ان کی کتابیں ہیں جنہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ان کا تحقیقی مقالہ مولانا ابوالکلام آزاد فکر وفن خاص طور پر سراہا گیا۔غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ بھی ان کی ایک اچھی ادبی کاوش ہے۔

ملک زادہ صاحب کو ابتدا ہی سے علامہ شبلی کا نام ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔طالب علمی کے بعد شبلی کالج میں وہ استاد رہے۔یہیں انہوں نے تصنیف وتالیف کا آغاز کیا۔عرصہ تک اعظم گڑھ میں قیام،عزیز داریاں، متنوع ربط وتعلقات نے علامہ شبلی کا نام اور کام ذہن میں ازبر ہو گیا تھا۔ ان کی تحریروں اور مضامین سے اعظم گڑھ کے ادبی منظر نامے کا ایک مرقع تیار ہو سکتا ہے، مگر علامہ شبلی پر براہ راست ان کی کوئی تحریر دستیاب نہیں ہوئی۔البتہ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کی کتاب "شبلی: معاصرین کی نظر میں" پر ان کا پیش لفظ خاص اہمیت رکھتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"سرسید کے ان رفقاء میں جنہوں نے اپنے اکتسابات سے فکر ونظر کی نئی راہیں کھولیں، ان میں عمر کے لحاظ سے علامہ شبلی نعمانی سب سے چھوٹے تھے۔انہوں نے ان تمام معاصرین کو اپنی قلمی نگارشات سے متاثر کیا جو اس عہد کے مشاہیر میں شمار کئے جاتے ہیں۔ان میں سرسید، عبدالحلیم شرر، مولانا سید سلیمان ندوی،

خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا حسرت موہانی، حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا اسلم جیراج پوری، اور عطیہ فیضی وغیرہ جیسی اہم شخصیات بھی شامل ہیں۔ان میں اگر ایک طرف علی گڑھ اور ندوۃ العلماء تحریک کے اہم اراکین شامل ہیں تو دوسری طرف ایسی شخصیتیں بھی ہیں جو ان دونوں اداروں سے الگ اپنی آزادانہ حیثیت رکھتی ہیں۔'' (شبلی معاصرین کی نظر میں، ص:۳)

حسن اتفاق کہ جن اہل علم اور ارباب کمال کی طرف ملک زادہ مرحوم نے متوجہ کیا ہے، آج ہماری کتاب کا وہی موضوع ہیں اور انہی کی خدمات کا اس میں احاطہ کیا جا رہا ہے۔

---

(۱۴۵)

پروفیسر مغنی تبسم

[۱۹۳۰-۲۰۱۲ء]

پروفیسر مغنی تبسم ممتاز ادیب، شاعر، نقاد اور مصنف تھے۔ ماہنامہ سب رس حیدر آباد اور مجلّہ شعر و حکمت حیدر آباد کے مدیر رہے۔ان کی تدریسی زندگی جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے شعبہ اردو میں گذری۔انہوں نے تدریس سے پوری دلچسپی کے ساتھ تصنیف و تالیف اور ادارت کے فرائض بھی انجام دئے۔ان کے قلم سے متعدد اہم کتابیں وجود میں آئیں۔ فانی بدایونی پر ان کی کتاب کو بڑی اہمیت اور شہرت حاصل ہے۔

۱۹۷۶ء میں ناز صدیقی صاحبہ نے ایک مجموعہ مقالات ''شبلی نقادوں کی نظر میں'' مرتب کیا جو الیاس ٹریڈرس حیدر آباد سے شائع ہوا۔اس میں علامہ شبلی کے عظیم الشان کارناموں پر نقادوں کے مضامین یکجا کئے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ واقعی بہت عمدہ اور تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ مرتبہ ناز صدیقی صاحبہ نے ابتدا میں علامہ شبلی کے مختصر حالات و سوانح لکھے ہیں۔اس کا پیش لفظ پروفیسر مغنی تبسم [۱۹۳۰-۲۰۱۲ء] کے قلم سے ہے۔جس کا ابتدائیہ یہ ہے:

''شبلی نعمانی اردو ادب کی ایک نہایت دلکش، بارعب اور مسحور کن شخصیت ہیں۔ان

کی حیات ایک مسلسل علمی جہاد سے عبارت رہی۔ وہ تادم آخر ایک مذہبی جوش اور لگن کے ساتھ علم وادب کی خدمت میں لگے رہے۔''

(شبلی نقادوں کی نظر میں، ص:۵)

پروفیسر مغنی تبسم نے سرسید اور شبلی کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ شبلی کو سرسید سے کوئی ذاتی عناد نہ تھا اور ان میں نقطۂ نظر کا اختلاف تھا۔ تجزیے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

''سرسید کی اصلاحی تحریک نے مغرب سے کسی قدر مرعوب ہوکر ہماری قدیم تہذیب اور تاریخ کی طرف منفی رویہ اپنایا تھا جس میں احساس کمتری شامل تھا۔ شبلی کی تحریروں نے قوم کو اس احساس کمتری سے باہر نکلا اور یہی شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔'' (ایضاً، ص:۶)

شبلی کی ادبی حیثیت اور خاص طور پر ان کے اسلوب نگارش کے پروفیسر مغنی تبسم بڑے مداح ہیں۔ علامہ شبلی کے مرتبے کا تعین کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ

''ایک ادیب کی حیثیت سے شبلی اپنے تمام ہم عصروں میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ تاریخ ہو یا سوانح، تنقید ہو یا انشائیہ، ان کا اشہب قلم جس صنف میں رواں ہوا اسے زیر نگیں کرلیا۔

شبلی کے اسلوب میں جو قوت اور صلاحیت ہے وہ کسی کے یہاں نہیں ملتی۔ جب ہم شبلی کی تصانیف کو اس دور کی دوسری نثری تصانیف کے مقابل رکھ دیتے ہیں تو یہ باور نہیں آتا کہ یہ ایک ہی زمانے میں لکھی گئی ہیں۔ شبلی صحیح معنوں میں جدید نثر کے بانی ہیں۔ انھوں نے نثر کی زبان کو اس معیار پر پہنچادیا جہاں وہ ہر طرح کے مطالب، جذبات اور خیالات کو مؤثر طور پر ادا کرسکتی ہے۔ شبلی کا اردو نثر میں وہی مرتبہ ہے جو شاعری میں غالب کو حاصل ہے۔'' (ایضاً، ص:۶،۷)

پروفیسر مغنی تبسم بابائے اردو اور دوسرے ادبا وشعرا کے معاندانہ رویوں سے واقف تھے۔ یہی سبب ہے کہ وہ علامہ شبلی کو مظلوم ادیبوں میں شمار کرتے ہیں اور کہتے ہیں مطالعہ شبلی میں زیادہ

روایتی معیار کو کام میں لایا گیا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ جدید طرز فکر رکھنے والے محقق ونقاد علامہ شبلی کی بازیافت کریں۔ (ایضاً)

---

(۱۴۶)

پروفیسر محمود الٰہی

[۱۹۳۰-۲۰۱۴ء]

پروفیسر محمود الٰہی کا شمار اردو کے بڑے محسنین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے قلم کے ساتھ اپنے طرز عمل سے بھی اردو زبان وادب کی بڑی اہم خدمت انجام دی۔ ان کی تصنیفات ان کے عظیم محقق ومصنف ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔ طبع زاد کتابوں کے علاوہ ترتیب وتدوین کا بھی انہوں بڑے پیمانہ پر کام کیا۔ اس سے بھی بڑھ کران کا یہ کارنامہ ہمیشہ یادرکھا جائے گا کہ انہوں نے اردو کے سپاہی پیدا کئے۔ اوران کواردو زبان وادب کی خدمت پر نہ صرف ابھارا بلکہ مامور بھی کرایا۔

وہ علامہ شبلی کے بڑے مداح ہیں۔ انہی کے زمانہ نظامت میں اردو اکادمی نے موازنہ انیس ودبیر شائع کی۔ اس پر مختصر، لیکن جامع دیباچہ ان کے قلم سے شامل ہے۔ اس کے حرف حرف سے ان کی علمیت اور علامہ شبلی سے شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مرثیہ گوئی کے بارے میں ہمارے بعض تذکرہ نگاروں کے خیالات زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھے۔ شبلی پہلے نقاد ہیں جنہوں نے صنف مرثیہ کو فطری شاعری کے معیار ومیزان پر پرکھا اور 'موازنہ انیس ودبیر' کے سہارے اسے اردو کی ایک وقیع صنف سخن قرار دیا۔ انہوں نے نہ تو انیس کی پاس داری کی اور نہ دبیر کی عیب جوئی۔ انہوں نے شخصیتوں کا ذکر محض اس لئے کیا کہ تصریح مسائل اور استنباط نتائج کے لئے ایسا کرنا ناگزیر تھا۔
>
> 'موازنہ انیس ودبیر' کا شمار اردو کی چند مقبول عام کتابوں میں ہوتا ہے۔ جب پہلی بار شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ ہر چند دبیر کے پرستاروں نے اپنے

شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا لیکن اس کے حسن قبول میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آج اس کے ایڈیشنوں کی تعداد بتانا ایک مشکل امر ہو گیا ہے۔''

(موازنہ انیس و دبیر، ص:۳)

۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر محمود الٰہی نے ایک مفصل مقدمہ کے ساتھ ''صحیفہ محبت'' شائع کیا۔ یہ مہدی حسن افادی [۱۸۷۰-۱۹۲۱ء] کے ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اپنی بیگم کے نام لکھے تھے۔ علامہ شبلی اور مہدی افادی میں گونا گوں تعلقات تھے، اس لئے اس میں ان کا ذکر لازی تھا۔ چنانچہ کئی جگہ ذکر آیا ہے۔ البتہ دو مقامات لائق ذکر ہیں۔

علامہ شبلی نے تالیف سیرت کے لئے انگریزی کتابوں کے تراجم کے لئے متعدد اہل علم کو اس سے وابستہ کیا تھا۔ ان میں چند ایسے اشخاص بھی ہیں جو بوجوہ شامل نہ ہو سکے۔ ان میں ایک مہدی افادی بھی ہیں۔ محمود الٰہی صاحب لکھتے ہیں:

''مشرقی اور مغربی علوم پر ان کی نظر کتنی اور کیسی تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ شبلی کو سیرۃ النبی کے سلسلے میں جب ایک لٹریری اسسٹنٹ کی ضرورت پیش آئی تو ان کو لکھا:

''سیرت نبوی کے لئے بمبئی آیا ہوں کہ یکسوئی سے کام ہو، سید سلیمان اور پورا اسٹاف یہیں آئے گا۔ ایک لائق گریجویٹ بھی ہیں۔ جی تو بہت چاہا کہ آپ رخصت لے کر بمبئی آ جایئے، تمام مصارف دفتر کے ذمہ، انگریزی تصنیفات سے متعلق سیرت نبوی دیکھئے اور ان کے ترجمہ یا اقتباس دیجئے۔ پھر خیال ہوا کہ یہ درخواست قبول نہ ہوگی۔''

علامہ شبلی ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''اب تو خدا کے لئے بمبئی چلے آیئے۔ تحصیل داری میں ایک مہینہ کی رخصت کچھ بڑی زیرباری نہیں ہے۔ وہاں کے سب مصارف میرے ذمہ۔''

اس کام اور سفر کے لئے مہدی افادی غالباً راضی نہ ہو سکے۔

ذکر شبلی مہدی افادی کی کمزوری قرار دیا جاتا ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی نے اس کے اسباب

تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ شبلی مہدی افادی کی کمزوری تھے۔اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ان کی تحریروں کا بڑا حصہ شبلیات پر حاوی ہے۔اس شیفتگی و پرستاری کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ شبلی عمر بھر ایسی چیزیں لکھتے رہے جو نت نئی تحقیقات کی حامل ہوتی تھیں، جن کے لئے مواد کی فراہمی میں شبلی اپنا خون پسینہ ایک کر دیتے تھے۔اس غرض سے انہوں نے دوسرے ملکوں کا دورہ بھی کیا تھا۔شبلی کے شب و روز کسی نہ کسی تحقیق تصنیف کے انصرام و اہتمام میں صرف ہوتے تھے۔اور مہدی افادی اپنے دور کے ہر ذی علم سے اسی بات کی توقع رکھتے تھے۔ان کی توقعات شبلی پوری کرتے رہے اور اس طرح ان کے جذبہ پرستش میں پختگی آتی گئی، لیکن ایسا نہیں ہے کہ شبلی پر ان کے حوصلہ افزایانہ یا تحسینی الفاظ ختم ہو گئے ہوں۔جب کسی نے اپنے اختراعی کردار کا مظاہرہ کیا تو مہدی پہلے شخص تھے جو داد دینے کے لئے آگے بڑھے۔" (صحیفہ محبت، ص:۲۹)

پروفیسر محمود الٰہی کا خیال ہے کہ مہدی افادی کا بیشتر سرمایہ ادب تبصراتی مضامین پر مشتمل ہے۔اور اس کی طرف انہیں علامہ شبلی نے راغب کیا اور وہ بھی براہ راست نہیں رد عمل کے طور پر۔ ایک بار مہدی حسن افادی نے کتاب اور اس پر تبصرے کی خواہش کا اظہار کیا تو علامہ شبلی نے انہیں مایوس کیا۔(ایضاً ص:۱۴-۱۵)

ثبوت کے طور پر پروفیسر محمود الٰہی نے علامہ کا ایک خط نقل کیا ہے۔وہ خط یہ ہے:

"جناب بندہ!

والا نامہ ملا۔محمڈن کلب جو قائم کیا گیا ہے بے شبہ اس کی اعانت ایک ضروری چیز ہے۔لیکن افسوس ہے کہ میں اپنی کوئی تصنیف نذر نہیں کر سکتا۔

....

ریویو کا جو تذکرہ آپ کے خط میں ہے وہ شاید مناسب نہ تھا، گو آپ کا منشا نہ ہو لیکن اس سے متبادر ہوتا ہے کہ ریویو گویا ایک قسم کا معاوضہ ہے۔حالانکہ

مصنف کی بڑی پست فطرتی ہے کہ وہ لوگوں سے ریویو لکھانے کا شائق ہو۔اگر کوئی شخص کسی معقول کتاب پر ریویو لکھنے کی قابلیت رکھتا ہے تو ہر حالت میں اس کو لکھنا چاہئے، لیکن ریویو کوئی آسان چیز نہیں ہے۔ ہمارے ریویو نگاروں کے لئے یہی بہت ہے کہ ان کی یہ قابلیت تسلیم کی جائے نہ کہ اس سے مصنف پر احسان رکھا جائے۔ ملک میں شاید ایسے مضمون نگار دو تین سے زیادہ نہیں ہیں جن کے ریویو سے کسی مصنف کو خوشی ہو سکے۔..........

شبلی

از علی گڑھ، ۸رمئی ۱۸۹۰ء

پروفیسر محمود الٰہی نے مہدی افادی کے بیشتر تبصراتی مضامین کو مذکورہ خط کا ردعمل قرار دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے خطوط میں مہدی افادی کو سرسید، محمد حسین آزاد اور حالی کی تصنیفات کے مطالعے کا مشورہ دیا ہے۔ گویا ذہنی رہبری بھی کی ہے۔ (صحیفہ محبت، ص: ۱۵-۱۶)

۱۹۸۸ء میں مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقریبات کا بڑے پیمانہ پر ملک میں انعقاد ہوا۔ اس وقت پروفیسر محمود الٰہی صاحب اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے چیرمین تھے۔ چنانچہ انہوں نے مولانا آزاد پر کتابوں کی اشاعت کا ایک وسیع منصوبہ بنایا۔ اور کتابوں کے ساتھ الہلال اور البلاغ کے انتخابات شائع کئے گئے۔ اور آخر میں الہلال کا مکمل عکس سات جلدوں میں شائع کیا۔ پروفیسر محمود الٰہی صاحب کے اور بہت سے کام ہیں، مگر وہ کچھ اور نہ کرتے صرف یہی سلسلہ آزاد صدی تقریبات کے تحت شائع ہونے والی کتابوں ہی کو مرتب اور شائع کرتے تب بھی یہ ایسا اہم کام ہے کہ ان کا نام زندہ رہنے کے لئے کافی ہوتا، مگر ان کے اس کارنامے کا شایان شان ذکر و تعارف نہیں ہو سکا۔ اسی سلسلہ مطبوعات میں ''الہلال کے تبصرے'' کے عنوان سے ایک کتاب پروفیسر محمود الٰہی صاحب نے مرتب کی ہے۔ اس میں ایک تبصرہ علامہ شبلی کے قلم سے بھی شامل ہے، جو الہلال میں شائع ہوا تھا۔ اس پر پروفیسر محمود الٰہی نے جو دیباچہ لکھا ہے اس میں علامہ شبلی کا وہ خط جو انہوں نے تبصرہ نگاری سے متعلق مہدی افادی کو لکھا تھا اور ہم جو اوپر نقل کر چکے ہیں اس کو نقل کر کے لکھا ہے کہ لوگ اس خط و کتابت کو بھولے نہیں ہوں گے۔ (الہلال کے تبصرے، ص: ۷)

ممکن ہے یہ خط بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد نے پڑھا ہو اور اس کا اثر بھی لیا ہو مگر جس وقت [۱۸۹۰ء] یہ خط لکھا گیا، اس وقت مولانا آزاد دو یا تین برس کے رہے ہوں گے۔ مولانا آزاد کی تاریخ پیدائش کا سنہ ۱۸۸۸ء ہے۔

اس کے بعد مولانا آزاد نے تبصرہ نگاری کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اسے نقل کیا گیا ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی نے لکھا ہے کہ ''مولانا شبلی نے ریویو نگاری کی جو ذمہ داریاں مہدی افادی کو اجمالاً بتائی تھیں ان کی تفصیل مولانا آزاد نے مندرجہ بالا اقتباس میں بیان کی ہیں۔ (الہلال کے تبصرے، ص:۸)

---

(۱۴۷)

پروفیسر سید مجاور حسین

[۱۵، اکتوبر ۱۹۳۰ء]

پروفیسر سید مجاور حسین نے ۲۰۱۰ء میں موازنہ انیس و دبیر کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ موازنہ کے متعدد محقق ایڈیشن ہندو پاک سے شائع ہوئے ہیں۔ راقم الحروف نے بھی ایک ایڈیشن مرتب کیا ہے جسے دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۲۰۰۴ء سے شائع کر رہا ہے۔ اس کا متن پہلے ایڈیشن کے مطابق ہے جو خود مصنف علامہ شبلی نے ۱۹۰۷ء میں شائع کیا تھا۔ البتہ اس میں مراثی انیس و دبیر کے مطبوعہ نسخوں سے اس کا تقابل کر کے حوالہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے کے تمام محقق نسخے بھی اسی پہلے ایڈیشن کے متن کی بنیاد پر تیار کیے گئے ہیں بلکہ بعد کے ایڈیشن بھی۔ حتیٰ کہ رشید حسن خاں جیسے محقق و نقاد نے بھی اسی پر اعتماد کیا ہے۔ ڈاکٹر سید مجاور حسین نے سید علی حیدر کی مدد سے جو نسخہ تیار کیا ہے اس کا متن بھی ۱۹۰۷ء ہی کا ہے۔ البتہ اس میں حواشی اور مصنف کے حالات قلم بند کئے گئے ہیں۔ مراثی کے ترجمے بھی دیئے گئے ہیں اور آخر میں فرہنگ بھی دی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ اب تک کا سب سے مفید اور معلوماتی ایڈیشن ہے۔

اس قدر محنت و تحقیق سے موازنہ مرتب کرنے کے باوجود مقدمہ میں مرتب کا لب ولہجہ

متین اور سنجیدہ ہے۔ عظمت شبلی اور موازنہ کا اعتراف ہے۔ فضل امام رضوی کی طرح نہیں کہ کیا کچھ نہیں اور علامہ شبلی پر تنقید و تنقیص کے انبار لگا دیئے۔

پروفیسر مجاور حسین لکھتے ہیں:

''عموماً مرتبین نے شبلی پر جانب داری کا الزام عاید کیا ہے، لیکن یہ الزام سطحی انداز میں موازنہ کے مطالعہ کے بغیر شبلی پر لگایا گیا ہے۔ شبلی نے ابتدا ہی میں اپنا نظریہ شعر پیش کر دیا ہے اور اسی معیار پر انھوں نے میر انیس کے کلام کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔...... شبلی نے نہایت مدلل انداز میں اپنا زاویہ نظر پیش کیا ہے اور ادبی توازن کے ساتھ دونوں باکمال شعرا کے جوہر شاعری کی طرف متوجہ کیا ہے۔

موازنہ کا اہم ترین وصف یہ بھی ہے کہ اس میں تجزیہ، تقابل، اعلیٰ ترین انتخاب مراثی، ذوق سلیم کی جلوہ آرائی اور نقد شعر کا معیار ملتا ہے۔ مرثیہ سے دلچسپی رکھنے والے باذوق طالب علموں کے لئے ہی کتاب اہم نہیں ہے بلکہ علمی اور تقابلی تنقید کی راہیں بھی اس سے کھلتی ہیں۔'' (دیباچہ: موازنہ انیس و دبیر)

پروفیسر مجاور حسین نے موازنہ کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تحسین کے ساتھ اس کے بعض تسامحات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی ان کا سنجیدہ انداز قابل ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جتنے اہم نسخے ہو سکتے تھے وہ سب پیش نظر رہے، صرف ایک نسخہ جو ۱۹۶۴ء میں پاکستان میں شائع ہوا تھا ہماری دسترس سے باہر رہا۔ نسخوں میں متن کا کہیں اختلاف نہیں ہے، البتہ حواشی میں اختلاف کی گنجائش تھی مگر وہ صرف اس حد تک ملے ''زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے''۔ دبیر کے شاگرد قدیر کا مصرعہ ہے۔ اور ''فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں'' دبیر کا نہیں ہے۔ اور بس!'' (ایضاً، ص:۸)

ڈاکٹر سید رفیق حسین سابق استاد شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی نے بھی موازنہ کا ایک نسخہ مرتب کیا ہے، جسے الہ آباد کے رام نرائن پبلشرز نے شائع کیا ہے۔ پروفیسر سید مجاور حسین نے دیباچہ میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ کئی لحاظ سے وہ بھی بہت مفید تھا۔ اس میں بھی عربی و

فارسی مراثی کے ترجمے شامل ہیں۔

---

(۱۴۸)

پروفیسر انجم اعظمی

[۱۹۳۱-۱۹۹۰ء]

پروفیسر انجم اعظمی اردو کے اپنے عہد کے نامور ادیب، شاعر اور نقاد تھے۔ ان کے چار شعری مجموعے لب ورخسار [م:۱۹۵۲ء]، لہو کے چراغ[م:۱۹۶۱ء]، چہرہ اور زیر آسمان شائع ہوئے۔ دو ادبی وتنقیدی مضامین کے مجموعے ادب اور حقیقت اور شاعری کی زبان شائع ہوئے۔ ''ادب اور حقیقت'' ۱۹۷۹ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس کے دیباچہ میں انہوں نے علامہ شبلی اور اقبال احمد خاں سہیل کا گہرا مطالعہ کرنے اور ان سے متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ (ص:۸-۹)

علامہ شبلی نعمانی پر ان کا ایک مضمون ''شبلی کا نصب العین'' ان کے مجموعہ مضامین ''ادب اور حقیقت'' میں شامل ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے علامہ شبلی کے افکار سے گہرا تاثر قبول کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''شبلی شعرالعجم اور الفاروق جیسی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن کی خوشبو اردو داں حضرات کا حلقہ توڑ کر دنیا کے مختلف گوشوں تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن شبلی کی زندگی ایک بحر ذخار تھی، جہاں سے الفاروق، شعرالعجم، سیرت النبی اور موازنہ انیس و دبیر کے علاوہ دوسرے کئی انمول موتی برآمد ہوئے۔''

(ادب اور حقیقت، ص:۲۲۵)

شبلی اپنے عہد کے بہترین انشاپرداز تھے۔ اردو کی تخلیقی نثر شبلی ہی کی روایت ہے۔ محمد حسین آزاد کی نثر بے حد خوب صورت اور دلآویز ہے لیکن وہ منفرد انداز نگارش ہی کی حیثیت سے زندہ رہے گی۔ ہمارے عہد کے تقاضوں اور علم وفن کے موضوعات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ بلکہ بجائے خود فن کا ایک اعجاز ہے۔ سرسید

اور حالی کی نثر شبلی کی زبان کے مقابلے میں پھیکی اور بے جان ہے۔اسی لئے نثر کے ارتقا میں غالب کے بعد شبلی ہی کا نام آتا ہے۔" (ادب اور حقیقت ص:۲۲۵)

وہ عالم اتنے بڑے تھے کہ دنیائے اسلام میں انڈونیشیا سے مراکش تک ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔اہل سیاست کی مکاریوں اور چالبازیوں سے ان کا تعلق دور دور تک نہ تھا۔لیکن سیاسی سوجھ بوجھ کے اعتبار سے درجہ اول کا ذہن رکھتے تھے۔علی گڑھ آکر سرسید کے کالج میں ملازم اور سرسید تحریک کے رکن بنے۔ لیکن ندوہ کا قیام بھی انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔وہ اردو اور فارسی دونوں کے بے مثل شاعر تھے۔شاعری ان کی زندگی میں ثانوی حیثیت رکھتی تھی لیکن اس کے باوجود اردو میں مخصوص طنزیہ سیاسی نظموں اور اخلاقی نظموں کی طرف سب سے پہلے شبلی ہی نے توجہ کی۔جوش اور اقبال جیسے بزرگ شعرا ان کی نظموں سے متاثر ہوئے۔" (ادب اور حقیقت ص۲۲۶)

انجم اعظمی کا اصل نام مشتاق احمد عثمانی تھا۔وہ اعظم گڑھ کے ایک گاؤں فتح پور میں ۲ر جنوری ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے۔گورکھ پور، الہ آباد اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔۱۹۵۲ء میں ہجرت کر کے کراچی میں جا بسے تھے۔شعر بہت اچھے کہتے تھے۔ان کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا۔

تجھ سے پردہ نہیں مرے غم کا
تو مری زندگی کا محرم ہے

---

(۱۴۹)

ایم۔حبیب خاں

[۱۹۳۱-۱۹۹۸ء]

ایم حبیب خاں متعدد کتابوں کے مرتب و مصنف ہیں۔۱۹۵۸ء کے بہترین افسانے، انتخاب کلام جرات، اردو کی قدیم داستانیں، افکار میر، انشاء اللہ خاں انشا، حسرت موہانی، غالب

اور سرور، دیوان عرشی ان کی اہم ادبی کاوشیں ہیں۔

جیسا کہ گذشتہ کتابوں سے بھی واضح ہے کہ اردو ادب اور اس کی اصناف پر ایم حبیب خاں کی گہری نگاہ تھی۔ انہوں نے کلاسیکل شعرا میں میر سے فراق تک کی شاعری پر تنقیدی مضامین یکجا کر کے تین جلدوں میں شائع کئے۔ ان پر انہوں نے جو دیباچے لکھے ہیں ان سے ان کی گہری نظر اور پختہ ادبی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان مجلدات میں علامہ شبلی کے کئی مضامین شامل ہیں۔

علی گڑھ میں اردو تنقید کے معماروں پر تنقیدی مضامین کے انتخاب کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی تھی جس کے روح رواں نامور ادیب و شاعر اور نقاد ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی تھے۔ اسے ایم حبیب خاں نے ''اردو تنقید کے معمار'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اس میں علامہ شبلی کی تنقید نگاری پر ڈاکٹر عبادت بریلوی کا مفصل مضمون شامل ہے۔ اس کے دیباچے میں ایم حبیب خاں نے علامہ شبلی اور اثرات شبلی پر مختصراً روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ

> ''شبلی کا شمار بھی حالی کی طرح اردو کے اہم نقادوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے حالی کے مقدمہ کی طرح تنقید پر کوئی مستقل کتاب تو نہیں پیش کی لیکن ''شعر العجم'' اور ''موازنہ انیس و دبیر'' میں اپنے تنقیدی خیالات کا گہرائی سے اظہار کیا ہے، جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی کتاب ''شعر الہند'' کی جلد اول ''آب حیات'' کی طرز پر ہے۔ اور دوسری شبلی کی شعر العجم سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔'' (اردو تنقید کے معمار، ص:۱۴)

---

(۱۵۰)

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

[۱۹۳۱-۲۰۰۳ء]

پروفیسر رفیع اللہ شہاب علوم اسلامیہ کے ساتھ جدید علوم پر بھی گہری نگاہ رکھنے والے عالم و مصنف اور محقق تھے۔ تعلیم اور تاریخ میں بھی دانشورانہ درک رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں علوم

جدید وقدیم کا جامع تصور کیا جاتا ہے۔

پروفیسر رفیع اللہ شہاب نے مختلف کالجوں میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ آخر میں گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور میں شعبہ عربی اور شعبہ اسلامیات کے صدر رہے اور اس حیثیت سے بھی بڑی خدمات انجام دیں۔ وہ ایک بڑے اور جامع کمال مصنف ومحقق اور مدون تھے۔ ان کی تصنیفات وتالیفات درج ذیل ہیں:

سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، منصب حکومت اور مسلمان عورت، اسلامی ریاست کا مالیاتی نظام، احکام القرآن میں تحریف، اسلامی ریاست کا عدالتی نظام، شریعت اسلامی اور خاندانی منصوبہ بندی، اسلامی تہوار اور رسومات، اسلامی معاشرہ، اسلام کا ازدواجی نظام، کرایہ مکانات کی شرعی حیثیت، موسیقی کی شرعی حیثیت، طب نبویؐ، اجتہادی اختلافات، عورتوں کے بارے میں اسلامی احکامات، عورتوں کے اسلامی حقوق، اسلامی معاشرہ۔

پروفیسر رفیع اللہ شہاب نے علامہ شبلی کی مشہور کتابیں الکلام اور علم الکلام کا یکجا ایڈیشن ۲۰۰۳ء میں اردو بازار لاہور سے شائع کیا۔ اس کا سبب ان کتابوں کی عدم دستیابی لکھا ہے۔ اس ایڈیشن کی ابتدا میں ان کا مفصل تعارف پیش کیا ہے۔ اس میں علامہ شبلی کے اجمالی حالات، تصنیفات وتالیفات اور ان کی انفرادیت اور افادیت وغیرہ بیان کی ہیں۔ علامہ کے دوسرے علمی و تعلیمی کاموں کا بھی ذکر کیا ہے۔ شبلی نیشنل کالج اور دار المصنفین کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کی ضرورت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں مسلمانوں کے علم کلام اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے اور علامہ شبلی کے سلسلہ کلامیہ کو ایک منفرد کارنامہ قرار دیا ہے۔

پروفیسر رفیع اللہ شہاب کی نظر علم الکلام اور اس کی تاریخ پر بڑی گہری ہے اور وہ اس کے ایک ایک پہلو کو واضح کرتے ہوئے علامہ شبلی کے بڑے معتقد ومداح نظر آتے ہیں۔ اس تعارفی تحریر کے چند اقتباسات قابل ذکر ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"سرسید کے بعد شبلی نعمانی پہلے ایسے شخص تھے جنہوں نے کفر والحاد کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی شعوری کوشش کی تھی اور ندوۃ العلما کے ایک اجلاس میں علما کو خبردار کیا تھا کہ وہ اس کفر والحاد کو روکیں جو فلسفہ کی کمین گاہوں سے نکل کر

ہندوستان کی طرف بڑھ رہا ہے۔شبلی کی معروضات پر بہت کم لوگوں نے دھیان دیا۔بعض انہیں مادہ پرست اور بعض بے دین کہنے لگے۔بعضوں نے ان پر کفر کا الزام لگایا۔وہ اپنی ذات میں مسلمانوں کے ساتھ مخلص تھے۔انہوں نے ہر اعتراض کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کیا۔اوراس بات کی کوشش کی کہ عوام ان کے بیانات پر جذباتی طور پر مشتعل ہونے کی بجائے غور کریں۔"

(علم الکلام اور الکلام،ص:۱۴)

پروفیسر رفیع اللہ شہاب نے پہلے یہ بتایا ہے کہ انہوں نے وقت کی ضرورت محسوس کی اور اس کا اظہار کیا تو علامہ پر طرح طرح کے اعتراضات ہوئے۔اس کے بعد وہ الکلام اور علم الکلام کو علامہ شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ الکلام اور علم الکلام ہے۔ابتدا میں ان کا خیال تھا کہ وہ اسے چار جلدوں میں مکمل کریں گے۔لیکن دو جلدوں کی اشاعت کے بعد ان کا اصلی مقصد پورا ہو گیا تو انہوں نے اس کی تکمیل کی ضرورت نہیں سمجھی۔

شبلی نے غزالی اور رازی کے افکار سے بہت کچھ حاصل کیا ہے،لیکن انہوں نے اپنی اس تصنیف کے ذریعہ جس علم کلام کی بنیاد رکھی ہے،اس سے ان تمام مباحث کی نشاندہی ہوتی ہے جو ہندوستان میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے ہیں۔مشنریوں کے دور عیسائیت کی تبلیغ اور مختلف فرقوں کی آویزشوں نے اسلامیان ہند کو ذہنی اور فکری طور پر متاثر اور مغلوب کیا تھا۔ان کو کسی غزالی،کسی رازی اور کسی ابن رشد کی تلاش تھی۔وہ ملحدین کے اعتراضات رد کرنے کے لئے اپنے عقائد کے متعلق سے اثباتی جواز چاہیے تھے۔" (ایضاً،ص:۱۴)

پروفیسر رفیع اللہ شہاب کا یہ بھی خیال ہے کہ

"شبلی نے عقلی دلیلوں سے اثباتی جواز پیدا کر کے تمام مسلمانوں کو گمراہ ہونے سے بچالیا،جن لوگوں کو فلسفہ اور منطق سے دلچسپی رہی ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندوستان میں آج سے پہلے شبلی کی ٹکر کا دوسرا متکلم پیدا نہیں ہوا

ہے۔ان کی اس تصنیف کے ذریعہ اسلام کے بنیادی عقائد کو علم وفکر اور عقلیت کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔وہ لوگ جو عقیدوں کے پابند محض ہو کر اپنے اپنے مسلک پر کاربند چلے آرہے تھے اس کتاب کی موجودگی نے ان کے اثبات و ایقان میں بڑی پختگی پیدا کی۔یہی نہیں بلکہ وہ اسے مغربی فلسفہ اور اس کے پیدا کردہ مسائل کے خلاف موثر دفاع کے طور پر بھی استعمال کرنے لگے۔

شبلی نے جن دونوں علم الکلام اور الکلام لکھنا شروع کی تھی وہ دن مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی ناکامی سے عبارت تھے۔انگریزی معاشرت، اسلامی عقائد کو غارت کرنے پر بری طرح تلی ہوئی تھی،آج جبکہ پاکستان میں عیسائی مشنریاں نئے روپ دھار کر اسلام کے اصل اور بنیادی عقائد کی نفی کرنا چاہتی ہیں،شبلی کی الکلام کی قدر و قیمت اور افادیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔'' (ایضاً ص ۱۵)

---

(۱۵۱)

عبدالرؤف عروجؔ

[۱۹۳۲-۱۹۹۰ء]

شعرالعجم میں شمولیت کے لئے علامہ شبلی نے امیر خسرو کے حالات اور شاعری پر نقد و تبصرہ لکھا۔شعرالعجم کی اشاعت کی نوبت ابھی آئی نہیں تھی کہ شمس العلما خواجہ حسن نظامی کی طرف سے درویشانہ ادب میں اضافہ کے لئے علامہ شبلی کے پاس درخواست آئی۔چنانچہ علامہ شبلی نے امیر خسرو پر جو کچھ لکھا تھا اسے درویشانہ ادب کے تحت اشاعت کے لئے خواجہ صاحب کے حوالہ کر دیا اور وہ حلقہ مشائخ کی جانب سے ''بیان خسرو'' کے نام سے شائع ہوا۔اسی کو بعد میں بعض دوسرے اشاعتی اداروں نے ''حیات خسرو'' کے نام سے شائع کیا۔

اردو کے مرثیہ گو ادیب و شاعر، محقق و نقاد اور ماہر اقبالیات عبدالرؤف عروجؔ نے دس ابواب پر مشتمل امیر خسرو کی ایک نہایت مفصل اور مبسوط سوانح عمری لکھی ہے۔بیان خسرو کے بارہ

میں انہوں نے لکھا ہے کہ امیر خسرو پر سوائے علامہ شبلی کے کسی نے کوئی کام ہی نہیں کیا اور یہ کہ اگر امیر خسرو کی تصنیفات نہ ہوتیں تو ان کے بارہ کچھ لکھنا مشکل ہوتا۔ عبدالرؤف عروج نے اپنے دیباچہ میں 'بیان خسروؒ کی اہمیت کے ساتھ اس کی اولیت کا بھی اعتراف کیا ہے۔(خسرو اور، ص ۳)

---

(۱۵۲)

پروفیسر خالد بزمی

[۱۹۳۲-۱۹۹۹ء]

پروفیسر محمد یونس خالد بزمی اسلامیہ کالج لاہور کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں علامہ شبلی کے شیدائی ہو گئے تھے۔ اسلامیہ کالج کے ترجمان مجلہ کریسنٹ کا "شبلی نمبر" انہوں نے دور طالب علمی میں ترتیب دیا تھا۔ اس کے حرف آغاز میں انہوں نے لکھا ہے کہ

> "علامہ شبلی کے دل میں اسلام اور ملت اسلامیہ کے لئے جو درد اور جوش و جذبہ تھا اس کی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ مشاہیر اسلام میں انھیں نہایت با عزت اور قابل افتخار و نازش مقام نصیب ہے۔ اپنے اخلاق و اوصاف اور خدمات کے اعتبار سے وہ زیادہ سے زیادہ اظہار عقیدت اور سپاس و تحسین کے حق دار ہیں۔" (حرف آغاز، کریسنٹ شبلی نمبر، لاہور، جنوری ۱۹۷۱ء)

لیکن پھر مدۃ العمر علامہ شبلی سے متعلق کوئی کام کیا یا نہیں، معلوم نہیں ہو سکا۔

---

(۱۵۳)

حامدی کاشمیری

[۱۹۳۲-۲۰۱۸ء]

حامدی کاشمیری اردو کے نامور ادیب، شاعر اور نقاد تھے۔ وہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو

سے وابستہ رہے۔اس کے مجلّہ ''بازیافت'' اور''جہات'' کے مدیر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ انہوں نے متعدد کتابیں سپردقلم کیں۔جدید اردو نظم اور یورپی اثرات،غالب کے تخلیقی سرچشمے، نئی حسیت اور عصری اردو شاعری،اقبال اور غالب، ناصر کاظمی کی شاعری، حرف راز، کارگہہ شیشہ گراں، معاصر تنقید، اردو تنقید، اکتشافی تنقید، ہمارا ادب، اردو نظم کی دریافت، تفہیم و تنقید، شیخ العالم حیات اور شاعری، انتخاب کلام میر، امکانات، اردو افسانہ تجزیہ، بہاروں میں شرلے (ناول)، بلندیوں کے خواب (ناول) وادی کے پھول، برف میں آگ (افسانے) ان کی کتابوں اور مضامین کے مجموعوں کے نام ہیں۔

ایک شعری مجموعہ شہرگماں بھی شائع ہوا ہے۔ان کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے انہیں پدم شری کے اعزاز سے نوازا۔ان کی شخصیت، شاعری اور ادبی کاوشوں پر سیفی سرونجی کی کتاب ''حامدی کاشمیری شخصیت اور فن'' شائع ہو چکی ہے۔حامدی کاشمیری نے اپنی کتاب ''اردو تنقید'' کے دیباچہ میں علامہ شبلی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

''شبلی نعمانی نے شعرالعجم میں فارسی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے کتاب کی جلد چہارم میں شاعری کی ماہیت اور فنی محاسن پر روشنی ڈالی ہے۔وہ شعر کی اصلیت کا تعین سماجی حوالے سے نہیں بلکہ احساس کی بنا پر کرتے ہیں۔لکھتے ہیں ''یہی قوت جس کو احساس، انفعال یا فیلنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں شاعری کا دوسرا نام ہے۔وہ شعر کو وجدانی اور ذوقی چیز قرار دیتے ہیں۔اور محاکات اور تخئیل کو اس کے اصلی عناصر گردانتے ہیں۔موازنہ انیس و دبیر میں بھی ان کے تنقیدی ذہن کی بھرپور جھلکیاں ملتی ہیں۔انہوں نے عربی و فارسی ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔''

(اردو تنقید، ص:۱۳)

(۱۵۴)

پروفیسر شعیب اعظمی

[۱۹۳۲-۲۰۰۹ء]

پروفیسر شعیب اعظمی سابق استاد شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، حافظ قرآن اور فارسی زبان وادب کے ممتاز عالم وادیب اور مصنف تھے۔ انہوں نے پچاسوں اہم مضامین معاصر ادبی رسائل میں لکھے۔ متعدد کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ فارسی ادب بعہد سلاطین تغلق، صحبت یار آخر شد، گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را، پروانہ چراغ مزار خدیم ما، قصہ ہائے رنگ رنگ اور بطواف کعبہ رفتم، ان کی کتابوں اور سفر ناموں کے نام ہیں۔

ڈاکٹر شعیب اعظمی اعظم گڑھ کی ایک بہت معروف شخصیت حکیم محمد اسحاق صاحب کے صاحبزادہ ہیں۔ ان کی خودنوشت ''پروانہ چراغ مزار خدیم ما'' انہی نے مرتب کر کے شائع کرائی۔ اعظم گڑھ اور جامعہ کی ایک اور ہستی ڈاکٹر سعید انصاری اور دوسرے ڈاکٹر شعیب اعظمی کی تعارفی تحریریں بھی اس خودنوشت میں شامل ہیں۔ ان دونوں اہل قلم نے علامہ شبلی پر علمی کام کئے ہیں۔ ڈاکٹر سعید انصاری کا مبسوط مقالہ ''شبلی اردو کے بہترین انشا پرداز'' جو انہوں نے دور طالب علمی میں انعامی مقابلہ کے لئے لکھا تھا اور اول قرار پایا۔ وہ الناظر بک ڈپو سے کئی بار شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر شعیب اعظمی نے بھی علامہ شبلی کی شخصیت اور مکتوب نگاری پر کئی مقالات سپرد قلم کئے ہیں۔ اپنے سفر نامے ''بطواف کعبہ رفتم'' میں بھی علامہ شبلی کا کئی مقامات پر ذکر کیا ہے۔ البتہ صفحہ ۵۴ پر علامہ کا شمار ان لوگوں میں کیا ہے جنہوں نے شہنشاہ کونین کی توصیف اور مدح وثنا میں تو کمی نہیں کی، مگر انہیں روضہ اطہر پر حاضری کا موقع نہیں ملا، لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ علامہ شبلی کا تحصیل علم کے بعد پہلا کام حج بیت اللہ ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۹ رسال تھی۔

اب تک ''اثرات شبلی'' کی نشاندہی جن اشخاص اور ارباب کمال کے حوالہ سے کی گئی ہے، وہ اعظم گڑھ کے باہر کے ہیں۔ اب ایک مقامی پرستار شبلی کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔ ڈاکٹر شعیب اعظمی صاحب کے قلم سے علامہ شبلی کی یادگار دارالمصنفین کی منظر کشی دیکھئے:

"دارالمصنفین ایک ادارہ تھا جسے ۱۹۱۴ء میں شبلی نے اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھا تھا۔ اپنی زندگی کا ماحصل سمجھا تھا۔ یہ ایک دیوبند تھا۔ ایک ندوہ تھا۔ ایک علی گڑھ تھا۔ جس نے اس دورافتادہ سرزمین میں جنم لیا تھا اور اس ضلعے میں علم، ادب، تہذیب، تمدن، سیاست اور معیشت کا ایسا فانوس تھا جس کی روشنی سے سارا ہندوستان جگمگا رہا تھا۔ سارے ہندوستان کے علماء کے قدوم میمنت سے یہ سرزمین اور مقدس بنی، تمام ہندو اور مسلم رہنماؤں کی آمد سے یہاں کی بزم بار ہا سجی، ہندوستان کے مایہ ناز سپوت یہاں آئے۔ راشٹر پتا گاندھی جی، ہندوستان کے تینوں وزیر اعظم، صدر جمہوریہ ہند ذاکر حسین خاں، مدن موہن مالویہ، سپرو، ضیاء الدین کاٹجو، حبیب الرحمٰن خاں شروانی، غرض کس کس کے نام لیجیے اور کس کس کا ذکر کیجیے۔ ایک دنیا تھی کہ کھنچی چلی آتی تھی اور یہ ایسا مرکز تھا کہ جہاں آئے بنا کسی کی شہرت کو چار چاند لگنے مشکل ہو جاتے تھے۔ سید سلیمان ندوی آفتاب علم ودین اور مولانا مسعود علی ندوی ماہتاب تمدن وسیاست اس ادارے کے ناخدا تھے۔

بھلا ان حالات میں یہاں کے عوام تمدن، سیاست، علم اور مذہب سے مزین کیوں نہ ہوتے۔ ہر میدان میں نامور اور اہل کمال پیدا ہونے لگے۔ مولانا اقبال احمد خاں سہیل، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا ابوالجلال ندوی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا امین احسن اصلاحی ان اشخاص میں ہیں جو کبھی بھلائے نہیں جاسکتے۔ اور شبلی نے جو خواب دیکھا تھا صحیح معنوں میں وہ پورا ہو چکا تھا۔"

(پروانہ چراغ مزار خدیم ماص: ۱۳۰-۱۴)

پروفیسر شعیب اعظمی نے علامہ شبلی کے فکروفن پر جو مضامین لکھے ہیں، مثلاً علامہ شبلی کی مکتوب نگاری، شبلی ایک مخالف غالب اور فارسی شاعری اور شعرالعجم وغیرہ وہ ان کے کسی معاصر سے کم رتبہ نہیں، تاہم ہمارے موضوع سے باہر ہیں۔

(۱۵۵)

ڈاکٹر احمر لاری

[۱۹۳۲-۲۰۱۱ء]

ڈاکٹر احمر لاری صاحب سابق صدر شعبہ اردو گورکھ پور یونیورسٹی اردو کے ان خدمت گذاروں میں تھے، جنہوں نے اردو سے زیادہ اردو والوں کی خدمت کی۔انہوں نے اپنے استاد ڈاکٹر محمود الٰہی کے بعد گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا معیار گرنے نہیں دیا۔

لاری صاحب نے تصنیف وتالیف میں حصہ لیا۔اور چھوٹی بڑی کئی کتابیں لکھیں اور مرتب کیں۔''حسرت موہانی حیات اور کارنامے'' ان کا تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، ابتک منفرد خیال کیا جاتا ہے۔اور واقعہ ہے کہ یہ مقالہ بڑی محنت وتحقیق سے لکھا گیا ہے۔علاوہ ازیں حسرت موہانی کا تذکرہ شعرا اور ارباب سخن، دونوں انہوں نے مرتب کیا جو اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو سے شائع ہوئے۔

ان کی زیرنگرانی کئی اہم اور تحقیقی مقالے برائے پی ایچ ڈی لکھے گئے۔ان میں ایک ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی مدظلہ کا مقالہ ''علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت وادبی خدمات'' بھی ہے۔اس کا مقدمہ ڈاکٹر لاری کے محققانہ قلم سے ہے۔اس میں وہ لکھتے ہیں:

> ''علامہ شبلی نعمانی قدیم وجدید کے امتزاج کے قائل تھے۔اسی لئے وہ سرسید سے متاثر ہونے کے باوجود ہر معاملے میں ان کی ہم نوائی نہ کرسکے۔شبلی کے تمام علمی و ادبی کارنامے ان کے اس مخصوص نقطہ نظر کے آئینہ دار ہیں۔شبلی کا ایک اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ادیبوں کی ایک ایسی جماعت تیار کردی جنہوں نے نہ صرف ان کے نامکمل کاموں کو مکمل کیا بلکہ انہیں مزید آگے بڑھایا۔ان ادیبوں میں سید صاحب سرفہرست ہیں اور انہیں صحیح معنوں میں شبلی کا جانشین کہا جاسکتا ہے۔'' (علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت وادبی خدمات، ص:۱۳)

ڈاکٹر احمر لاری کا یہ بھی خیال ہے کہ

''سرسید کے زیر اثر شبلی کے یہاں عقلیت آئی ،لیکن شبلی کی جذباتیت نے اسے معتدل شکل عطا کی ،شبلی کے یہاں قدیم اور جدید، عقلیت اور جذباتیت، مذہبیت اور قومیت، حقیقت نگاری اور رومانیت کا امتزاج ملتا ہے۔

شبلی نے تاریخ ،مذہبیات، سوانح، سفرنامہ، تنقید، شاعری اور مقالہ نگاری ہر میدان میں اشہب قلم کو دوڑایا اور اردو ادب کے باغ میں مختلف رنگ و بو کے پھول کھلائے۔انہوں نے اردو میں ایجی ٹیشنل نظموں کی بنیاد ڈالی ۔موازنہ انیس و دبیر اور شعر العجم لکھ کر تنقید کا معیار بلند کیا اور تاریخ ،سوانح اور مذہبیات میں کئی اعلیٰ پائے کی تصانیف پیش کیں۔ان کے علاوہ انہوں نے مختلف موضوعات پر انہوں نے سو سے زیادہ مقالے بھی لکھے۔المختصر شبلی نے اپنی تصانیف اور مقالوں کے ذریعے اردو کو علمی زبانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔''

(حسرت موہانی حیات اور کارنامے،ص:۵۱)

---

(۱۵۶)

ڈاکٹر نورالحسن انصاری

[۱۹۳۲-۱۹۸۷ء]

ڈاکٹر نورالحسن انصاری مئو کے رہنے والے اور دہلی یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں استاد تھے۔فارسی زبان و ادب کے بڑے زبردست اسکالر تھے۔انہوں نے امیر خسرو پر ایک مبسوط اور ضخیم کتاب' امیر خسرو احوال و آثار' لکھی ہے۔ چونکہ ہندوستان میں امیر خسرو پر سب سے اول علامہ شبلی نے بیان خسرو لکھی تھی اور جو درویشانہ ادب کے تحت شائع ہوئی تھی اس لئے جو بھی امیر خسرو پر قلم اٹھاتا ہے اسے بیان خسرو سے مفر نہیں۔ڈاکٹر نورالحسن انصاری نے بھی چند جملوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔اور لکھا ہے کہ'' علامہ شبلی نے خسرو کی غزلیہ شاعری کا سب سے پہلے اور سب سے عمدہ تجزیہ کیا ہے۔میرے خیال میں خسرو کے سبک پر اس سے زیادہ کچھ اور نہیں لکھا جا سکتا۔''

(امیر خسرو احوال وآثار، ص:۸)

---

(۱۵۷)

ڈاکٹر عابد رضا بیدار

[پ:۴؍فروری۱۹۳۴ء]

ڈاکٹر عابد رضا بیدار صاحب اردو کے ممتاز اہل قلم اور ادیب ونقاد اور شاعر ہیں۔ان کے قلم سے کئی اہم کتابیں نکل چکی ہیں، لیکن ان کا بڑا کارنامہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کی ڈائرکٹر شپ کے زمانہ میں کتب ورسائل کی ترتیب وتدوین اور اشاعت ہے۔اس لحاظ سے انھوں نے علم و ادب کی جو بیش بہا خدمات انجام دیں وہ بے مثل ہیں اور ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔خاص طور پر قدیم ادبی رسائل کی دریافت اور ان کی مع اشاریہ اور ضروری حواشی کے اشاعت لازوال کارنامہ ہے۔

بیدار صاحب کی ایک کتاب جس کا نام ''نثر کا حسن میرے عہد کے صاحب طرز نثر نگار'' ہے۔جس میں اردو کے صاحب طرز ادیبوں کا احوال اور تذکرہ ہے اور ان کی نثر کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔اس کے دیباچہ میں علامہ شبلی کا ذکر ان لوگوں میں کیا گیا ہے جو صاحب طرز نہیں ہیں۔ان کے الفاظ یہ ہیں ''شبلی کی شگفتہ نثر کی کچھ اپنی خصوصیات ضرور ہیں لیکن ہمیشہ وہ پہچان میں بھی آجائیں یہ ضروری نہیں۔'' (نثر کا حسن، ص:چھ)

سرسید تقریبات کے تحت ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے علامہ شبلی کی فارسی غزلوں کا مجموعہ ''غزلیات شبلی'' کے نام سے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا۔اس کے حرفے چند میں لکھتے ہیں:

> ''غزلوں کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ جب کبھی عہد اخیر میں ہندوستان میں فارسی زبان کے ان اہم ترین غزل گویوں کی بات چھڑے گی جو ایران میں بھی لطف وانبساط کے ساتھ پڑھے جاسکیں اور وہی مسرت وبصیرت بخش سکیں تو اس اٹوٹ تثلیث غالب، شبلی اور اقبال کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا۔''

ایک بات یہ کہہ دینی ضروری ہے کہ غزلوں کے علاوہ شبلی نے قصیدے

بھی لکھے، مثنویاں بھی، قطعے بھی، رباعیاں بھی، لیکن سب کچھ دیوان کی ہیئت مکمل کرنے کے لئے، کچھ ضرورت وقت کے لئے، کچھ بہ پاس خاطر دوستاں، کچھ یوں کچھ یوں، مگر دل کی باتیں، دل کی زبان میں انھوں نے صرف غزل میں کہی ہیں، جس میں ان کی شاعری کا نقطہ عروج مل جاتا ہے۔ بلکہ صاف صاف یہ کیوں نہ کہیں کہ شبلی نے اگر فارسی میں شاعری کی ہے تو بس غزلوں ہی میں۔''

(غزلیات شبلی، ص:۴)

علامہ شبلی کی ادبی صحافت پر ان کا ایک عمدہ مقالہ ماہنامہ الندوہ کے حوالہ سے ادیب کے شبلی نمبر میں شامل ہے۔ اب تو اس موضوع پر کئی مقالے شائع ہو گئے ہیں، لیکن جب یہ لکھا گیا تھا اپنے موضوع پر انوکھا مقالہ تھا۔ بیدار صاحب نے اشاریہ معارف کی جانب سب سے اول کوشش کی۔ اس کے مقدمہ میں ڈاکٹر بیدار صاحب لکھتے ہیں:

''دار المصنفین مولانا شبلی کی تخلیق تھی، جس کا نقشہ ۱۴ء کے مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال میں انہوں نے شائع کرایا تھا۔ لیکن اس کی تشکیل اور پھر پرورش ان کے جانشین اور شاگرد رشید سید سلیمان ندوی کی زیر قیادت ندوی فاضلوں کی ایک منتخب جماعت کے ہاتھوں ہوئی۔ مسعود علی ندوی، عبد السلام ندوی، سعید انصاری محمد عزیر (ایک غیر ندوی ۹ ریاست علی ندوی، عبد الماجد دریابادی (ایک اور غیر ندوی) نجیب اشرف ندوی، سید ابوظفر ندوی، عبد الباری ندوی، حاجی معین الدین ندوی، ابوالجلال ندوی، ابوالحسنات ندوی، شاہ معین الدین ندوی، محمد اویس نگرامی ندوی، مجیب اللہ ندوی، دار المصنفین کے مختلف زمانوں کے ممتاز نام ہیں اور اخیر عہد میں ایک نام مزید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے۔''

(معارف کا اشاریہ، ص:۱۔۲)

اس مقدمہ میں معارف سے متعلق علامہ شبلی کی یادداشت بھی شامل کی گئی ہے۔ اسے یہاں اس غرض سے نقل کیا جاتا ہے کہ معارف کے مدیروں کو یاد رہنا چاہئے کہ معارف کے اجرا کے پس پشت اس کے موسس کے کیا مقاصد تھے۔

ا۔نام	:	معارف ہوگا۔
۲۔چیف ایڈیٹر	:	مولانا شبلی
اسٹاف	:	مولوی سلیمان، مولوی عبدالماجد، مسٹر حفیظ، مولوی عبدالسلام
۳۔تعداد صفحات، تقطیع و کاغذ		۲۰+۲۹ صفحات ۴۰، قیمت ہے/
تنوعات مضامین	:	فلسفہ، تاریخ قدیم، جدید، سائنس
ادبیات	:	شعر، اردو شاعری کی تاریخ اور اسالیب متنوعہ
اقتباسات	:	مجلّات علمیہ، یورپ اور مصر و بیروت
فن تعلیم	:	کتب نادرہ کا ذکر اور ان کے اقتباسات یا ان پر اظہار رائے
تنقید	:	کتب یا علوم قدیمہ پر

مصر سے المقتطف، الہلال، المنار اور بیروت سے المقتبس منگوائے جائیں بہ قیمت المقتطف کو خط لکھنا کہ .... جو بھیجے گئے تھے اس حساب میں المقتطف جاری کر دیں۔

یورپ کے علمی پرچے منگوائے جائیں۔ (معارف کا اشاریہ، ص:۳-۴)

انہی بنیادوں پر ماہنامہ معارف جولائی ۱۹۱۶ء میں جاری ہوا اور انہی صلاحیتوں کو ڈاکٹر عابد بیدار نے مولانا سید سلیمان ندوی کی شخصیت میں تلاش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''سید صاحب شبلی کے پروردہ تھے۔ اور ندوہ کے فاضل، الندوہ جیسے اعلیٰ علمی پرچہ کی مددگار ادارت کا تجربہ تھا، اس کے بعد مولانا ابوالکلام کے الہلال میں بھی چند مہینے کام کر چکے تھے، عربی، فارسی، اور اردو کے علوم و ادبیات کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ سے بھی ضروری واقفیت تھی۔ اور مغربی زبانوں سے اپنا مطلب اخذ کرنے کی صلاحیت تھی۔ علمی مذاق بھی تھا اور ادبی ذوق بھی۔''
>
> (معارف کا اشاریہ، ص:۵-۶)

(۱۵۸)

ڈاکٹر خلیق انجم

[۱۹۳۵-۲۰۱۶ء]

انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری مرحوم ڈاکٹر خلیق انجم کا شمار ہمارے عہد کے نامور اہل قلم، محقق، مصنف، نقاد اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ بلا شبہ انھوں نے پوری زندگی اردو ادب کی خدمت کی۔ ان کے قلم سے مختلف موضوعات پر تقریباً ۸۰ر کتابیں نکلیں اور شائع ہوئیں۔ کئی رسائل کے وہ برسوں مدیر رہے۔ متنوع موضوعات پر سیکڑوں مقالے لکھے۔ متعدد کتابیں ایڈٹ کر کے شائع کرائیں۔ ان میں غالب کے خطوط اور آثار الصنادید بھی شامل ہیں۔ ان کی ترتیب و تدوین میں انھوں نے جو کاوش کی ہے اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے وہ علامہ شبلی اور مولوی عبد الحق کے جانشین تھے۔ غالباً اسی وجہ سے انھوں نے انجمن کی طرف سے ان پر سمینار منعقد کیے۔ علامہ شبلی پر انجمن کا سمینار ۱۹۹۵ء میں منعقد ہوا تھا جس میں ملک کے تقریباً تمام نامور اہل قلم شریک ہوئے تھے۔ انجمن نے ان مقالات کا انتخاب "شبلی کی علمی و ادبی خدمات" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ اس کا دیباچہ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

> "۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد ظہور میں آنے والے علمی اور ادبی منظر نامہ میں علامہ شبلی نعمانی کی بہت نمایاں اور ممتاز شخصیت تھی۔
>
> کثیر الجہات شخصیت کے حامل اس عالم کو عربی و فارسی پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ وہ ان دونوں میں بے تکلف نظم و نثر لکھنے پر قادر تھے۔ فرانسیسی زبان میں بھی انھیں تھوڑی بہت شد بد حاصل تھی۔ اردو تو خیر ان کی مادری زبان ہی تھی۔" (شبلی کی علمی و ادبی خدمات، ص:۹)

اس کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے علامہ شبلی کی تعلیم، اس میں مہارت اور ان کے اساتذہ کا ذکر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے مولانا عبد الحی فرنگی محلی کو بھی ان کا استاذ لکھا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں

ہے۔ پھر انھوں نے ایم اے او کالج علی گڑھ سے وابستگی، سر سید سے تعلق اور افادہ واستفادہ کی تفصیل لکھی ہے۔ بعد ازاں علامہ شبلی کے ذوق مطالعہ و کتب بینی پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ

> ''سر سید کا کتب خانہ بہت اچھا تھا جس میں مختلف زبانوں اور خاص طور سے عربی اور فارسی کی نایات اور نادر کتابیں تھیں، تاریخ جغرافیہ اور عربی کی بہت سی کتابیں ایسی تھیں جو جرمنی میں چھپی تھیں اور ہندوستانی علما جن کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ جب سر سید کو معلوم ہوا کہ شبلی کو مطالعہ کا بہت شوق ہے تو انھوں نے شبلی کو اپنی لائبریری سے استفادے کی اجازت دے دی، کہتے ہیں کہ شبلی کا بیشتر وقت اس لائبریری کی کتابوں کے مطالعہ کرنے میں صرف ہوتا۔ جب سر سید کا انتقال ہوا تو کتب خانہ کی چابی شبلی کے پاس تھی۔'' (ایضا،ص:۱۰)

سر سید احمد خاں کے بعد علامہ شبلی پروفیسر آرنلڈ سے متاثر ہوئے۔ تاریخ اور جدید علوم اور سائنٹفک انداز تحقیق علامہ شبلی نے انھیں سے سیکھا۔ سیرۃ نبوی پر بدء الاسلام سر سید کی فرمائش پر لکھی جو عرصہ تک کالج کے نصاب میں شامل رہی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ تمام تفصیلات پیش کرنے کے بعد علامہ شبلی کی ادبی تحقیق و تنقید اور شعر العجم پر اظہار کیا ہے اور یہاں تک لکھا ہے کہ

> ''اس کتاب میں ادبی تحقیق کے اعلا ترین نمونے موجود ہیں اور مختلف مقامات پر شبلی نے اپنے تنقیدی نظریات بیان کیے ہیں۔ اگر ان تمام نظریات کو شعر العجم سے نکال کر ایک علاحدہ کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا جائے تو یہ کتاب مولانا الطاف حسین حالی کی مقدمہ شعر و شاعری سے زیادہ بہتر ثابت ہوگی۔ شبلی کی موازنہ انیس و دبیر آج بھی عملی تنقید کا بہترین نمونہ ہے۔ شبلی کی تنقیدی تحریریں اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ان کی تنقیدی بصیرت میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی سے زیادہ توانائی، گہرائی اور گیرائی ہے۔'' (ایضا،ص:۱۱)

۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے روم و مصر و شام کا سفر کیا۔ وہاں کتب خانوں کا جائزہ لیا۔ مطالعہ کیا، نوٹس لئے، اسکول، کالج اور مدارس کا معائنہ کیا۔ تعلیم، طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم کو خاص طور پر دیکھا اور سفرنامہ روم و مصر و شام میں اس کی تفصیل سپرد قلم کی۔ سفرنامے کے لحاظ سے اس

میں بعض کمیاں ضرور رہیں، مگر تعلیمی اور علمی لحاظ سے یہ ایک منفرد سفر نامہ ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ تمام تفصیلات پیش کرنے کے بعد اسے تاریخ اور ادب کا قابل قدر سرمایہ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ

"شام و روم کے اس سفر نے شبلی میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا، انھوں نے جن چیزوں کے بارے میں پڑھا یا سنا تھا اب انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مغربی ممالک مسلمانوں سے صدیوں پہلے کے واقعات کا جس طرح انتقام لے رہے تھے اس کا شبلی کو بہت افسوس ہوا، انھوں نے ترکوں اور عربوں کے تعلیمی نظام کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہونچے کہ اگر یہی نصاب اور طریقہ تعلیم جاری رہا تو مسلم قومیں کبھی سر نہ اٹھا سکیں گی۔

انھیں اس سفر کے دوران جو احساس ہوا اور انھوں نے جو فیصلہ کیا اس کی عملی شکل ندوۃ العلما میں نظر آئی۔" (ایضاً، ص:۱۲)

ڈاکٹر خلیق انجم نے سر سید اور شبلی کے تعلقات اور دونوں کے خیالات کی بھی وضاحت کی ہے۔ وہ علامہ شبلی کی علی گڑھ کالج سے وابستگی کو ان کی خوش نصیبی سے تعبیر کرتے ہیں اور پھر اسی کو ان کی بد نصیبی کا سبب بھی قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ علامہ شبلی سر سید سے بہت متاثر تھے اور ان کی بہت سی خوبیوں کے معترف بھی تھے، مگر سیاست اور تعلیم میں ان سے اختلاف تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"شبلی کا یہ خیال بالکل صحیح تھا، سر سید کی جدید تعلیم نے نوجوانوں کو مذہب، تہذیب اور تاریخ سے بالکل بے بہرہ کر دیا تھا۔ شبلی کا عقیدہ تھا کہ نوجوانوں کو ایسے نصاب کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ جدید اور قدیم دونوں انداز کی تعلیم دی جا سکے۔"

(ایضاً، ص:۱۳)

علامہ شبلی نے قدیم صالح اور جدید نافع کے حصول کا نظریہ پیش کیا اور وہ اسی پر کار بند رہے، مگر ان کے اس نقطہ نظر سے اختلاف کیا گیا اور قدیم و جدید دونوں مکتبہ فکر کی طرف سے اعتراضات ہوئے۔ ڈاکٹر خلیق انجم اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شبلی جدید و قدیم اور علی گڑھ و ندوۃ العلما کے طرف داروں کے تعصبات کا شکار

ہو گئے۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے غالبًا پہلی بار شبلی کو سرسید کا ترجمان ثابت کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے بحث و مباحثہ کے دروازے کھل گئے اور بہت سے ادیبوں نے اس آگ کو ہوا دی جن میں مولانا سید سلیمان ندوی، شیخ اکرام، اقبال احمد سہیل، مولانا عبدالسلام، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولوی بشیر الدین وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شبلی کے موافقین اور مخالفین دونوں نے ان کی علمی، مذہبی اور ادبی فتوحات کا منصفانہ جائزہ لینے کے بجائے مشرق و مغرب، علی گڑھ اور ندوہ، سرسید اور شبلی کے اختلافات جیسے موضوعات پر تفصیل سے بحث کی اور ایک دوسرے پر الزام تراشی اور الزامات کے جواب دینے پر اپنی تمام صلاحیتوں اور شبلی کی عظمت کو قربان کر دیا۔'' (ایضاً ص:۱۳۰)

ڈاکٹر خلیق انجم نے تنقید شعر العجم کو منفی تحقیق اور منفی تنقید کا نمونہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ

''مولوی عبدالحق حالی کے مداح بلکہ معتقد تھے، حالی اور شبلی میں اختلافات تھے۔ مولوی صاحب نے حالی کی حمایت کا یہ طریقہ نکالا کہ حافظ محمود شیرانی سے شبلی کی شعر العجم پر مضامین لکھوائے جو اردو میں منفی تحقیق اور منفی تنقید کا پہلا نمونہ تھے۔ یہ مضامین پہلے تو انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ اردو میں شائع کیے گئے اور پھر انھیں کتابی صورت میں چھاپا گیا، ان مضامین نے وقتی طور پر شبلی کے ادبی مرتبے کو متاثر کیا۔'' (ایضاً ص:۱۳۰)

ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ رائے کہ حالی و شبلی میں اختلافات تھے، درست نہیں۔ علامہ شبلی نے حیات جاوید پر تنقید مولانا حالی سے اختلاف کی بنیاد پر نہیں کی تھی بلکہ اس میں سرسید کی کھنچی ہوئی تصویر انھیں پسند نہ تھی۔ حالی و شبلی میں آخر تک اچھے تعلقات استوار رہے اور خط و کتابت بھی رہی۔

علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کے بعض خیالات پر جو تنقیدیں ہوئیں اور جو اعتراضات ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم نے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ مولوی عبدالحق کے مقدمہ خطوط شبلی کو جارحانہ رویہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح ان پر ذاتی حملوں کو شر پسندی سے تعبیر کیا ہے اور علامہ شبلی کی عصری معنویت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"شبلی اور ان کے معاصر مخالفین کو گذرے مدت ہو چکی ہے۔ اب آہستہ آہستہ شبلی کی عظمت کا احساس عام ہونے لگا ہے، نئی نسل شبلی کو ان کے معاصرین کے بیانات کی روشنی میں سمجھنے کے بجائے خود ان کی تصنیفات اور ان کے علمی اور ادبی کارناموں کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے، اس لئے شبلی کی علمیت، عقل پسندی، روشن فکری، آزاد خیالی، وسعت نظر اور دانشوری کا اعتراف عام ہوتا جا رہا ہے۔ پروفیسر عالم خوندمیری کا یہ خیال قابل غور ہے کہ شبلی ہماری تہذیبی میراث کا حصہ بن گئے ہیں۔ شبلی کے ایک وارث ابوالکلام آزاد ہیں اور دوسرے وارث علامہ اقبال۔...... شبلی نے صرف آزاد اور اقبال ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ ان کی تصنیفات نے کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی ہے۔" (ایضاً، ص:۱۴)

علامہ شبلی کی سیاسی فکر سرسید سے قدرے مختلف تھی اور وہ سرسید کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تھی اور سرسید کی وفات کے بعد بلکہ اخیر تک قائم رہی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے دیباچے میں اس پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"شبلی کی شخصیت کا ایک حیرت انگیز پہلو یہ تھا کہ وہ خاصی مدت تک اس علی گڑھ میں رہے جو برطانوی حکومت کا پرستار تھا، ان سرسید کے ساتھ رہے جو انگریزوں کو اپنی قوم کا نجات دہندہ سمجھتے تھے اور کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کے سخت خلاف تھے، اس سب کے باوجود شبلی پہلے ہندوستانی عالم ہیں جنھوں نے انگریزوں کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت اور ہندوستان کی آزادی کے حق میں تھے۔ اس کا پورا امکان ہے کہ جنگ آزادی کے سب سے بڑے مسلم مجاہد مولانا ابوالکلام آزاد کو یہ راستہ شبلی کے انداز فکر ہی نے دکھایا ہو، لیکن یہ امر تحقیق طلب ہے۔" (ایضاً، ص:۱۴-۱۵)

بعض اور لوگوں کا بھی یہی خیال ہے کہ مولانا آزاد علامہ شبلی کی سیاسی فکر سے متاثر تھے۔

گذشتہ صفحات میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے تھے اور ڈھائی برس تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ اس کی بنیاد انھیں نے مستحکم کی تھی، لیکن اسی

انجمن سے ان کی شخصیت اور خدمات پر دو بڑے حملے ہوئے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی سکریٹری شپ کے زمانہ میں پہلے شعرالعجم کی تنقید مسلسل پانچ برس تک رسالہ اردو میں شائع کی۔ پھر اسے کتابی صورت میں شائع کیا اور یہ سب انہوں نے تحقیق کے نام پر کیا۔

دوسرا حملہ ''خطوط شبلی'' میں مولوی عبدالحق کا مقدمہ ہے جس میں انھوں نے عطیہ فیضی کے حوالہ سے علامہ کی ذات کو مطعون کیا ہے۔ چنانچہ ۶۲/ برس بعد انجمن کے نائب صدر سید شہاب الدین دسنوی نے بابائے اردو اور اس قبیل کے دوسرے معترضین شبلی کا مدلل جواب لکھا، جسے انجمن ترقی اردو ہند ہی نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ انجمن پر یہ بہت بڑا فرض تھا جسے اس نے ادا کیا۔ اس کتاب پر انجمن کے سکریٹری کی حیثیت سے ڈاکٹر خلیق انجم نے مقدمہ لکھا ہے۔ اس کا ایک ذیلی عنوان ''شبلی کی حمایت میں'' ہے۔ یہ مقدمہ کئی معنوں میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مذکورہ بالا تفصیلات پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے کہ

> ''اگر شبلی پر الزامات کی ابتدا انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری مولوی عبدالحق نے کی تھی تو آج انجمن کے نائب صدر جناب سید شہاب الدین دسنوی ان الزامات کی مدلل تردید کر رہے ہیں۔ اگر مولوی عبدالحق تنقید شعرالعجم کے محرک ہوئے تھے تو آج دسنوی صاحب ایک پوری کتاب چھاپ کر ان الزامات کو بے بنیاد ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ عام طور پر معاصرانہ چشمکیں اور ان کی تلخیاں متعلقہ ادیب اور شاعر کی زندگی ہی تک رہتی ہیں لیکن بعض مظلوم اور بدنصیب ادیب ایسے بھی ہیں جن پر اپنے عہد کی مخالفتوں اور چشمکوں کی پرچھائیاں آج تک موجود ہیں۔ ایسے ادیبوں میں علامہ شبلی کا نام سرفہرست ہے۔''
>
> (شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں ص:۸، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۸۷ء)

اس تصریح کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے علامہ شبلی کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے اور ان پر کیچڑ اچھالنے کو قابل مذمت قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''شبلی عالم دین تھے۔ الفاروق، سیرۃ النبیؐ جیسے غیر فانی مذہبی شاہکاروں کے مؤلف تھے۔ فارسی اور اردو کے بہت بڑے اسکالر، ادیب اور نقاد تھے۔ موازنہ

انیس و دبیر کا شمار بہترین تنقیدی تحریروں میں ہوتا ہے۔ شعر العجم تمام تر کوتاہیوں کے باوجود اپنے موضوع پر واحد کتاب ہے۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ ہو چکا ہے اور اہل ایران اسے قابل قدر ادبی کارنامہ سمجھتے ہیں۔ علامہ شبلی جیسی قد آور شخصیت پر کیچڑ اچھالنا قابل مذمت ہے۔'' (ایضاً ص:۸)

ڈاکٹر خلیق انجم نے شبلی شکنی میں ملوث مولوی عبدالحق، شیخ محمد اکرام اور ڈاکٹر وحید قریشی کی تحریروں اور کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

''ان حضرات نے علامہ کے بارے میں ایسی بے بنیاد، لغو اور مہمل باتیں کیں جو ہم عام آدمی کے بارے میں بھی کہنے سے پہلے کئی بار سوچیں گے۔ ان حضرات کی کتابوں سے ایک ایسی فضا بن گئی کہ تمام اہل اردو علامہ اور عطیہ کے تعلقات کو اسی روشنی میں دیکھنے لگے۔'' (ایضاً ص:۹)

ڈاکٹر خلیق انجم کو علامہ شبلی کے حامیوں، قدر دانوں اور شاگردوں سے شکوہ ہے کہ انھوں نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ لکھتے ہیں:

''شبلی کے حامیوں، قدر دانوں، معتقدوں اور شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ نہ جانے کیوں ان لوگوں نے الزامات کے تردید کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مقالوں میں تو کہیں کہیں صفائی پیش کی گئی ہے لیکن مدلل طریقہ سے کوئی معقول کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ سعادت میرے محترم سید شہاب الدین دسنوی کو نصیب ہوئی۔'' (ایضاً ص:۹)

ڈاکٹر خلیق انجم نے علامہ شبلی کے سیاسی شعور، بالغ نظری اور ان کی دانشوری پر اظہار خیال کیا ہے۔ تعلیم نسواں اور ان کی تربیت اور ان کے مرتبہ کی تعیین کے سلسلے میں علامہ شبلی کے خیالات کا تجزیہ کیا ہے۔ عطیہ کی ذہانت، دراکی اور تیزی وغیرہ بیان کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس خصوصیت کی وجہ سے نہ صرف علامہ شبلی بلکہ علامہ اقبال اور دیگر شخصیات کو انھوں نے متوجہ کیا۔ پھر علامہ شبلی پر گھناؤنے الزامات پر اظہار افسوس کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ

''مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اپنے محترم سید شہاب الدین دسنوی کی اس کتاب کا

مسودہ پڑھنے سے پہلے میرے ذہن میں شبلی کی وہی تصویر تھی جو شیخ اکرام اور ڈاکٹر وحید قریشی نے پیش کی تھی۔ دسنوی صاحب کی دلیلوں نے مجھے اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر دیا۔ شبلی کی حمایت میں یہ پہلی معقول مکمل اور مدلل کتاب ہے، اس لئے مجھے یقین ہے کہ اب شبلی جیسے مظلوم انسان کے ساتھ انصاف ہوگا۔'' (ایضاً ص ۱۰)

ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ چند صفحے کا پیش لفظ اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ کسی مقالہ سے کم نہیں۔

سید شہاب الدین دسنوی کی یہ کتاب واقعی بہت عمدہ اور اپنے موضوع پر ایک اہم کاوش ہے۔ اس سے پہلے اس موضوع پر سب سے عمدہ تحقیقی بلکہ معرکۃ الآرا مقالہ ڈاکٹر ابن فرید نے لکھا تھا جس کا عنوان ''شبلی چوں بہ خلوت می رود'' ہے۔ یہ مقالہ ادیب علی گڑھ کے شبلی نمبر میں ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ایسا مدلل اور مسکت تھا کہ شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب ''شبلی نامہ'' میں حک و اضافہ کر کے اس کا نام ''یادگار شبلی'' کر دیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی [۱۹۲۵-۲۰۰۹ء] نے ڈاکٹر ابن فرید کو خط لکھ کر اعتراف کیا اور اپنی ہی کتاب کو کتب خانوں سے غائب کرا دیا۔ بابائے اردو نے بھی ایک خط کے جواب میں علامہ شبلی کی مخالفت کی تردید کی ہے۔ باوجود اس کے اب بھی بعض نافہم اس کو دہراتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے کے این پنڈت کی کتاب ''حافظ کی شاعری'' پر جو مقدمہ لکھا ہے اس میں صراحت کی ہے کہ

> ''علامہ شبلی نے شعر العجم کے دوسرے حصے میں حافظ کے جو حالات زندگی لکھے تھے، ان میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکا۔ محققین اور ناقدین گھما پھرا کر وہی باتیں کہتے رہے جو علامہ شبلی نے کہی تھیں۔'' (حافظ کی شاعری، ص:۲)

نامور محقق و مصنف ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری کی کتاب ''اردو کی ترقی میں مولانا آزاد کا حصہ'' کا حرف آغاز ڈاکٹر خلیق انجم کے قلم سے ہے۔ چونکہ اس میں کثرت سے انجمن ترقی اردو کا ذکر آیا ہے اور انجمن ترقی اردو کے موجودہ جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم تھے، اس لئے بہتر تھا کہ حرف آغاز ان کے قلم سے ہوتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو انجمن ترقی اردو سے علامہ شبلی نے

وابستہ کیا تھا جو انجمن ترقی ارد و کے پہلے سکریٹری تھے۔ڈاکٹر خلیق انجم نے علامہ شبلی کی ان نوازشوں کا ذکر کیا ہے جو علامہ شبلی نے مولانا آزاد سے متاثر ہو کر کی تھیں۔

(اردو کی ترقی میں مولانا آزاد کا حصہ،ص:۹،۱۰،۱۱)

---

(۱۵۹)

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی

[پ:۱۴ر مئی ۱۹۳۵ء]

ندوۃ العلماء کے مہتمم مولانا سعید الرحمٰن اعظمی نے ''علامہ شبلی اور ندوۃ العلماء'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے۔وہ اگر چہ موضوع کا حق ادا نہیں کرتا تاہم مولانا مدظلہ علامہ شبلی کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی فکر و نظر کے بڑے قائل ہیں۔''مطالعہ تصنیفات علامہ شبلی نعمانی'' میں ان کی بھی تقدیم شامل ہے۔انھوں نے علامہ شبلی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''وہ روشن دماغ اور روشن ضمیر تھے،وہ اپنی تابناک زندگی میں یکتائے روزگار تھے،وہ وسیع الخیال،دوراندیش اور ایک شاداب فکر کے نمائندے تھے۔وہ قدیم و جدید تقاضوں سے پوری طرح آشنا تھے۔وہ اپنے عصر کے ممتاز عالم و مورخ اور ادیب تھے۔وہ جس موضوع پر لکھتے اس کا حق ادا کردیتے اور ایسے نت نئے گوشوں کو عالم آشکارا کرتے کہ بڑے بڑے مورخین،اہل علم و دانش اور سنجیدہ فکر کے حامل حضرات بھی ششدر رہ جاتے اور ان کا علمی لوہا مانتے اور ان کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوتے۔'' (مطالعہ تصنیفات علامہ شبلی نعمانی،تقدیم،ص:۹)

علامہ شبلی تحریک ندوہ کے آغاز ہی سے اس سے وابستہ ہو گئے تھے۔اور اس کی بڑی خدمات انجام دیں۔اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سعید الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

> ''علامہ شبلی ندوۃ العلما کے اولین معماروں میں ہیں،انھوں نے اپنے خون جگر سے اس علمی و فکری ادارہ کو سینچا اور اوج ثریا پر پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

یہی وجہ ہے کہ ندوۃ العلما کے اولین معتمد تعلیم قرار پائے اور ان کے تعلیمی تجربات سے ندوۃ العلما کو بہت فائدہ پہونچا، اس وقت ندوۃ العلما میں ان کی کئی یادگاریں ہیں جن میں رواق شبلی، رواق شبلی نعمانی اور کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی ہے۔"

(ایضاً ص:۹-۱۰)

علامہ شبلی ندوہ کے معتمد تعلیم تھے، مگر انھوں نے ہر طرح سے خدمت کی۔ بیگم بھوپال سے مل کر ایک رقم منظور کرائی۔ پھر ریاست بہاول پور سے اس زمانہ میں پچاس ہزار کی بڑی رقم حاصل کی۔ حکومت سے ندوہ کے لئے زمین حاصل کی۔ اس کا نقشہ ایک بڑے مسلمان نقشہ نویس سے تیار کرایا اور تعمیرات کا آغاز کیا اور ایک دن خود مزدوروں کی طرح طلبہ کے ساتھ کام کیا اور اس کی کامیابی کے لئے رو رو کر دعائیں مانگیں۔ (معارف سلیمان نمبر، ص:۵۴)

علامہ شبلی کو ابتدائے زمانہ سے کتابوں کے مطالعہ اور ان کو جمع کرنے کا شوق تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس نوادر کتب اور مصادر کتب کا ایک بڑا عمدہ ذخیرہ تھا جسے انھوں نے ندوہ پر وقف کردیا۔ پھر اپنے احباب نواب سید علی حسن خاں، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی اور پٹنہ کے بعض رئیسوں کے کتب خانے ندوہ پر وقف کرائے اور دراصل ندوہ کا کتب خانہ انھیں کی محنتوں ثمرہ ہے۔ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی نے ان باتوں کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے اور شاید یہ اس کا موقع بھی نہیں تھا۔

علامہ شبلی جس طرح ایک بڑے مصنف تھے، اسی طرح ایک بڑے خطیب بھی تھے۔ ان کے خطبات کا ایک مجموعہ دار المصنفین سے شائع ہو چکا ہے۔ نو دریافت خطبات راقم کی مرتبہ کتاب "خطبات شبلی نو دریافت" میں ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی صاحب نے علامہ شبلی کی متنوع خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"علامہ شبلی نعمانی میدان تقریر وتحریر کے شہسوار تھے، بلکہ صاحب اسلوب ادیب اور مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں علمی اور تحقیقی رنگ غالب ہے، جن میں اکثر وبیشتر حالات وتقاضے کے پیش نظر لکھی گئی ہیں، اس لئے ان میں نہ صرف مقصدیت کی روح نمایاں ہے بلکہ مخالفین کے اعتراضات کو مثبت اور معقول

انداز میں رد کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے، بالکل اسی طرح علامہ عبدالحی حسنی جو علامہ شبلی کے نہ صرف معاصر بلکہ ندوۃ العلما کے رموز ہیں ان کی رہنمائی بھی علامہ شبلی کے لئے مشعل راہ تھی۔'' (ایضاً،ص:۱۰)

مولانا سید عبدالحی حسنی بلا شبہ بڑے عالم ومورخ تھے۔ علمی و تصنیفی معاملات میں ان کا علامہ شبلی کی رہنمائی کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس کے برعکس خود علامہ شبلی نے ان کی رہنمائی کی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ نزہۃ الخواطر ہے۔ اس کے لکھنے کا مشورہ انھیں علامہ شبلی نے دیا تھا۔ خود انھوں نے لکھا ہے کہ

''آج سے بیس برس پہلے میں نے عربی میں ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا جس میں ہندوستان کے عربی شاعروں کے حالات اور ان کے عربی اشعار اس طور پر درج کیے تھے جیسے کہ علامہ آزاد نے سرو آزاد و یدِ بیضا وغیرہ تذکروں میں فارسی شعرا کے حالات یکجا کیے ہیں۔ مولانا شبلی کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ علمائے ہندوستان کے حالات میں اب تک کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی ہے، لہٰذا اس موضوع کو زیادہ وسیع کردینا چاہئے، مجھ کو یہ مشورہ مولانا ممدوح کا پسند آیا۔'' (ماہنامہ الندوہ لکھنؤ، اپریل ۱۹۱۵ء، بحوالہ افکار وشخصیات، ص:۱۱۳)

---

(۱۶۰)

شمس الرحمٰن فاروقی

[۱۹۳۵-۲۰۲۰ء]

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی عہد حاضر کے سب سے بڑے نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ گو ان کے دائرہ کار میں بڑا تنوع ہے، تاہم وہ اصلاً نقاد ہی ہیں۔ مختلف موضوعات پر دو درجن سے زیادہ ان کی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے علامہ شبلی پر کم لکھا ہے۔ چند مقالات میں ان کا ذکر ضرور ہے۔ خاص طور پر ''غالب پر چار تحریریں'' میں علامہ شبلی کا ذکر کثرت سے آیا ہے، مگر

مستقل مقالہ ان کے قلم سے غالباً ایک ہی نکلا ہے جو اردو ادب دہلی میں ''شبلی کی فارسی غزل'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ بہت پہلے غالباً ۱۹۵۸ء میں جب وہ شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ میں استاد تھے علامہ شبلی کی تنقید نگاری پر ایک مقالہ کالج میں شبلی ہفتہ تقریبات میں پڑھا تھا مگر وہ کہیں دستیاب نہیں۔ فاروقی صاحب مرحوم کو بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کہاں شائع ہوا تھا۔

فاروقی صاحب نے مولانا عبدالسلام ندوی سمینار کے مجموعہ مقالات پر دیباچہ لکھا ہے جسے تقریظ کے نام سے سمینار کے مجموعہ مقالات میں شامل کیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے مولانا عبدالسلام ندوی کے فکر وفن پر اظہار کیا ہے۔ اور مولانا عبدالسلام ندوی کے اسلوب بیان پر تبصرہ کیا ہے۔ چونکہ اس تجزیہ میں علامہ شبلی کا بھی خاصا اور خوب صورت ذکر ہے۔ اس لئے اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

> ''لوگ عام طور پر مولانا سید سلیمان ندوی کو علامہ شبلی کا ادبی اور علمی جانشین قرار دیتے ہیں اور یہ بات بالکل صحیح ہے لیکن علامہ شبلی کے نثری آہنگ کی سلاست، دل نشینی اور شگفتگی کو اگر کسی نے پوری طرح حاصل کیا تو وہ مولانا عبدالسلام ندوی تھے۔ یہ درست ہے کہ علامہ شبلی کی نثر میں جو بے مثال شعریت تھی وہ ادق باتوں میں بھی ایک لذت پیدا کر دیتی ہے، موضوع چاہے جتنا علمی اور فکری ہو شبلی کو پڑھنے والا کبھی اکتاتا نہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی نثر میں وہ شعریت نہیں ہے لیکن دل نشینی ویسی ہی ہے۔ شبلی کے یہاں ایک ہلکی سی شوخی ہے گویا کوئی شخص مسکرا کر بعض بے تکلف دوستوں سے بات کر رہا ہو۔ انداز یہاں بھی علمی ہے، لیکن باقاعدہ محفل کا نہیں بلکہ آپس کی بات چیت کا، اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی اور پھر علامہ شبلی کو پڑھئے تو دونوں طبیعتوں کا فرق نظر آئے گا لیکن دونوں کی افتاد ذہنی ایک سی ہے۔''
>
> (مولانا عبدالسلام ندوی کی دانشوری اور عصر حاضر، ص: ۹۔۱۰، بمبئی، ۲۰۰۹ء)

پروفیسر ظفر احمد صدیقی کی متنازعہ کتاب ''مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار'' اولاً مجلہ ترجمان الاسلام بنارس میں بالاقساط شائع ہوئی۔ بعد میں ۲۰۰۵ء میں اسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا

تو اس میں تقدیم وتقریظ کے طور پر کئی اہل علم اور علماء کی تحریریں بھی شامل کی گئیں۔ان میں ایک مفصل خط جو شمس الرحمٰن فاروقی نے مدیر مجلّہ ترجمان الاسلام مولانا نظام الدین اسیر ادروی کے نام لکھا تھا اسے شامل کیا گیا ہے۔اس خط میں انہوں نے پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے خیالات پر چند سوالات قائم کئے ہیں اور ظفر صاحب سے اختلاف کرنے والوں سے ان کے جوابات دینے کو کہا ہے۔حالانکہ اس سے متعلق کئی تحریریں اس وقت تک شائع ہو چکی تھیں جو شاید فاروقی صاحب کی نگاہ سے نہیں گذری تھیں۔لیکن خود فاروقی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت اہم ہے اور اسے شامل کرنے سے پہلے مصنف کو ان پر غور خوض کرنا چاہئے تھا۔بہر حال فاروقی صاحب کی وہ تحریر درج ذیل ہے:

''اگر ظفر احمد صدیقی نے علامہ شبلی کی بعض تحقیقات کے نتائج کو غلط قرار دیا، یا شبلی کی بعض کوتاہیوں سے ہم کو آگہ کیا تو اس میں کوئی برائی نہیں۔اگر ظفر صاحب کے اعتراضات درست ہیں تو ہمیں خوش ہونا چاہئے کہ ان کی مساعی کے ذریعہ حقیقت حال سامنے آئی۔اگر ظفر صاحب کی باتیں غلط ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم غلطیوں کی نشاندہی کریں اور ظفر صاحب کو ان غلط باتوں پر تنبیہ کریں۔ظفر احمد صدیقی کے ان مضامین سے علامہ شبلی کی عظمت بہر حال کم نہیں ہوتی۔تاریخ و سیرت ہو یا انشاء، شبلی جیسے بڑے لوگ عالم اسلام کیا تمام عالم میں کم ملیں گے۔ اس حقیقت کے سب معترف ہیں، اور یقین ہے کہ ظفر احمد صدیقی بھی اس کے معترف ہوں گے۔ مجھے ظفر صاحب سے کوئی شکایت ہے تو بس یہی کہ انہوں نے درازنفسی سے کام لیا ہے۔ورنہ ان کی بات اس سے کم میں بھی تمام ہو سکتی تھی۔'' (مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار، ص:۲۲)

ان کا خیال ہے کہ اعتراضات سے کسی کتاب کی حیثیت کم نہیں ہوتی۔بطور مثال انہوں نے لکھا ہے کہ

''خود مولانا شبلی کی شعر العجم ہمارے سامنے ہے۔حافظ محمود شیرانی مرحوم نے بے مثال علم، حافظ او تفحص کا ثبوت دیتے ہوئے ایک مستقل تصنیف ''تنقید شعر العجم''

کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کی۔حافظ صاحب مرحوم نے جتنے اغلاط شعرالعجم میں نکالے ہیں وہ سب درست ہیں لیکن شعرالعجم اب بھی مشرق و مغرب میں ایک غیر معمولی علمی کارنامے کی حیثیت سے مقبول ہے۔محمود شیرانی کی تنقید نے شعرالعجم کو کمزور نہیں کیا بلکہ خود شعرالعجم کا تتمہ بن کر رہ گئی۔" (ایضاً ص:۲۰)

اس طرح کی چند اور بھی مثالیں انہوں نے نقل کی ہیں۔اس کے برعکس دوسرے تقریظ نگاروں سے وہی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جن کو وہ علامہ کی تحریروں کا عیب بتاتے ہیں۔

۲۰۱۲ء میں ناچیز نے علامہ شبلی کے متفرق مکاتیب کا مجموعہ "مکتوبات شبلی" مرتب کیا۔ اس کے طبع اول میں ۲۱۰ رخطوط شامل تھے۔یہ میرا پہلا تدوینی کام تھا۔اس میں تلاش و جستجو سے جو کام لیا گیا ہے وہ اپنی جگہ، اصل کام تحقیق متن کا تھا۔ناچیز نے اس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، تاہم سہما ہوا تھا کہ خدا جانے محققین کا کیا رویہ ہو۔متعدد اہل علم کی خدمت میں مکتوبات شبلی پیش کی، ڈرتے ڈرتے فاروقی صاحب کی خدمت میں بھی بھیجی۔انہوں نے کئی ماہ بعد ایک مفصل خط لکھا اور تعریف و تحسین کے ساتھ اس کی ایک ایک کمیاں دکھائیں۔اس سے میرا حوصلہ ٹوٹا نہیں بلکہ جس شفقت و مروت سے انہوں نے اغلاط کی نشاندہی کی تھی اس سے بڑا حوصلہ ملا۔اور ناچیز کے عزم و ہمت میں مزید اضافہ ہوا۔وہ مفصل خط اس لائق ہے کہ ترتیب و تدوین کا کام کرنے والے ہر شخص کو ایک بار ضرور پڑھنا چاہئے۔اس لئے طوالت کے باوجود یہاں نقل کیا جاتا ہے:

برادرم الیاس الاعظمی، سلام علیکم۔

کچھ دن پہلے آپ کی کتاب "مکتوبات شبلی" ملی تھی، بہت خوشی ہوئی۔ شکریہ۔آپ اس زمانے کے چند لوگوں میں سے ہیں جو دل لگا کر کام کرتے ہیں۔علامہ مرحوم کے ان خطوط کی تدوین بھی آپ کے اچھے کاموں میں گنی جائے گی۔یہ ضرور ہے کہ اس کام میں بہتری کی مزید گنجائش ہے۔ایک تو یہ کہ عربی عبارتیں جو جگہ جگہ خطوط میں آئی ہیں ان کا ترجمہ دینا چاہئے تھا۔دوسری بات یہ کہ آپ نے جگہ جگہ مفصل حاشیے لکھے ہیں خاص کر رجال پر آپ نے بہت محنت کی ہے، لیکن کئی مقام ایسے آئے ہیں جہاں علامہ کے خط کے بین السطور پر بھی

آپ کو کلام کرنا چاہئے تھا۔ مثلاً یہ کہ حضرت مولانا محمد علی مونگیری کے نام پہلے ہی خط میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ علامہ اور مولانا مونگیری کے درمیان کچھ چھوٹی موٹی غلط فہمیاں یا آپسی شکایتیں بھی تھیں۔ چنانچہ مولانا مونگیری کے پہلے خط کا کچھ پس منظر آپ کو پہلے بیان کرنا چاہئے تھا۔ پھر یہ کہ ایک طرف تو آپ نے امام بخاری پر تقریباً پورا صفحہ لکھا اور دوسری طرف امام مسلم کے بارے میں جن کی صحیح کا حوالہ علامہ کے خط میں ہے ان پر آپ نے کوئی تفصیل نہیں لکھی۔ مولوی بشیر الدین کے نام خط میں صفحہ ۴۶ پر جو جملہ ہے ''ندوہ کی ہمدردی پر بعض حامیان کالج مجھ کو رقیبانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔'' اسی صفحے پر علامہ نے صاف صاف شکایتیں مولوی بشیر الدین کے طرز عمل کے خلاف کی ہیں لیکن آپ نے ان عبارتوں پر کوئی بھی توجہ نہیں کی۔ صفحہ ۸۷ پر علامہ نے لکھا ہے کہ ''آج کل پروفیسری کے لئے معقول تنخواہ پر بلایا ہے۔'' یہ اشارہ غالباً علی گڑھ کی طرف ہے۔ آپ نے اس پر کوئی تفصیل نہیں لکھی۔ اسی صفحے پر آپ نے ''اہل خانہ'' پر حاشیہ نمبر ۱۳ لگایا ہے اسے ۱۴ ہونا چاہئے تھا۔ اسی صفحے پر علامہ کے پاؤں کے حادثے کا ذکر ہے۔ مگر آپ نے اس پر کوئی نوٹ نہیں لگایا۔ صفحہ ۱۰۱ پر علامہ نے ''انجمن'' کو مذکر لکھا ہے، یہ صراحت ضروری تھی کہ اصل میں یوں ہی ہے۔ یعنی علامہ ''انجمن'' کو مذکر لکھتے تھے۔ اسماء رجال پر اتنی محنت کرنے کے باوجود آپ نے مولوی حمید الدین (صفحہ ۱۰۹) پر کوئی نوٹ نہیں دیا۔ اسی طرح عبدالحی کو ۱۰۸ صفحہ پر مع ہمزہ لکھا ہے۔ امید ہے یہ کتابت کی غلطی ہوگی۔ کیونکہ آپ کے حاشیے میں بھی (صفحہ ۱۱۰ اور صفحہ ۱۵۲) یوں ہی ہے۔ گمان گذر سکتا ہے کہ علامہ سے سہو قلم ہو گیا ہوگا۔ کتابت کی ایسی غلطی افسوس ناک ہے۔ اس صفحے پر مولانا عبدالحی کے نام جو خط ہے اس کو بھی حاشیے کی ضرورت تھی۔

صفحہ ۱۴۱ پر نواب سید علی حسن خاں کے خط میں علامہ لکھتے ہیں 'آپ حضرت عمرؓ کی طرح دریا سے ڈرتے ہیں۔' اس پر آپ نے کوئی حاشیہ نہیں دیا۔

مجھے بالکل نہیں معلوم کہ حضرت عمرؓ کے بارے میں اس اطلاع کا ماخذ کیا ہے۔

مولانا عبدالباری کے نام جو خط صفحہ ۱۶۲ پر ہے اس پر آپ کی طرف سے حاشیہ بہت ضروری تھا۔ اس خط کی تاریخی اور سوانحی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا (برسبیل تذکرہ، اس صفحے پر بھی عبدالحی جہاں جہاں لکھا ہے مع ہمزہ لکھا ہے)

صفحہ ۱۷۱ پر نظام المشایخ مع تحتانی لکھا ہے یہ آپ کا املا ہے یا علامہ کا؟ اسی خط میں یہ جملہ بالکل سمجھ میں نہیں آیا 'کیا آپ کچھ فیض انگیز یاد دلائیں گے'۔

صفحہ ۱۹۱ پر عربی عبارت حسب معمول بے ترجمہ ہے اور نسخ کے بجائے نستعلیق میں لکھی ہوئی ہے۔ صفحہ ۱۴۹ پر عربی کا شعر ہے، بے ترجمہ۔ صفحہ ۱۹۸ پر "گئے" کو "گیے" لکھا ہے۔ یہ کس کا املا ہے؟ علامہ کا؟ صفحہ ۲۰۵ پر عبدالوہاب بہاری پر جو حاشیہ ہے اس میں صرف وہی بات کہہ دی گئی ہے جو علامہ نے اپنے خط میں کہی ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود کتاب بہت کارآمد ہے۔ میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ دو چار دن ہوئے آپ کی ایک کتاب اور ملی ہے شکریہ۔ اس کی رسید الگ سے لکھوں گا، انشاءاللہ۔ آپ کا

شمس الرحمٰن فاروقی

۱۶ اپریل ۲۰۱۳ء

"مکتوبات شبلی" کی اشاعت کے بعد دوسری کتاب "علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط" شائع ہوئی۔ اس کے مقدمہ میں فارقی صاحب کا یہ خط نقل کرکے میں نے فاروقی صاحب کو یقین دلایا کہ آئندہ تحقیقات اور مکتوبات شبلی کے دوسرے ایڈیشن میں ان کے خیالات کا لحاظ بہر صورت رکھا جائے گا اور اس کتاب میں بڑی حد تک اس کا پاس ولحاظ رکھا گیا ہے۔

"علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط" کا انتساب فاروقی صاحب کے نام ہے۔ اس پر ان کی نظر پڑی تو انہوں نے کہا کہ اس سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔

۲۰۱۳ء میں ناچیز کی ضخیم کتاب آثار شبلی دارالمصنفین نے شائع کی تو مکتوبات شبلی پر تبصراتی

تحریر کے شکریہ کے ساتھ آثار شبلی ان کی خدمت میں بھیجی۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ

برادرم محمد الیاس الاعظمی سلام علیکم

آپ کے خط کا مجھے انتظار تھا کیونکہ میں نے بڑی محنت سے آپ کی کتاب پر اظہار خیال کیا تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں ای میل پہنچی ہی نہ ہو۔ آج کل یہ سب بھی ہونے لگا ہے۔ اب آپ کی ای میل سے طبیعت کو اطمینان ہوا۔ اور اس بات پر خوشی ہوئی کہ آپ نے میری معروضات کو قابل لحاظ جانا۔

''آثار شبلی'' مجھے کچھ دن ہوئے مل گئی تھی، مگر میں نے جواب اس لئے نہیں لکھا کہ یقین نہیں تھا کہ میری پچھلی ای میل آپ کو ملی کہ نہیں۔ ''آثار شبلی'' میں نے کم وبیش پوری پڑھ ڈالی۔ ایک آدھ لوگوں سے ذکر بھی آیا تو میں نے کہا کہ کتاب کیا ہے، شبلی پر معتبر اور محققانہ معلومات کا خزانہ ہے۔ آپ کا طرز تحریر مجھے ہمیشہ شگفتہ اور واضح معلوم ہوا جو بڑی بات ہے۔ شبلی کے مخالفین پر بھی آپ نے جگہ جگہ بہت متانت اور دیانت سے اظہار خیال کیا ہے۔

آپ کی کتاب چونکہ شبلی کے سوانح حیات پر مشتمل ہے، اس لئے اس میں علمی مباحث کی گنجائش زیادہ نہ تھی۔ لیکن بہتر تھا کہ بعض معاملات پر کچھ زیادہ بحث کی جاتی۔ مثلاً حافظ محمود شیرانی صاحب کے اعتراضات، مولانا اسلم جیراج پوری کے اعتراضات اور ہمارے زمانے میں ظفر احمد صدیقی صاحب کی بعض رائیں (خاص کر شبلی کی سیرت نگاری اور علم حدیث کے بارے میں) ان کا کچھ اور ذکر ہونا چاہئے تھا۔ یہ تو بالکل درست ہے کہ اسلم جیراج پوری کی کیا ہستی ہے۔ حافظ صاحب نے بھی لکھا ہے، اس سے ''شعر العجم'' کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ لیکن پھر بھی آپ کو تھوڑی سی مزید بحث کرنا ضروری تھی۔ خاص کر شبلی کے نظریۂ شعر اور نظریۂ تاریخ کے بارے میں آپ کو کچھ کلام کرنا تھا۔ سر سید نے ''الفاروق'' کے منصوبے پر کوئی خاص جوش ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس پر اور بعض دوسرے سید صاحبان کی شکایات پر بھی تھوڑی سی بحث کرتے تو خوب تھا۔

بعض باتیں بالکل نظر انداز ہوگئی ہیں۔ شاید مصلحت کا تقاضا تھا، لیکن حقیقی اور ایماندار سوانح نگار مصلحت کے اوپر بھی کچھ چیزوں کو اہمیت دیتا ہے۔ شبلی کی بیماریاں جو تقریباً اوائل عمر سے آخر تک رہیں، شبلی کی ازدواجی زندگی، شبلی کے حلقۂ احباب اور ان کا آپس میں ایک دوسرے پر اثر، خود شبلی کی پسند اور ناپسند، خاص کر لباس اور کھانے کے معاملے میں۔ موسیقی اور نغمے اور عوامی کھیل کود، میلوں تقریبوں وغیرہ میں شبلی کی دلچسپی پر آپ نے کچھ نہیں کہا۔ ندوے میں پہلی اسٹرائک کا کوئی ذکر نہیں، جس میں شاید مولانا عبدالسلام ندوی بھی شریک تھے۔ شبلی کے سیاسی خیالات اور کانگریس سے ان کی ہم خیالی اور وابستگی اس پر بھی آپ نے بہت سرسری گفتگو کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کی ''حیات شبلی'' میں جو کمیاں ہیں وہ کم وبیش یہاں بھی نظر آتی ہیں۔ بس یہ ہے کہ آپ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے بہت بعد میں ہیں لہٰذا آپ کی دست رس ان کاغذات اور واقعات تک ہے جو مولانا مرحوم کی دسترس سے باہر تھے۔

بھائی صاحب آپ نے مجھ پر بڑا کرم کیا جو شبلی کے نام مشاہیر کے خطوط کا مسودہ اشاعت کے پہلے مجھے دکھانا چاہتے ہیں۔ حاشا وکلا میری یہ حیثیت اور لیاقت نہیں۔ علاوہ بریں نہ عمر، نہ صحت، نہ فرصت۔ یہ سب چیزیں اب اوراق پارینہ ہوکر رہ گئی ہیں۔ خود اپنے اوپر کچھ کام میں نے لگا رکھے ہیں یا لے لئے ہیں جو بہت دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے ہیں بلکہ آہستہ خرام سے مخرام کی منزل میں آگئے ہیں۔

میں آپ کی لیاقت اور بالخصوص علامہ شبلی سے آپ کی لگن اور علمی دلچسپی کا قائل ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ اب میں کوئی ایسا کام قبول نہیں کرسکتا جس کے لئے میں خود کو صلاحیت اور فرصت دونوں سے عاری پاتا ہوں۔

حضرت عمرؓ اور پانی والے معاملے کے لئے الفاروق ایک بار پھر دیکھوں گا۔ یقین ہے کہ کہیں نہ کہیں نظر پڑ جائے گی اور تفصیلات معلوم ہوجائیں گی۔

''معارف'' کا معاملہ یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ وہاں شبلی کے بارے میں ایک طبقہ کسی بھی تازہ خیالی یا مقررہ راستے سے ہٹ کر دیکھنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ مجھے ''معارف'' کی مجلس ادارت کی رکنیت باعث اعزاز تو تھی لیکن ایسے اعزاز سے کیا فائدہ جس سے کوفت پیدا ہو اور لوگوں کو گمان گذرے کہ فاروقی صاحب کو یہ رکنیت کتنی عزیز ہے کہ بے حیائی کر کے بھی اسے گلے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ مانا کہ اس زمانے میں بعض ایسے بڑے ادیب موجود ہیں جو ذلت کھاتے ہیں اور پھر بھی محفل میں جلوہ افروز رہتے ہیں۔ یہ مجھ سے کبھی نہ ہوا تو اب کیا ہوگا، جب سفینہ کنارے پر آ لگا ہے۔ آپ کی محبت کے لئے شکر گذار ہوں۔ آپ کا

شمس الرحمٰن فاروقی

۲۰۱۸ء میں ناچیز کی کتاب ''شبلی خودنوشتوں میں'' تیار ہوئی تو اس کا پیش لفظ لکھنے کے لئے میں نے فاروقی صاحب سے گذارش کی۔ یہ گذارش میل سے نہیں واٹس ایپ سے کی تھی۔ فاروقی صاحب اس وقت آن لائن تھے، مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسرے دن بھی کوئی جواب نہیں آیا تو مجھے خیال ہوا کہ شاید مصروفیت بہت ہے اور وہ نہ لکھ سکیں گے۔ لیکن تیسرے دن علی الصبح ان کا فون آ گیا اور کہا کہ کل میں گر گیا تھا اور جب تک سنبھلتا کچھ کتابیں میرے اوپر آ گریں جس سے ہاتھ میں چوٹ آ گئی ہے۔ اس لئے اب تمہارے کام میں تاخیر ہوگی۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں، اللہ آپ کو صحت دے اور سلامت رکھے۔ البتہ مجھے اس بات سے بے حد خوشی ہوئی کہ وہ میرے خط کے جواب کے بجائے سیدھا پیش لفظ لکھ کر بھیجنا چاہ رہے تھے۔ لیکن پھر چار پانچ دن بعد ہی پیش لفظ لکھ کر بھیج دیا۔ اور ایسا شاندار پیش لفظ لکھا کہ آج تک میری کسی کتاب پر شاید ہی کسی اہل قلم نے ایسا پیش لفظ لکھا ہوگا۔ اس پیش لفظ میں انہوں نے تین باتیں لکھی ہیں۔ پہلی یہ کہ کسی ایک موضوع پر کام کرنے کی کیا شرائط ہیں۔ وہ لکھتے ہے:

''کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے کسی ایک مصنف کی زندگی اور تحریروں کے مطالعے کے لئے اپنی عمر وقف کر دی ہو اور ان کے مطالعات کا ثمرہ

قابل قدر تصنیفات کی صورت میں بھی سامنے آیا ہو۔ اس صورت حال کے پیدا ہونے کے لئے اور شرطوں کے علاوہ یہ شرط بھی ہے کہ جس شخص کو اپنا موضوع بنایا گیا ہو اس کی تحریروں میں اتنا تنوع اور اتنی قوت ہو کہ وہ تازیست مطالعے اور گہرے مطالعے کی متحمل ہو سکیں۔ پھر یہ بھی ایک شرط ہے کہ جس شخص نے ایسے کام کا بیڑا اٹھایا ہو، وہ خود صلاحیت اور لیاقت رکھتا ہو اور اس کے مزاج میں اتنی استقامت بھی ہو کہ ناسازگار حالات میں بھی اس کی لگن کم نہ ہو۔''

دوسری بات یہ لکھی کہ ہماری علمی تاریخ میں علامہ شبلی نعمانی کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟۔ اس کی انہوں نے ایسی تصریح کی ہے کہ گذشتہ صدی میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے اپنے استاذ علامہ شبلی کو رازی و غزالی اور ابن تیمیہؒ سے تشبیہ دی ہے، مگر فاروقی صاحب فرماتے ہیں:

''حجت الاسلام علامہ شبلی نعمانی نے بہت کم عمر پائی۔ ان کا زمانۂ تصنیف و تالیف و تدریس بھی نسبۃً بہت مختصر تھا، لیکن بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ صرف تصنیفات ہی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ موضوعات کے تنوع، مطالعے کی وسعت، تفکر کی گہرائی اور گیرائی اور استحضار علم کے اعتبار سے ان کا ثانی مسلمانوں میں علم کی بہار کے زمانے میں البیرونی، بوعلی، غزالی جیسوں میں تو مل سکتا ہے، لیکن شبلی کے اپنے زمانے سے لے کر آج تک شبلی کا ثانی تو کیا ایسا بھی کوئی نہ ہوا جسے ہم شبلی کا ظل کہہ سکیں۔''

فاروقی صاحب کی اس تحریر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی نظر میں علامہ شبلی کا مرتبہ کس قدر بلند تھا۔ اس کے بعد انہوں نے میری اور میری کتاب کی انفرادیت کا بڑے محبت آمیز انداز میں ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

شبلی پر بہت لکھا گیا ہے، لیکن سوانح کے نقطۂ نظر سے اور علمی مباحث کے نقطۂ نظر سے بھی بہت چھان بین ابھی باقی ہے۔ ہمارے دوست محمد الیاس الاعظمی نے پوری زندگی مطالعۂ شبلی میں گذار دی ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اب شبلی اور

الیاس الاعظمی لازم وملزوم ہو گئے ہیں۔ الیاس الاعظمی نے اب تک شبلی پر بارہ کتابیں لکھی یا مرتب کی ہیں، اور ہر ایک میں شبلی کی علمی یا سوانحی زندگی کو کسی نئے نقطۂ نظر سے دیکھا اور پیش کیا گیا ہے۔ ان میں 'شبلی شناسی کے سو سال'؛ 'شبلی اور جہان شبلی'، 'نوادرات شبلی' اور 'متعلقات شبلی' کو خاص دلچسپی سے دیکھا گیا ہے۔

اب الیاس الاعظمی نے ایک بالکل نیا موضوع دریافت کیا ہے: شبلی کا ذکر خود نوشتوں میں۔ یہ موضوع کچھ ایسا غیر متعین سا ہے کہ اس کا نہ کوئی نقطۂ آغاز ہے اور نہ نقطۂ انجام۔ پھر بھی، الیاس الاعظمی نے کم وبیش چوبیس ایسی خود نوشتیں تلاش کی ہیں جن میں شبلی کا ذکر کسی اہم انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ تعداد کم نہیں بلکہ بڑی حد تک استعجاب انگیز ہے۔ اتنے بہت سے اہم لوگوں نے شبلی کا ذکر اپنی خود نوشت میں کیا، یہ امر بجائے خود شبلی کی عظمت اور اہمیت کو ثابت کرتا ہے۔

محمد الیاس الاعظمی نے حسب معمول دقت نظر سے کام لیا ہے اور شبلی شناسی کا حق ادا کر دیا ہے۔ خدا ان کی کوششوں کو مزید ترقی دے۔ شبلی کو الیاس الاعظمی جیسا جاں نثار زیب بھی دیتا ہے۔ اللہم زد فزد۔

شمس الرحمٰن فاروقی

دراصل فاروقی صاحب کا مطالعہ جس قدر ادبیات کا گہرا تھا اسی قدر اسلامی علوم وفنون پر بھی ان کی عمیق نظر تھی۔ حق مغفرت کرے ایسے ارباب کمال مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

---

(۱۶۱)

پروفیسر شہریار

[۱۹۳۶-۲۰۱۲ء]

پروفیسر کنور محمد اخلاق شہریارؔ مشہور شاعر تھے۔ مدۃ العمر داد سخن دیتے رہے۔ انھیں ڈاکٹر خلیق الرحمٰن اعظمی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ان دونوں کی شاعری اور ان کے فکر وخیال سے اہل علم

بخوبی واقف ہیں۔ پروفیسر شہر یار مجلّہ فکر ونظر علی گڑھ کے مدیر رہے اور انھوں نے اس کے کئی اہم خصوصی شمارے شائع کیے، جنھیں بڑی مقبولیت ملی۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی مجلّہ فکر ونظر کا شبلی نمبر بھی ہے جو جون ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ پروفیسر شہر یار نے اس کا جو اداریہ لکھا ہے اور جس میں انھوں نے فکر ونظر کی خصوصی اشاعتوں کا ذکر کیا ہے اور پھر شبلی نمبر نکالنے کا سبب بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ علی گڑھ نے علامہ شبلی کو ہمیشہ اپنے معماروں میں شمار کیا ہے۔

علامہ شبلی ۱۶ ربرس علی گڑھ کالج اور دامن سرسید سے وابستہ رہے۔ سرسید سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا اور خود انھوں نے کالج کو اپنی علمی سرگرمیوں سے بہت کچھ فائدہ بھی پہنچایا۔ باوجود اس کے انھوں نے سرسید کے بعض نقطہ نظر سے ان کی زندگی میں اور ان کے سامنے اختلاف کیا۔ اختلاف رائے کا سرسید سے زیادہ احترام کرنے والا مسلمانوں میں اب تک شاید ہی کوئی پیدا ہوا ہو۔ انھوں نے تو اس کے خلاف کچھ نہ کہا، مگر یاران علی گڑھ نے اس کو ہوا دی اور علامہ شبلی کو علی گڑھ ہی کا مخالف قرار دے دیا۔ جس کے نتیجے میں بعض بڑی غلط باتیں عام کی گئیں۔ پروفیسر شہر یار نے اس کا ذکر بڑے خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ اور پھر لکھا ہے کہ

> ''سرسید نے اے ایم او کالج میں جن بڑے دانشوروں کو جمع کیا تھا ان میں شبلی کا نام بہت اہم ہے۔ وہ لمبے عرصہ تک علی گڑھ سے وابستہ رہے۔ ان کے تخلیقی اور ادبی زندگی کا یہ سنہرا دور ہے۔ اس کا اظہار انھوں نے جگہ جگہ کیا ہے۔ ان کی ایک دورایوں کو نام نہاد سرسید پرستوں نے اتنی ہوا دی کہ عام لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ شبلی، سرسید اور علی گڑھ تحریک کے مخالف تھے۔ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی یہ ایسی مثالیں ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سرسید کے تمام رفقا جہاں سرسید کی تحریک کے بنیادی تصورات سے اتفاق کرتے تھے وہیں ان کی تعبیر وتشریح اور ان کے علمی نقاط میں سرسید سے ان کو ضمنی اختلاف بھی تھا۔ سوچنے والے ذہنوں میں اس نوع کے اختلافات نہ ہوں تو حیرت کی بات ہے۔ سرسید اور شبلی کے درمیان فاصلے پیدا کرنے والوں میں ان لوگوں کی اکثریت ہے جو اس دور میں ہوتے تو یا سرسید کے خلاف ہوتے یا شبلی کے۔''

(فکر ونظر، علی گڑھ، (شبلی نمبر) جون ۱۹۹۶ء، ص: ۵-۶)

نواب محسن الملک کے بعد نواب وقار الملک اور صاحبزادہ آفتاب احمد کے عہد علی گڑھ میں شہریار جیسے دو چار غور وفکر اور لکھنے والے ہوتے تو علامہ شبلی اسی طرح آسمان سرسید کے ستارے ہوتے جیسا کہ وہ عہد سرسید میں تھے۔

سرسید اور شبلی پر لکھنے والوں نے موضوع کا ابتک حق ادا نہیں کیا ہے۔ کالج میں تدریس، نصابی کتاب کی تیاری، تاریخی کتابوں کی کالج سے اشاعت، ایجوکیشنل کانفرنس میں سرسید کے شانہ بہ شانہ شرکت اور ایک موقع پر جب خود سرسید ایجوکیشنل کانفرنس کو ختم کرنا چاہتے تھے ان کے سامنے کانفرنس کی اہمیت واضح کرنا اور اس قدم سے روکنا، خدا جانے سرسید سے اتنی قربت کی معاصرین رشک وحسد سے جل اٹھیں۔ ان سب موضوعات کی تفصیل اب تک بیان ہی نہیں کی گئی۔ راقم نے ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی کا حصہ'' لکھ کر ایک پہلو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ابھی بہت سے ایسے پہلو ہیں جن کی تفصیل اور وضاحت ہونی باقی ہے۔ پروفیسر شہریار جن سے اس کی توقع نہیں تھی لیکن انہوں نے کچھ صاف صاف باتیں لکھیں اور کچھ کی طرف اشارہ کر کے گذر گئے ہیں۔

---

(۱۶۲)

پروفیسر فتح محمد ملک

[پ: ۱۸؍ جون ۱۹۳۶ء]

ممتاز محقق ومصنف اور نقاد پروفیسر فتح محمد ملک نے اختر وقار عظیم کی کتاب ''شبلی بحثیت سیاست داں'' پر پیش لفظ لکھا ہے۔ اختر وقار عظیم علامہ شبلی کے شیدائی ہیں۔ اس کتاب سے پہلے انھوں نے ایک اور عمدہ کتاب ''شبلی بحثیت مورخ'' لکھی تھی جو بے حد مقبول ہوئی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۸ء اور ۲۰۰۵ء میں اس کے دوسرے، تیسرے ایڈیشن شائع ہوئے۔ ان کی دوسری کتاب ''شبلی بحثیت سیاست داں'' ۲۰۱۶ء میں سنگ

میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ یہ مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ اہل علم کے چند مضامین کا مجموعہ ہے۔

پروفیسر فتح محمد ملک نے سرسید تحریک سے علامہ شبلی کے جزئی اختلاف اور جزئی اتفاق کی توجیہ اس طرح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''سرسید احمد خاں کے رفقا میں مولانا شبلی نعمانی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے سرسید کی اصلاحی تحریک کے اغراض ومقاصد کی تخلیقی انداز میں تکمیل کی مساعی کو قومی وملی احیا کے لئے کافی نہیں جانا بلکہ ان اصلاحی اور تعمیری مقاصد کو ارتقائی نقطہ نظر سے دیکھا، سمجھا اور علم وعمل میں ڈھالا۔
>
> مولانا شبلی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۸۵۷ء وہ سال ہے جب سرسید احمد خاں بلوغت کے تمام مراحل طے کرنے کے بعد اپنی اصلاحی تحریک کی بنیادیں استوار کرنے میں کوشاں ہو چکے تھے۔ مولانا شبلی کا تعلق اگلی نسل سے تھا، اس لئے انھوں نے سرسید کی تعلیمی، ادبی اور دینی اصلاح کے پروگرام پر عمل بھی کیا اور پھر اسی تحریک کے ارتقائی تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے اسے انجماد سے بچانے کی خاطر نئی اور سامراج مخالف حکمت عملی کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔''
>
> (شبلی بحیثیت سیاست داں، ص:۱۰)

پروفیسر فتح محمد ملک کا یہ بھی خیال ہے کہ علامہ شبلی نے عاشقانہ شاعری کا نایاب باب قلم بند کیا اور یہ کہ اگر وہ قومی ضروریات کو مقدم نہ خیال کرتے تو یقینی طور پر عشقیہ شاعری میں سنگ میل قائم کر جاتے۔ قومی ضروریات پر انھوں نے اپنی پسند کو پس پشت ڈالا اور بجائے شاعر کے مورخ بن کر سامنے آئے۔

ان کا خیال ہے کہ مشنریوں کے اس پروپیگنڈہ سے کہ مسلمانوں کو علم ودانش سے کوئی سروکار نہیں رہا، اس سے متاثر ہو کر انھوں نے المامون لکھی۔ اسی طرح انگریزوں کے اس ناروا الزام سے کہ مسلمان حکمرانی سے ناواقف ہیں، اس کے خلاف الفاروق سپرد قلم کی اور اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

پروفیسر فتح محمد ملک نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ سرسید کے برعکس علامہ شبلی نے روم ومصرو شام کا سفر کیا، جہاں سید جمال الدین افغانی کے فیضان کو عام کرنے کے لئے مفتی محمد عبدہ اور شیخ رشید رضا جیسے جدیدیت پسند علماء سرگرم تھے۔ ان کے روابط نے علامہ شبلی کے سیاسی شعور کو ایک انقلابی رخ عطا کیا۔ وہ اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ علامہ شبلی کانگریس کے زیادہ قریب تھے اور مسلم لیگ کو ناپسند کرتے تھے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ عہد شبلی میں کانگریس اور مسلم لیگ میں زیادہ فرق نہیں تھا اور دونوں جماعتوں کے وابستگان ایک دوسرے کی جماعت میں آتے جاتے رہتے تھے اور بعض اوقات دونوں کے مشترکہ اجلاس بھی ہوئے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ علامہ شبلی نے مسلم لیگ پر جو تنقیدیں کیں وہ دراصل اس کی اصلاح چاہتے تھے۔

پروفیسر فتح محمد ملک کا مطالعہ شبلی واجبی سا ہے۔ انھوں نے اپنے موقف کی تائید میں جو اقتباسات نقل کئے ہیں وہ تمام تر اختر وقار عظیم کی کتاب شبلی بحیثیت مورخ سے لئے گئے ہیں۔ اسی طرح جہاں انھوں نے ندوہ کا ذکر کیا ہے اسے ندوۃ المصنفین لکھا ہے۔ یہ ایسی غلطی ہے کہ ندوہ اور دارالمصنفین دونوں پر منطبق ہوسکتی ہے۔ ایک جگہ تو صراحت سے اعظم گڑھ بھی لکھ دیا ہے۔

علامہ شبلی کا سیاسی نقطہ نظر بالکل واضح ہے۔ وہ مسلم لیگ کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کی نظمیں اس کی شاہد ہیں اور وہ کانگریس کو دل سے پسند کرتے تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی اور علم بردار تھے۔ جو لوگ اس موضوع پر ان کے خیالات سے واقفیت چاہتے ہیں انھیں ان کا طویل مقالہ ''مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

---

(۱۶۳)

ڈاکٹر ابرار اعظمی

[۱۹۳۶-۲۰۲۰ء]

ڈاکٹر ابرار حسین خاں، ابرار اعظمی ادیب اور شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ اصلاً ماہر تعلیم تھے اور تعلیم ہی ان کا میدان کارزار رہا۔ مذہب سے بھی لگاؤ تھا۔ ان تینوں موضوعات پر

ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے کلام کا انتخاب غبار شیشۂ ساعت عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے۔ ان کا ذکر میری کتاب ''شبلی: سخنوروں کی نظر میں'' میں آچکا ہے۔ انھوں نے کئی نثری تحریروں میں علامہ شبلی کے کمالات کا اعتراف کیا ہے۔ انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک نظم بھی کہی ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی، علامہ شبلی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ ان پر ہارون اعظمی مرحوم نے سمینار کا انعقاد کیا تو ابرار اعظمی صاحب بھی اس میں شریک ہوئے اور ایک تحریر پڑھ کر سنائی۔ اسے مجموعہ مقالات سمینار ''مولانا عبدالسلام ندوی کی دانشوری اور عصر حاضر'' میں بطور تبریک شامل کیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے مولانا عبدالسلام ندوی کی کاوشوں میں روح شبلی کی نشاندہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا (عبدالسلام ندوی) کی گراں قدر تصانیف میں پائی جانے والی ایک زیریں لہر کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ ہے اپنے عبقری استاذ علامہ شبلی نعمانی کی فکر ونظر میں ترویج وتوسیع۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسی غیر معمولی تصنیف کی توسیع تو خارج از امکان ہے مگر بعد از نبی بزرگ ترلیعنی صحابہ کرامؓ کی سوانح نگاری کی بنا بھی علامہ نے الفاروق لکھ کر ڈالی تھی۔ مولانا نے سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور اسوہ صحابہؓ اور اسوۂ صحابیاتؓ لکھ کر مقصد کو آگے بڑھایا۔ علامہ نے الغزالی تحریر فرمائی تھی۔ مولانا نے امام رازی اور حکمائے اسلام لکھ کر اس سلسلے کو وسعت دی۔ علامہ نے پانچ جلدوں میں ''شعر العجم'' تصنیف کی اور مولانا نے دو جلدوں میں ''شعر الہند'' لکھ کر تذکراتی ادب میں مؤقر اضافہ کیا۔ علامہ نے نظریاتی اور عملی تنقید کا معیاری نمونہ موازنہ انیس و دبیر میں پیش کیا اور مولانا نے اقبال کامل میں۔ اقبال شاعر پہلے تھے اور بعد میں کچھ اور والی بات کہہ کر ایک نمایاں ادبی خدمت انجام دی۔ علامہ کی سیرۃ النعمان اور مولانا کی تاریخ فقہ اسلامی (ترجمہ) کو بھی اسی پس منظر میں دیکھا جانا چاہئے۔ بہ الفاظ دیگر مولانا عبدالسلام ندوی کی دانشوری کا تذکرہ ہو تو اس آفتاب علم وادب کا ذکر خیر ناگزیر ہو جاتا ہے جس سے

مولانا نے کسب نور کیا۔" (مولانا عبدالسلام کی دانشوری اور عصر حاضر ص:۱۱۔۱۲)

---

(۱۶۴)

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

[۱۹۳۷-۲۰۰۸ء]

مولانا ضیاء الدین اصلاحی دبستان شبلی کے ممتاز اہل قلم اور ادیب وانشا پرداز تھے۔ بڑی خوبصورت نثر لکھتے تھے۔ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی سے پچاس برس وابستہ رہے۔ بیس سال تک اس کی نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ متعدد کتابیں سپرد قلم کیں اور مختلف موضوعات پر سیکڑوں علمی وادبی اور تحقیقی مضامین لکھے۔ انھیں علامہ شبلی سے خاص عقیدت تھی۔ دارالمصنفین کے اہل قلم میں سید صاحب کے بعد سب سے زیادہ انھیں نے علامہ شبلی پر لکھا ہے۔ ان کے ان مضامین ومقالات کو جو علامہ شبلی سے متعلق تھے "عظمت شبلی" کے نام سے ڈاکٹر اورنگزیب اعظمی نے مرتب کر کے شائع کرادیا ہے۔

مولانا ضیاء الدین صاحب مرحوم کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے علامہ شبلی کی وہ کتابیں جو دارالمصنفین سے شائع نہیں ہوئی تھیں یا شائع ہوئی تھیں مگر آوٹ آف پرنٹ تھیں ان کو ایک ایک کر کے شائع کیا اور جو شائع شدہ تھیں انہیں ایڈٹ کرا کے اس کے نئے خوب صورت ایڈیشن شائع کئے اور ان پر انہوں نے بڑے خوب صورت دیباچے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے اہل قلم جنہوں نے علامہ شبلی پر کتابیں لکھیں ان پر بھی دیباچے اور مقدمے لکھے ہیں۔ یہاں ان کے چند دیباچوں اور ان کے مشمولات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۹۸۳ء میں ان کے علمی وادبی اور سوانحی مضامین کا مجموعہ "چند ارباب کمال" شائع ہوا۔ اس کے سرورق پر لکھا ہے کہ اردو کے علاوہ عربی کے بھی نامورانِ علم وفن کے حالات اور علمی وادبی خدمات کی داستان۔ اس مجموعہ میں ایک مضمون "علامہ شبلی اور اعظم گڑھ" ہے۔ اپنے موضوع پر پہلا تحقیقی مضمون ہے۔ اس میں مولانا مرحوم نے علامہ کے چند غیر معروف تلامذہ کا

تذکرہ ہے۔ جس سے عموماً اہل علم ناواقف تھے۔ اس سے علامہ شبلی کے اعظم گڑھ پر اثرات کا منظر نامہ سامنے آتا ہے۔ اس کے بارہ میں خود مولانا لکھتے ہیں:

''دوسرے باب کا پہلا مضمون علامہ شبلی پر ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان سے غیر معمولی عقیدت کے باوجود ان کے لئے اس متاع کاسد کے سوا میرے سرمایہ تحریر میں کوئی اور چیز نہ تھی۔ غالباً یہ ان کی عظمت و بلند پائیگی اور کوہ پیکر شخصیت کا اثر ہے کہ جب کبھی ان پر کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو قلم کو عاجز و درماندہ پایا، مگر شبلی سے میری عقیدت نے گوارا نہ کیا کہ یہ مجموعہ ان کے ذکر جمیل سے خالی رہے۔''

(چند ارباب کمال، ص: الف)

اس کے علاوہ دو اور مضامین ہیں جن میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولوی مسعود علی ندوی کا ذکر ہے اور دونوں اہم مضامین ہیں۔ ان سے اثرات شبلی کا ایک پرتو سامنے آتا ہے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے علامہ شبلی کی تصانیف کی از سر نو اشاعت کا بیڑہ اٹھایا اور سب سے پہلے سیرۃ النبیؐ کا ایک محقق ایڈیشن تیار کرایا اور اپنے مختصر دیباچے کے ساتھ شائع کیا اور لکھا کہ

''سیرۃ النبیؐ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی سب سے مقدس و مقبول کتاب ہے۔ اردو تو کیا عربی میں بھی اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی، اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

تقریباً ایک صدی پہلے جب علامہ شبلی نے اس مبارک کتاب کی تالیف کا آغاز کیا تھا تو ان کی زندگی کی شام ہو چکی تھی اور وہ اس کے دو حصے ہی لکھ سکے تھے کہ پیام اجل آ گیا۔ ان حصوں کی اشاعت اور علامہ شبلی کے تیار کردہ خاکہ کے مطابق بقیہ حصوں کی ترتیب و تالیف کی سعادت ان کے عزیز شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی کے حصے میں آئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔'' (سیرۃ النبی ج ۱، ص: ۱)

اس کے بعد سیرت کے اس نئے ایڈیشن کی تحقیق و تخریج اور حوالوں کا اہتمام اور تصحیحات وغیرہ کی تفصیل ہے اور بتایا ہے کہ یہ کام سید صاحب نے دوبارا انجام دیا اور یہ تیسری کوشش ہے۔

اس لحاظ سے یہ سب سے اہم ایڈیشن ہے۔غالباً اسی بنیاد پر اسے ڈیلکس ایڈیشن کا نام دیا گیا۔ دارالمصنفین اس وقت یہی محقق ایڈیشن شائع کر رہا ہے۔ بلاشبہ علامہ شبلی کے حوالہ سے مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی یہ ایک اہم اور انتہائی مفید کوشش تھی۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے علامہ شبلی کی مقبول ترین کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' کا بھی محقق ایڈیشن شائع کیا۔ اس پر انہوں نے جو دیباچہ لکھا ہے اس سے ان کی اردو ادب پر گہری نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس دیباچہ کے دو اقتباس نقل کئے جاتے ہیں۔ موازنہ انیس و دبیر کے بارہ میں لکھتے ہیں:

> ''موازنہ انیس و دبیر مولانا شبلی کی مقبول ترین اور کلاسیکل اردو ادب کی بلند پایہ کتاب ہے۔ اس میں مصنف نے دکھایا ہے کہ کم مائیگی زبان کے باوجود اردو شاعری عظمت اور بلند پائیگی کی حامل ہے۔ اس مقصد سے اردو کے بہت ہی ممتاز شاعر میر انیس کا انتخاب کر کے ان کے کلام کی خوبیاں اور خصوصیات دکھائی ہیں اور بتایا ہے کہ میر صاحب کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں وہ اردو کے کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ہیں۔ میر انیس کے کمالات اور شاعری کے محاسن دکھانے اور فنی کمال کو نمایاں کرنے کے لئے مولانا نے کتاب کے ایک باب میں مرزا دبیر سے ان کا موازنہ بھی کیا ہے جو اس وقت تو ایک ناخوش گوار بحث کا باعث بن گیا تھا، لیکن اب مولانا شبلی کی رائے کی صحت عموماً تسلیم کر لی گئی ہے۔'' (موازنہ انیس و دبیر، ص: ۱۰-۱۱)

موازنہ کے اس محقق ایڈیشن کی اشاعت میں راقم کا بھی کسی قدر حصہ ہے۔ یہاں تحدیث نعمت کے طور پر مولانا کے اقتباس کو نقل کرتا ہوں کہ وہ میرے لئے سند کا درجہ بھی رکھتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو مولانا شبلی سے بڑی عقیدت اور دارالمصنفین سے عشق ہے۔ ان کا خاص موضوع تحقیق یہی ہے اور وہ اس کے ہر کام میں پیش پیش رہتے ہیں۔ انھیں جب میری اس پریشانی کا علم ہوا تو انھوں نے بڑی خوشی سے تصحیح

ومراجعت کی ذمہ داری قبول کرلی اور بڑی محنت وجانفشانی سے یہ کام انجام دیا اور جہاں تک بن پڑا اشعار کی صحت کے لئے مراجع ومصادر کھنگالے اور کاپیوں اور پروف کی تصحیح بھی دلچسپی سے کی۔" (موازنہ انیس ودبیر، ص:۱۱-۱۲)

مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم نے بے سروسامانیوں کے باوجود تصانیف شبلی کے یکے بعد دیگرے محقق ایڈیشن دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع کیے۔ اس سے ان کی عقیدت شبلی کا اظہار ہوتا ہے۔ خاص طور پر ان مختصر سے دیباچوں میں انھوں نے جس طرح علامہ شبلی کا والہانہ ذکر کیا ہے، وہ بس انھیں کا حصہ ہے۔ مثلاً الغزالی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"الغزالی حجۃ الاسلام علامہ شبلی نعمانی کی مقبول ومایہ ناز کتاب ہے جو ایک مدت سے ختم ہوگئی تھی اور قدر دانوں کی طرف سے اس کے نئے ایڈیشن کے لئے بار بار تقاضا ہو رہا تھا۔ الحمدللہ کہ اب ان کی یہ آرزو پوری ہو رہی ہے۔"

(الغزالی۔ دیباچہ، ص:۱، طبع جدید ۱۹۹۷ء)

سیرۃ النعمان شائع کی تو اس کے دیباچہ میں مختصراً اس کی تمام خصوصیات اور مولانا شبلی کی اولیات کا بھی ذکر کیا اور لکھا کہ

"علامہ شبلی کو جب ناموران اسلام لکھنے کا خیال پیدا ہوا تو بجا طور پر فقہائے اسلام کے طبقہ میں امام ابوحنیفہؒ پر ان کی نظر پڑی جو فقہ کے بانی اور فقہائے اسلام میں سب سے ممتاز ہیں، اس لئے مولانا کو ان سے اور فقہ حنفی سے بڑا ذوق وشوق رہا۔ مولانا نے جس زمانہ میں سیرۃ النعمان کی تالیف کی تھی اس وقت تک امام صاحب پر اردو میں کوئی قابل ذکر کتاب موجود نہیں تھی۔ عربی میں جو کتابیں تھیں ان میں صرف حالات وسوانح ہی کا حصہ موجود تھا، جس کو مولانا نے اس کتاب کے پہلے حصہ میں مستند مآخذ سے لکھا ہے اور دوسرے حصہ میں ان کے طرز اجتہاد واصول استنباط اور فقہ حنفی کے امتیازات وخصوصیات پر جو بحث کی ہے اس سے قدیم کتابیں خالی ہیں۔" (دیباچہ طبع جدید)

سوانح مولانا روم بھی انھوں نے بڑے اہتمام سے شائع کی۔ اس کے بارے میں لکھا کہ

''سوانح مولانا روم بھی علامہ شبلی کی مشہور و مقبول تصنیف ہے۔ مولانا محمد جلال الدین رومی کی عام شہرت ایک صوفی کی ہے اور ان کی مثنوی کو بھی تصوف ہی کی کتاب سمجھا جاتا ہے اور اسی حیثیت سے وہ طبقہ صوفیا میں نہایت مقبول بھی ہے، لیکن مثنوی میں مولانائے روم نے اسلام کے عقائد و مسائل اور ان کے حقائق و معارف کو جس دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے اور جس خوبی سے سمجھایا ہے یہی دراصل علم کلام ہے، چنانچہ علامہ شبلی نے جب سلسلہ کلامیہ کا آغاز کیا اور الغزالی، علم الکلام اور الکلام لکھا تو انھیں مولانا روم کو بھی متکلم اسلام کی حیثیت سے متعارف کرانے کا خیال ہوا اور انھوں نے سوانح مولانا روم لکھا۔

مولانا روم کے حالات و واقعات بہت کم ملتے ہیں اور جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی تھی اس زمانے میں تو اور بھی کم کتابیں دستیاب تھیں، اسی لئے اس کتاب میں مولانا کے حالات و سوانح کا حصہ بہت کم ہے۔ البتہ مثنوی پر مبسوط تبصرہ کیا گیا ہے جس میں عقائد و کلام کے مباحث، الٰہیات، معجزہ، روح، معاد، جبر و قدر، تصوف، توحید، عبادت، فلسفہ و اخلاق اور سائنس کی جس قدر مؤثر اور دل نشیں پیرائے میں تشریح و ترجمانی کی گئی تھی ان کو علامہ شبلی نے اپنے مخصوص انداز اور دلکش اسلوب میں پیش کر کے دوآتشہ کر دیا ہے۔ ع

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

(سوانح مولانا روم، دیباچہ طبع جدید، ص:۱)

علامہ شبلی کا فارسی کلیات سید صاحب نے مرتب کر کے دارالمصنفین سے بغیر دیباچہ کے شائع کیا تھا۔ ۸۰ برس تک وہ بغیر دیباچہ کے شائع ہوتا رہا۔ مولانا اصلاحی مرحوم نے اسے شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو اس پر دیباچہ لکھا، جس میں علامہ شبلی کی فارسی شاعری اور ان کے شاعرانہ کمالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کا ہر پیراگراف علامہ شبلی سے ان کے گہرے مطالعہ و شغف کا پتہ دیتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی جیسے صاحب فضل و کمال کے لئے شاعری کوئی مایہ فخر چیز نہیں تھی، لیکن

ان کو اس کا فطری ذوق تھا۔ قدرت نے انھیں شدید الاحساس بنایا تھا اور ان کی طبیعت میں شاعرانہ لطافت بدرجہ اتم ودیعت کی تھی۔ اس لئے جب کوئی مؤثر واقعہ یا منظر ان کے سامنے آتا تو بے اختیار ان کی زبان پر ترانہ موزوں جاری ہو جاتا تھا جو شدت و تاثر کا نتیجہ ہونے کی بنا پر اعلی اور بلند درجہ کی شاعری کا نمونہ ہوتا تھا۔ اصلی اور جوش واثر سے پر شاعری وہی ہے جس میں آمد اور بے ساختگی ہو اور وہ دامن دل کو کھینچ لینے والی ہو۔'' (کلیات شبلی فارسی دیباچہ، ص:۱)

اس کے بعد انھوں نے تفصیل سے علامہ شبلی کے شاعرانہ کمالات کا تجزیہ کر کے دکھایا ہے کہ وہ بڑے عظیم الشان شاعر تھے۔ علامہ شبلی کی جمالیاتی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ

''علامہ کے عشق و محبت کا تخیل عامیانہ اور سطحی نہیں ہے بلکہ وہ نہایت بلند اور پاکیزہ ہے۔ اس کے اسرار و حقائق کی تعلیم کے لئے منبر و محراب موزوں جگہ نہیں ہے بلکہ دار و رسن کا وہ مقدس مقام ہے جہاں سے شہیدان محبت کی حقیقی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔'' (ص:۱۲)

اس دیباچہ کی حیثیت دیباچہ سے بڑھ کر ایک مقالہ کی ہوگئی ہے، جس میں علامہ شبلی کے فارسی شاعری کے تمام پہلوؤں پر نقد و تبصرہ ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے ان مباحث کی تفصیل سے گریز کیا جاتا ہے کہ ہمارا مقصد دیباچوں کے ان حصوں کی نشاندہی ہے جن سے فکر شبلی یا اثرات شبلی کی وضاحت ہوتی ہو۔

اس سلسلہ کا مولانا اصلاحی کا ایک اور کارنامہ علامہ شبلی کی تاریخی اور ایک نادر تصنیف ''اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر'' کی اشاعت ہے۔ علامہ شبلی نے مذکورہ عنوان سے جو سلسلہ مضامین لکھا تھا وہ ان کی زندگی ہی میں کتابی صورت میں شائع ہو گیا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے دار المصنفین سے علامہ شبلی کی ایک ایک تحریر شائع کی۔ البتہ اسے مقالات میں نہ شامل کر کے علاحدہ شائع کرنے کا ارادہ تھا۔ افسوس ان کا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ اسے پہلی بار مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے ۲۰۰۴ء میں دار المصنفین سے شائع کیا۔ اس کا دیباچہ مولانا مرحوم کے علامہ شبلی پر ان کے گہرے مطالعہ کا ایک نمونہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی نے الندوہ اور دوسرے رسالوں میں متعدد بلند پایہ اور محققانہ مضامین لکھے تھے، ان میں الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ اور پیش نظر مضمون ''اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر'' نہایت معرکۃ الآراء اور تلاش وتحقیق، دقیقہ بینی ونکتہ رسی اور مورخانہ زرف نگاہی کا خاص نمونہ ہیں، اس لئے علامہ کی زندگی میں ان کو علاحدہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔'' (اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص:۱)

علامہ شبلی کی کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شہنشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کو متہم ومطعون کرنے لئے تنگ نظر اور متعصب مورخین نے کذب وافترا کا جو طومار باندھا تھا اور اصل واقعات میں رنگ آمیزی اور ان کی غلط تعبیر وتاویل کرکے اورنگ زیب کو جن جرائم کا مرتکب قرار دیا تھا، علامہ کے پرزور قلم نے اس رسالہ میں ہر ایک کی تحلیل وتنقید کرکے دروغ بیانیوں اور افتراپردازیوں کا پردہ چاک کردیا ہے۔'' (ایضاً، ص:۱-۲)

اس کی ترتیب وتدوین کا کام میرے حصہ میں آیا تھا۔ یہ مولانا کی شفقت تھی مگر انھوں نے جب دیباچہ لکھا تو شفقتوں کے پھول برس گئے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ

''چونکہ یہ کتاب عرصہ سے ناپید تھی اس لئے بعض کتب فروشوں نے اس کے بہت معمولی، سستے اور گھٹیا قسم کے نسخے شائع کئے جنھیں دیکھ کر ہمیں تو شرمندگی ہو ہی رہی تھی علامہ مرحوم کی روح کو بھی اس سے بڑی اذیت پہنچتی رہی ہوگی، اس لئے کتاب کے صحیح اور محقق ایڈیشن کے لئے میری فکر وتشویش اور بڑھ گئی، اتفاقاً ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی سے اس کا ذکر آیا تو محسوس ہوا کہ وہ اس کی تحقیق ومراجعت کے لئے پہلے ہی سے آمادہ تھے، ان کو علامہ شبلی اور دارالمصنفین سے قلبی تعلق ہے، وہ بچپن سے کتب خانہ دارالمصنفین سے استفادہ کرتے رہے ہیں، ابھی حال ہی میں علامہ شبلی پر ان سے والہانہ تعلق کی بنا پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ علامہ شبلی، دارالمصنفین اور دوسرے موضوعات پر ان کے علمی مضامین ہندوپاک کے رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد الیاس نے سرکاری ملازمت کی مصروفیت کے باوجود اس کام کو بڑی محنت سے انجام دیا جس سے اغلاط کی تصحیح ہوگئی اور اصل مراجع سے مراجعت کر کے انھوں نے حوالوں کی تخریج بھی کردی اور جہاں ضرورت محسوس کی فارسی عبارتوں کے ترجمے بھی کردیئے۔" (ایضاً،ص:۱۲-۱۳)

اس اقتباس کے نقل کرنے کا مقصد اپنے کارنامے گنوانا نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جب علامہ شبلی پر کوئی شخص کتاب یا مقالہ لکھتا تھا تو مولانا اصلاحی مرحوم اسی طرح داد و تحسین سے اس کی حوصلہ افزائی کرتے تا کہ چراغ سے چراغ روشن رہے۔کاش ان کے بعد بھی لوگوں نے اس جانب توجہ کی ہوتی۔

مولانا مرحوم سے میری عقیدت ایک بزرگ کی حیثیت سے تھی، لیکن ان کی شفقت علامہ شبلی اور دبستان شبلی پر کام کرنے کے سبب تھی۔ میرے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل اسی نسبت سے ہے۔اب اگر وہ زندہ ہوتے تو شاید میرے کاموں کی وقعت کچھ اور ہوتی۔ وہ دبستان شبلی کی آبرو تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے اٹھ جانے سے دبستان شبلی یتیم ہوگیا۔

اردو کے ایک بزرگ ادیب و شاعر اثر انصاری کی کتاب 'دبستان شبلی کے نامور انشاپرداز' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔اس کا مقدمہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کے قلم سے ہے۔اس میں انہوں نے اور باتوں کے ساتھ یہ اہم بات بھی لکھی ہے کہ

"دارالمصنفین کے رفقاو مصنفین کی رگ و پے میں بھی علامہ شبلی ہی کی صہبائے علم وادب رقص کرتی ہے۔اور انہوں نے اپنی تحریروں اور تصنیفات میں موادو معلومات کی فراہمی، طریقہ بحث و استدلال، ترتیب مقدمات اور اخذ و استنباط نتائج کے علاوہ انہیں کی انشاپردازی کے اعلیٰ ترین نمونے کو پیش نظر رکھا ہے، اس لئے دارالمصنفین کی علمی و ادبی نگارشات اور اس کے مصنفین کا تحریری و تصنیفی سرمایہ دامان باغباں اور کف گل فروش بنا ہوا ہے۔"

(دبستان شبلی کے نامور انشاپرداز،ص:۱۴)

علامہ شبلی اور دارالمصنفین سے مولانا ابوالکلام آزاد کا بڑا گہرا تعلق تھا۔اس کے بارہ میں

مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے اپنی کتاب ''مولانا ابوالکلام آزاد مذہبی افکار، صحافت اور قومی جدو جہد'' میں لکھتے ہیں:

''دارالمصنفین شبلی اکیڈمی سے مولانا آزاد کا تعلق اظہر من الشمس ہے۔ وہ مولانا شبلی کے عزیز دوست اور تربیت یافتہ تھے۔ مولانا شبلی نے الندوہ کی ادارت میں ان کو اپنا شریک بنایا، سیرت نبویؐ کی تالیف اور دارالمصنفین کی تاسیس میں ان سے مشورہ وتبادلہ خیال کیا، سیرت کے بعض حصے پہلی مرتبہ الہلال میں شائع ہوئے، اور اسی میں دارالمصنفین کی اسکیم بھی شائع ہوئی۔'' (ص:۱۶)

مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم نے بکثرت مقدمات لکھے ہیں۔ اگر انہیں کر دیا جائے تو ''مقدمات ضیاء الدین اصلاحی'' کی ایک مبسوط جلد شائع ہو سکتی ہے۔ مولوی ابوعلی اثری مرحوم کے مضامین کا ایک مجموعہ ''سید سلیمان ندوی'' ۱۹۸۵ء ندوۃ المحدثین گوجرانوالہ پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ اس کا پیش لفظ بھی مولانا مرحوم کے قلم سے ہے۔ اس میں شبلی شناسی سے کے حوالہ سے دو اہم باتیں آ گئی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۔ ''وہ (ابوعلی اثری) علامہ شبلی کے پرستار، عقیدت مند اور انہیں اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز، ادیب اور مصنف سمجھتے ہیں اور خود بھی اقلیم علم وادب کے اسی شہنشاہ کے اسلوب نگارش کا تتبع کرتے ہیں۔ ان کی قلمی فتوحات میں علامہ ہی کے عدیم المثال طرز انشا اور اسلوب نگارش کا پرتو ہوتا ہے، جس کے مداح ملک کے مشہور صاحب طرز انشا پرداز، قرآن کے مترجم ومفسر مولانا عبدالماجد دریابادی بھی تھے، اور ان کی تحریروں کے بڑے قدرداں تھے۔''

(سید سلیمان ندوی، ص:۷)

۲۔ ''وہ (ابوعلی اثری) علامہ شبلی مرحوم کے طرز تحریر اور اسلوب نگارش کو اردو کی انشا پردازی کا اعلیٰ ترین نمونہ سمجھتے تھے۔ علامہ کے مقابلہ میں ان کے تمام معاصرین میں کوئی بھی ان کی نگاہ میں آج تک نہیں جچا۔ وہ ان کو مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی سے بھی بڑھ کر سمجھتے ہیں۔'' (ایضاً ص:۷-۸)

دارالمصنفین میں ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے عنوان سے جو عالمی سمینار ہوا تھا اس میں پیش کیے گئے مقالات نیز اس سے متعلق اکابرین دارالمصنفین کے مقالات دارالمصنفین نے کتابی صورت میں شائع کیے ہیں۔صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی وفات کے بعد اس سلسلہ کی ساتویں جلد مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور آٹھویں جلد مولانا ڈاکٹر محمد عارف عمری نے مرتب کی۔ آٹھویں جلد کے دیباچہ میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے لکھا ہے کہ

> ''انیسویں صدی میں عیسائی مشنریاں اور مستشرقین دونوں ہی اسلام کے لئے خطرہ بنے ہوئے تھے۔عیسائی مشنریوں کے اعتراضات کا جواب دینا آسان تھا اور یہ کام اس زمانے کے متعدد قدیم طرز کے علماء نے بہ خوبی انجام دیا، مگر دوسرے گروہ کا جواب دینا آسان نہیں تھا کیونکہ مستشرقین بہت پڑھ لکھے تھے، ان کا جواب وہی لوگ دے سکتے تھے جو قدیم تعلیم سے بہرہ ور اور اپنے مذہب سے پوری طرح باخبر ہونے کے ساتھ جدید علوم وافکار اور نئے خیالات ونظریات سے بھی واقف ہوں، اس زمانے کے علماء میں مولانا شبلی میں یہ دونوں خوبیاں بہ درجہ اتم پائی جاتی تھیں، چنانچہ اس وقت مستشرقین کے جو اعتراضات بہت عام تھے ان کا جواب مولانا نے بہت مدلل اور محققانہ اور اتنے دلنشیں اور دلکش انداز میں دیا کہ مستشرقین کے اعتراضات کے تاروپود بکھر گئے۔''
>
> (اسلام اور مستشرقین، جلد ہفتم، ص:۳)

---

(۱۶۵)

پروفیسر عبدالستار دلوی

[پ: یکم ستمبر ۱۹۳۷ء]

پروفیسر عبدالستار دلوی سابق صدر شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی ماہر لسانیات کے طور پر مشہور ہیں۔وہ اردو کے ممتاز مصنف، مؤلف اور ادیب ہیں۔ان کے قلم سے ایک درجن سے زیادہ

کتابیں مختلف موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں۔ وہ مختلف اداروں کے بانی و مؤسس بھی ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ زبان و قلم سے اردو کی خدمت انجام دی ہے۔ اس وقت بھی انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے ڈائرکٹر اور اس کے ترجمان سہ ماہی نوائے ادب کے مدیر کی حیثیت سے پیرانہ سالی کے باوجود وابستہ ہیں۔ خاص طور پر نوائے ادب کو انھوں نے بڑا معیاری بنادیا ہے۔ اس کے خصوصی شمارے خاص طور پر قابل تحسین ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی نوائے ادب کا ''شبلی نمبر'' بھی ہے جو شبلی صدی [۲۰۱۴ء] کے موقع پر علامہ شبلی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے شائع کیا گیا ہے۔ نوائے ادب کے جو اور نمبر شائع ہوئے ہیں ان کے مقابلہ میں یہ شبلی نمبر قابل ذکر نہیں۔ اگر چہ زیادہ پرانے مضامین شامل کئے گئے ہیں اور مدیر موصوف نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ مگر وقیع مضامین پر مشتمل ہے۔

۱۹۰۳ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس اسی انجمن اسلام بمبئی میں بدرالدین طیب جی [۱۸۴۴-۱۹۰۶ء] کی صدارت میں ہوا تھا، جس میں مولانا حالی، علامہ شبلی اور نواب محسن الملک شریک ہوئے تھے۔ کانفرنس کے اسی اجلاس میں علامہ شبلی نے انجمن ترقی اردو کی پہلی سالانہ مفصل رپورٹ پیش کی تھی۔ اس کا ذکر مدیر نے کیا ہے اور بس اسی تعلق سے یہ شبلی نمبر شائع کیا گیا ہے۔ البتہ علامہ شبلی کا بمبئی سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ تبدیلی آب و ہوا کے لئے وہ اکثر بمبئی کا سفر کیا کرتے تھے اور یہاں کے بہت سے اہل علم سے ان کے روابط قائم ہو گئے تھے۔ اس کی پوری تفصیل اگر چہ اس خصوصی شمارہ میں نہیں آسکی ہے، تاہم علامہ شبلی کے بمبئی سے جذباتی تعلق کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ

> ''شبلی کا بمبئی سے ایک جذباتی و فکری اور علمی رشتہ بھی تھا۔ ان کی فارسی شاعری جس میں انھوں نے بادہ حافظ کی دکان کھول دی بمبئی ہی کی دین ہے۔ سیرۃ النبیؐ کی بابرکت تصنیف کا بھی بمبئی سے رشتہ ہے۔''
>
> (نوائے ادب شبلی نمبر، اکتوبر تا مارچ ۲۰۱۵ء، ص:۴)

البتہ ان کا یہ خیال کہ شبلی کا انجمن اسلام سے کوئی براہ راست تعلق نہیں رہا، نہ ہی کبھی یہاں تقریر کرنے کا کہیں حوالہ جاتی ثبوت ہے۔'' (ص:۳) درست نہیں ہے۔ علامہ شبلی یہاں کئی بار

آئے اور تقریریں کیں۔۱۹۰۳ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس اسی انجمن اسلام میں بدرالدین طیب جی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، اس میں علامہ شبلی شریک تھے۔اس موقع پر انہوں نے تقریر بھی کی۔

اسی طرح علامہ شبلی نے ۰۹-۱۹۰۸ء میں انجمن وقف علی الاولاد کے سلسلہ میں انجمن اسلام میں ڈنر کرنے اور وقف کے موضوع پر مفصل تقریر کرنے کا ذکر خود علامہ شبلی نے کیا ہے۔

(رپورٹ کارروائی انجمن وقف علی الاولاد)

شبلی اور بمبئی کے عنوان سے پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے ایک مقالہ لکھا تھا جو اسماعیل یوسف کالج میگزین میں ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا۔وہ اب کہیں دستیاب نہیں ہے۔ایک اطلاع کے مطابق پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی صاحبزادی نے مذکورہ مضمون کی اصل کاپی پونہ انسٹی ٹیوٹ میں جمع کی تھی۔خدا جانے اب وہاں محفوظ بھی ہے یا نہیں۔بہر حال اس نمبر میں شبلی اور بمبئی پر بھر پور مقالہ ہونا چاہئے تھا۔اور یہ کمی محسوس ہوتی ہے۔البتہ پروفیسر دلوی کا قدر دانان شبلی کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ شبلی صدی کے موقع پر انہوں نے بمبئیات کے مصنف کو یاد رکھا اور خصوصی شمارہ شائع کیا۔

۱۹۸۶ء میں پروفیسر عبدالستار دلوی کے منتخب مضامین کا مجموعہ ''نئی تحریریں'' شائع ہوا۔

اس کے دیباچہ میں انہوں نے بمبئی پر شاد ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''بمبئی اردو کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔اس کی تہذیبی اور تجارتی حیثیت کے پیش نظر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے شاعر اور ادیب یہاں آتے رہے۔یہاں کی زندگی سے انہوں نے روشنی حاصل کی۔کچھ کامیاب بھی ہوئے اور کچھ ناکام بھی رہے۔ایسے ہی لوگوں میں شبلی، اقبال اور پریم چند کا شمار ہوتا ہے۔شبلی نے اپنی ہر متاع کہنہ ونو کو بمبئی پر نثار کر دیا تھا۔اور کنار آب چوپاٹی اور گلگشت اپالو کے گرویدہ ہو گئے تھے۔اس کا رنگین عکس خطوط شبلی اور دستہ گل میں پایا جاتا ہے۔''
>
> (نئی تحریریں، ص:۱۳)

علامہ شبلی اور ممبئی اس اہم عنوان پر مقالہ لکھنے کا قرض ابھی بمبئی کے اہل علم پر باقی ہے۔ علامہ شبلی ممبئی میں کہاں ٹھہرتے تھے؟ اور کن اہل علم سے تعلقات تھے اور وہ کون لوگ تھے جو ان کی

مجالس میں شریک ہوتے تھے۔مولانا ابوالکلام آزاد، سید محمد تقی فخر داعی گیلانی، جگر بسوانی، ایرانی وزیر شیخ محمد وغیرہ کا علامہ شبلی سے ممبئی میں پہلی بار ملنے کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ابھی حال میں پیسہ اخبار میں یہ خبر نظر سے گذری کہ ۱۲ر ستمبر ۱۹۰۶ء کو مولوی رفیع احمد بیرسٹرایٹ لا کی صدارت میں علامہ شبلی کا وعظ ہوا۔اور کثرت سے بمبئی کے اہل علم شریک ہوئے۔ان تمام پہلوؤں کی وضاحت ضروری ہے۔(پیسہ اخبار لاہور، ۱۳ر ستمبر ۱۹۰۶ء، ص:۲)

---

(۱۶۶)

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

[پ:۱۹۳۸ء]

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی ملک کے نامور اہل قلم اور مصنف و مرتب ہیں۔ندوۃ العلما کے فاضل اور عربی زبان و ادب پر گہری نظر رکھنے والے عالم و ادیب ہیں۔وہ کالی کٹ یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے صدر رہے۔انھوں نے متعدد کتابیں سپرد قلم کی ہیں۔ان میں جدید عربی ادب کا ارتقا اور عربی شاعری کے جدید رجحانات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔انھوں نے اردو ادب پر بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔آج سے ۱۸ر برس قبل ڈاکٹر صفیہ بی صدر شعبہ اردو و سنسکرت یونیورسٹی نے ''جہان شبلی'' کے نام سے کتاب لکھی تو اس کا مقدمہ ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی نے سپرد قلم کیا۔یہ کتاب اصلاً سیرۃ النبی کا مطالعہ و جائزہ ہے۔مصنفہ نے آخر میں چند تصانیف کے اسلوب پر مقالات شامل کر کے اس کا نام جہان شبلی رکھ دیا ہے۔ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی نے اس کے دیباچہ میں سیرۃ النبی کی انفرادیت اور اس کے اسلوب نگارش پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے اور لکھا ہے کہ

> ''اردو زبان میں علامہ شبلی نعمانی کی کتاب سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) عظمت و شہرت کی حامل ہے۔اس کتاب نے اردو میں تاریخی تحقیق کا معیار بلند کر دیا ہے اور دعوی کیا جاسکتا ہے کہ اتنی محققانہ کتاب سیرت کسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں علامہ شبلی کا اسلوب بیان بھی پوری دلکشی و رعنائی کے

ساتھ عظمت فن کی ترجمانی کرتا ہے۔ علامہ شبلی نے اپنی زندگی کے آخر میں ایک ایسی علمی شمع روشن کردی ہے جو تا ابد روشن رہے گی۔ حالانکہ جس وقت انھوں نے یہ کام شروع کیا تھا خود ان کی شمع جھلملا رہی تھی مگر ان کی فکری قوت اور فنی عظمت اعلی مرتبہ پر تھی اور جو علمی و تحقیقی سیرت نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی انھوں نے باوجود اپنی علالت کے پیش کردی اس کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے۔''

(جہان شبلی، مقدمہ، ص:۷)

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی نے صرف دعویٰ نہیں کیا ہے بلکہ عربی زبان میں لکھی جانے والی تین کتابوں (محمد رضا کی ''محمد رسول اللہ'' محمد حسین ہیکل کی ''حیاۃ محمد''۔ اور عباس محمود عقاد کی ''عبقریۃ محمد'') سے بحیرا راہب کے واقعہ کو بطور مثال پیش کر کے مذکورہ کتب کی تحقیقی کمزوریاں دکھلائی ہیں اور ثابت کیا ہے کہ مذکورہ کتابوں میں تحقیق کا وہ معیار نہیں جو علامہ شبلی کی سیرۃ النبیؐ میں ہے۔ (ایضاً، ص:۱۹) ڈاکٹر صاحب علامہ شبلی کے اسلوب نگارش کی عظمت کے بھی معترف ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ

''سیرۃ النبی تحقیق کا اعلی نمونہ ہے، یہ تحقیق علامہ شبلی نے اپنے مخصوص اسلوب میں پیش کی ہے، اس بنا پر سیرۃ النبیؐ نہ صرف تحقیق کا شاہکار ہے بلکہ حسن اسلوب میں بھی ممتاز ہے، خصوصاً جو عبارت علامہ شبلی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے موقع پر لکھی ہے وہ ادب وانشا کا اعلی معیار ہے۔ سیرۃ النبی ہمارے ادب میں اعلی تحقیق اور عمدہ اسلوب کا نمونہ ہے۔'' (ایضاً، ص:۱۹)

---

(۱۶۷)

پروفیسر عبدالحق

[پ: ۲۴؍اپریل ۱۹۳۹ء]

پروفیسر عبدالحق امریطس فیلو شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی محتاج تعارف نہیں۔ وہ نامور اہل

قلم، صاحب اسلوب ادیب وانشا پرداز اور صاحب نظر نقاد ہیں۔ ان کی متعدد گراں مایہ کتابیں مقبول عام ہیں۔ تحقیق وتدوین کے میدان میں بھی انھوں نے بڑے نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں، لیکن ان کی محنت وتحقیق وتصنیف وتالیف کی اصل جولان گاہ اقبالیات ہے۔ وہ اس وقت سب سے بڑے ماہر اقبالیات ہیں۔ اقبالیات پر ان کی آدھا درجن کتابیں اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ علامہ اقبال سے تعلق اور پھر علامہ شبلی کی عظمتوں نے انھیں ان کا والہ و شیدا بنا دیا ہے۔ وہ علم ومطالعے کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

> ''ادبی اسلوب وانتقاد کے سرچشمے علامہ شبلی کے سنگ راہ سے پھوٹتے ہیں۔ ان کی ہر نسبت شبلی سے منسوب کی جائے گی۔ محسوس ہوتا ہے کہ تخلیق وتنقید کے آب بقا کا مصدر شبلی کی تحریریں ہیں۔ ایک صدی کا ہدف ہمارے سامنے ہے، اس انداز کا نصیب ہونا کجا دور کا رشتہ و پیوند بھی قائم نہ کر سکا۔ شبلی ابر نیساں بن کر برسے اور کشت ویراں کو نمو اور نمی سے سیراب کر گئے۔ ان کی انتقادی نظر ہمیں بینائی بخشنے میں مدتوں معاون رہے گی، نصف صدی میں کیسے کیسے انتقادی نشیب ونارسائی سے گذرنا پڑا، ادب کا ہر طالب علم ہراساں ہوا ہے۔ نظریات کی گمرہی سے ادب کا زیاں ہوا اور ہم زیاں کار بھی بنے۔ علامہ کے آئین واسالیب نے ہی اس آشوب میں ہمیں استقرار بخشا۔'' (تنقیدی مباحث اور شبلی کا نظام نقد، ص: ۷)

پروفیسر عبدالحق نے علامہ شبلی کی انتقادی فکر اور تنقیدی اسالیب پر کئی مقالے لکھے ہیں۔ ان کا اور بعض دوسرے مضامین کا مجموعہ ''شبلی اور معاصرین'' کے عنوان سے شبلی صدی کے موقع پر نومبر ۲۰۱۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس سے ان کی علامہ شبلی اور افکار شبلی سے گہری وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے، دیباچہ میں انھوں نے علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر وفن کو ان الفاظ میں خراج پیش کیا ہے:

> ''اس میں شک نہیں کہ علامہ کی جنبش نگاہ میں ان گنت حرف راز پنہاں ہیں۔ ایسی تہہ دار شخصیت نایاب ہے۔ علم وعمل کی ہر محفل کو نور وسرور سے چراغاں کرنے والے شبلی ہی ہیں۔ ان کی ذات معجز نمائی کی مثال ہے۔ مختصر مدت میں علم وادب کے حیرت خیز ذخیرے کی تخلیق کرنے والا ہماری یادداشتوں میں ان کے سوا کوئی

دوسرا نہیں ہے۔سرمایہ سخن کی یہ ثروت خامہ حق نے ان کی سرنوشت ہی رقم کی تھی، ان کی کارگہی کے ممکنات کا محاسبہ ہم سے نہ ہوسکا۔ ہماری بدتوفیقی تھی کہ ہم نے ایسی بلندو بالا شخصیت کو تنقید کی کم نگہی کے حوالوں سے دیکھا۔ان کے عالم شش جہات کی بے کراں وسعتوں کے استحضار کے لئے ہماراذہن متحمل نہ ہوسکا،شبلی ابر بہار بن کر برسے اور ہماری کشت ویراں کو خون گرم دہقاں کی حرارت دے گئے ۔ایک صدی کے حادثات نے علامہ کی ناگزیر معنویت پر مہر ثبت کردی۔''

(شبلی اور معاصرین،ص:۵)

علامہ شبلی پر ہونے والی تنقیدوں اور پھران کی تخلیقی انفرادیت اوران کے سلسلہ در سلسلہ تلامذہ کے کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لونی لگنے کی پیش گوئی شرم سار ہوئی۔تصانیف کی اشاعتی سرگرمیاں اور پاک طینت قارئین کے جذب وشوق کی جنوں خیزی بڑھتی رہی مگر یہ عجیب بات ہے کہ اقبال کی طرح شبلی بھی تنقید کا ہدف بنتے رہے،مگران کی توقیر میں اضافہ ہوتا رہا۔ انتقادی بے سوادی یا کم نگاہی ملامت سے دوچار ہوئی،شبلی ہمارے لئے ناگزیر بنتے گئے۔موازنہ سے اتفاق نہ ہو شعرالعجم سے مفر ممکن نہیں ہے۔سیرت وسوانح کے ساتھ ان کی انشاپردازی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ان کی روشن خیالی اور انقلابی فکر کا بھی کوئی حریف نہیں ہے۔تہذیب وتاریخ کے سوز دروں سے ایسی محبت رکھنے والا بھی نظر میں نہیں ہے۔تخلیق کو تاریخی حقائق سے گراں بار کیا۔تخلیق کو واقعات سے ہم آہنگ کیا۔غیر معمولی شاگردوں کا نسب نامہ بھی صرف شبلی سے منسوب ہے۔علم وادب کی دنیا میں سلسلہ تبحر کی سلسبیل صرف شبلی کی ہے۔''

(ایضاً،ص:۵-۶)

تصانیف شبلی تراجم کے ذریعہ عالمی توجہ کا مرکز بنیں اور بلاشبہ یہ افتخار اردو کے عناصر خمسہ میں کسی کے نصیب میں نہ آیا۔تصانیف شبلی کے تراجم کے بارے میں پروفیسر عبدالحق صاحب نے لکھا ہے کہ

”کسی دوسرے ادیب کی جملہ تصانیف کا اس اہتمام سے دوسری زبانوں میں ترجمہ نہ ہوسکا۔ان کی تصانیف کے تراجم نے اردو کو عالمی تعارف وتناظر بخشا۔ الفاروق کے دسیوں زبانوں میں تراجم کو شبلی کے معجزہ فن کی مثال کہہ سکتے ہیں۔ عرض ہنر کا دوسرا کرشمہ سیرۃ النبیؐ ہے۔روئے زمین پر جہاں رحمت عالم کا ذکر ہوگا اس کتاب کا حوالہ باعث برکت ہوگا۔شبلی کو آفریں ہو کہ اردو میں لکھی گئی تنقیدی کتاب شعر العجم کو دنیا کی مؤقر زبان فارسی میں منتقل کیا گیا۔یہ شرف کسی دوسری تنقیدی کتاب کو حاصل نہ ہوسکا۔“ (ایضاً)

اور آخر میں بشارت دیتے ہیں کہ

”ذکر شبلی کے بغیر تنقیدی تذکرہ مکمل یا معتبر نہیں ہوگا۔پوری صدی پر شبلی کے مؤثرات غالب رہے۔آنے والی صدیاں بھی ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتیں۔“ (ایضا)

---

(۱۶۸)

ڈاکٹر شمیم حنفی

[۱۹۳۹-۲۰۲۱ء]

اردو کے ممتاز ادیب، نقاد اور مصنف و مترجم ڈاکٹر شمیم حنفی نے تفہیم شبلی کے اسباب اور ان کی انفرادیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

”اپنے ہم عصروں میں شبلی نے سب سے کم عمر پائی، صرف ستاون برس کی۔سر سید ،حالی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد ان سب کی علمی اور ادبی زندگی کا دائرہ شبلی کے مقابلہ میں وسیع ہے، لیکن شبلی کے علمی وادبی کارنامے اپنے تمام ہم عصروں میں بہت منفرد اور ممتاز ہیں۔تنقید، تاریخ، سوانح، مذہب، مختلف النوع معاشرتی اور تہذیبی موضوعات پر شبلی نے جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا اس کی قدر و قیمت کے

احساس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔شبلی کی تفہیم اور تعبیر کا سلسلہ اسی لئے آج بھی جاری ہے۔

ہمارے یہاں جب سے اس رجحان نے زور پکڑا ہے کہ ہمیں اپنے شعور کو ڈی کولونائز (Decolonize) کر کے اپنی روایت اور اپنے ماضی کا محاسبہ ایک آزادانہ ذہنی پس منظر میں پھر سے کرنا چاہئے، شبلی سے ہمارے فکری رابطوں میں اضافہ ہوا ہے۔شبلی اپنی روایت کا جو شعور رکھتے تھے، اس میں مغربیت کے عناصر کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہے، چنانچہ پچھلے کئی برسوں میں شبلی پر تحقیقی کاموں کی رفتار میں بھی تیزی آئی ہے۔"

(مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ،ص:۹،دہلی ۱۹۹۹ء)

---

(۱۶۹)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری

[۱۹۴۰-۲۰۲۱ء]

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری پاکستان کے ممتاز اہل قلم اور دانشور تھے۔مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] کے بڑے عقیدت کیش ہیں۔ان کے مطالعہ و تحقیق اور تصنیف و تالیف میں زندگی کا بڑا حصہ صرف کیا۔تقریباً ایک درجن کتابیں مولانا آزاد سے متعلق شائع ہو چکی ہیں۔ ہندوستان میں ابوعلی اثری [۱۹۰۳-۱۹۹۴ء] بھی مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک بڑے مداح تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کی شخصیت اور فکر و فن اور سیاسی شعور پر ۴۵؍ سے زائد مضامین لکھے جن کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ایک ہندوستان سے ان کے صاحبزادے جناب ارشد علی انصاری نے "علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد" کے نام سے ۲۰۰۰ء میں شائع کیا۔جبکہ دوسرا مجموعہ "امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد" کے نام سے عبدالمجید کھوکھر یادگار لائبریری گوجرانوالہ سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔اس کا مقدمہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کے قلم سے ہے۔

ذکر آزاد میں علامہ شبلی کا ذکر آہی جاتا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ دونوں میں انتہائی گہرے روابط رہے۔ تعلقات کا آغاز ۱۹۰۱ء میں اس وقت ہوا جب مولانا آزاد نے عربی کتب مصادر کی نشاندہی کے لئے علامہ شبلی کو خط لکھا۔ مولانا آزاد نے کلکتہ سے ماہنامہ لسان الصدق جاری کیا تو علامہ شبلی نے ان کا بڑا علمی تعاون کیا۔ اس زمانہ میں علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے۔ چنانچہ انھوں نے لسان الصدق کو انجمن کا آرگن قرار دیا جس سے اس کے قارئین کا حلقہ وسیع ہوا۔ علامہ نے انجمن کی رپورٹیں اور رودادیں اشاعت کی غرض سے بھیجیں۔ مولانا آزاد علامہ شبلی کی تصنیفی سرگرمیوں سے بھی قارئین لسان الصدق کو آگاہ کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد مولانا آزاد ۱۹۰۵ء میں بمبئی میں علامہ شبلی سے ملے۔ علامہ نے انھیں الندوہ کی ادارت کی پیش کش کی۔ چنانچہ وہ ندوہ آئے اور تقریباً پانچ ماہ علامہ شبلی کے ساتھ قیام پذیر رہے اور الندوہ کی ادارت کی۔ پھر اس علمی رشتے میں اور گہرائی پیدا ہوتی چلی گئی اور علامہ شبلی کی محبت مولانا ابوالکلام سے کبھی کم نہ ہوئی۔ خط وکتابت اور الہلال سے علامہ شبلی کے تعلق کی داستان راقم کی کتاب ''شبلی اور جہان شبلی'' میں قدرے تفصیل سے قلم بند ہوئی ہے۔ (شبلی اور جہان شبلی، ص: ۱۱۶۔۱۲۷)

ابوعلی اثری مرحوم کی کتاب امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد پر ڈاکٹر صاحب نے بڑا مفصل مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں علامہ شبلی کے علم وفضل کا ذکر کیا ہے۔ ان کی علمی کاوشوں کو سراہا ہے۔ ان کے سیاسی نقطہ نظر اور اس کے اثرات کے بارے میں لکھا ہے کہ

> ''عملی سیاست سے ان کا تعلق نہ تھا کہ پیش نظر کاموں کی اہمیت کا نہ کوئی اندازہ شناس تھا، نہ کوئی انجام دینے والا، لیکن ان کی مختصر تحریروں اور نظموں نے جو شعور پیدا کیا اور وقت کی سیاست میں جو رہنمائی کی تھی وہ زمیندار، کامریڈ اور الہلال کی انقلابی تحریکوں سے اہمیت میں کم نہ تھی۔ وقت کے یہ تینوں انقلابی صحافی اور سیاسی رہنما شبلی مرحوم سے متاثر اور ان کے افکار سے کسی نہ کسی حد تک فیض یاب تھے۔ شبلی کی ذہانت، ان کی بصیرت اور نکتہ رسی نے ایک سیاسی شعور اور خاموش فکری تحریک پیدا کی تھی۔ وہ وقت کے بہت بڑے دانشور تھے، ظفر علی اور محمد علی کی تربیت میں ان کا حصہ تھا۔ علی گڑھ کے جمود کو انھوں نے توڑا تھا۔ سرسید کی کاسہ

لیسی کا وہ جواب تھے۔ الہلال کی انقلابی تحریک میں ان کی فکر شامل تھی۔ ان کی علمی، تعلیمی، سیاسی اور سیرت نگاری کی تحریک نے اس پورے دور کا احاطہ کرلیا تھا۔'' (امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، مقدمہ، ص: ۱۴-۱۵)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے مولانا آزاد کی سیاسی فکر پر علامہ شبلی کے اثرات کو واضح طور پر بیان کرنے سے گریز کیا ہے۔ حالانکہ علامہ شبلی کی سیاسی فکر سے وہ سب سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ ماہنامہ الندوہ کی ادارت میں تو وہ مستقل ساتھ رہے۔ بعد میں بھی وہ مستقل آتے رہے اور الہلال کے زمانہ میں بھی وہ علامہ شبلی کے پاس آتے اور ندوہ میں قیام کرتے اور ان سے استفادہ کرتے۔ علامہ شبلی کی سیاسی فکر کو انھیں نے سب سے زیادہ فروغ بخشا۔

علامہ شبلی کا علی گڑھ جانے سے پہلے ایک مشغلہ اہل حدیث علماء سے مناظرہ بھی تھا۔ مولانا محمد فاروق چیریاکوٹی کی صحبت میں حنفیت کا جو مذاق پیدا ہوا تھا وہ اسی کا اثر تھا۔ علی گڑھ جانے کے بعد جب مخالفین اسلام کے اسلام اور مسلمانوں پر اعتراضات اور اس کی شبیہ خراب کرنے کا نیا منظر نامہ سامنے آیا تو علامہ کی تمام تر توجہ اس کی جانب ہوگئی اور پھر انھوں نے کبھی ان مسائل میں دلچسپی نہیں لی۔ یہاں تک کہ ان کے اپنے شہر اعظم گڑھ کی جامع مسجد میں دیوبندی اور اہل حدیث علماء میں آمین بالجبر اور بالسر کو لے کر معرکہ آرائی ہوئی اور اس سلسلہ میں علامہ شبلی سے فتوی مانگا گیا تو انھوں نے حسب ذیل جواب لکھا:

''آمین جو شخص بالجبر کہتا ہے اس کے پیچھے نماز یقیناً درست ہے، نماز تو فاسق کے پیچھے بھی درست ہے اور آمین بالجبر کہنے والا فاسق بھی نہیں ہے اور جماعت سے ایسے شخص کو الگ نہ کرنا چاہئے اور اس شخص کے آمین بالجبر کہنے سے دوسروں کی نماز میں کچھ اثر نہیں پڑتا اور جماعت سے ایسے شخص کو خارج کرنا گناہ ہے۔ ہاں اگر یہ معلوم ہو کہ یہ شخص بنظر تفریق جماعت وفساد انگیزی کے یہ فعل کرتا ہے تو اس کا خارج کرنا جماعت سے روا ہے۔ اور حدیث میں آمین آہستہ وزور سے کہنا دونوں طرح پر آیا ہے۔ واللہ الموفق۔''

محمد شبلی نعمانی بندولی

(بحوالہ چند رجال اہل حدیث، ص:۳۶)

علامہ شبلی کا یہ فتویٰ چند اور فتاوٰں کے ساتھ سعید المطابع بنارس سے ۱۹۰۶ء میں رسالہ کی صورت میں شائع ہوا۔ نوادرات شبلی کی جمع وتدوین میں بے خیالی سے علامہ شبلی کی یہ نادر تحریر اس میں درج ہونے سے رہ گئی۔

اس کے باوجود ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے اس طرح کے اختلافات کا ذکر کیا ہے اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی [۱۹۰۸-۱۹۸۵ء] کے حوالہ سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ان پر کوئی اعتماد نہ کر سکا۔ اس ضمن میں انھوں نے مخالفین شبلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ''ان میں قدیم خیال کے حنفی (دیوبندی، بریلوی) اور اہل حدیث علماء تھے۔ بریلوی علماء مطلقاً اور دیوبند کی ایک جماعت ان کی مخالف ہی رہی۔ سرسید کے تعلیمی وسیاسی تحریک کی مخالفت نے اس دائرہ فکر میں بھی شبلی کا کبھی اعتماد پیدا نہ ہونے دیا۔ اہل حدیث کے لئے شبلی بحیثیت نعمانی کے کبھی قابل قبول نہ ہوئے۔ ان کے لئے جو کشش کسی سلفی یا اثری میں تھی وہ نعمانی میں کبھی نہیں ہوسکتی تھی۔''

(امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، ص:۱۵)

یہاں ڈاکٹر صاحب سے تجزیہ کرنے میں ذرا سی چوک ہوگئی ہے۔ ان کے دور شباب اور دور آخر کے مسائل ومعاملات میں خلط مبحث ہوگیا ہے۔ آغاز شباب میں ان میں وہی جوش وجذبہ اور اشتغال تھا جو فرق اسلامی کے علم برداروں میں عموماً پایا جاتا ہے۔ دور آخر میں ان پر جو اعتراضات تھے، ان کی دو نوعیتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ ان میں جو جدت اور روشن خیالی پیدا ہوئی تھی علمائے دیوبند کا ایک چھوٹا سا حلقہ اس کو ناپسند کرتا تھا اور علامہ شبلی کے دل میں قدیم علماء اور قدیم اسلامی علوم جس کے وہ خود بہت بڑے عالم تھے اور ان پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے، اس کے بڑے حامی تھے۔ سرسید تحریک کے غالی ہم نواؤں کے اس جذبہ اسلامی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بظاہر اسے ان کی ناکامی خیال کیا جاتا ہے لیکن یہ ان کی ناکامی نہیں تھی۔ انھوں نے قوم کو ایک نئی شاہراہ پر ڈالا، جس سے اپنے ماضی سے بے پناہ محبت کا جذبہ پیدا ہوا اور ہر نئی روشنی کو تاریکی تصور کر کے منہ پھیرنے سے روکا۔ آج جب ہم سوا سو برس بعد اس نقطہ نظر کا تجزیہ کرتے ہیں تو علامہ شبلی کے

نقطہ نظر کی صداقت سامنے آتی ہے اور ان کی کامیابی بھی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جمود و تعطل کی جو فضا عہد شبلی میں قائم تھی اور جسے توڑنے کے لئے انھوں نے بڑی جدوجہد کی اس کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ اسے مذہبی حمیت کا نام دیا جاتا ہے۔

سوا سو برس سے مسلمانوں کا ہر قدم زوال سے دوچار ہو رہا ہے اور ہم اسلام مخالف قوتوں کے درمیان پستے چلے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے ہم میں کہیں نہ کہیں کوئی کمی تو ضرور ہے۔ علامہ شبلی کے بعد آج تک کوئی ایسا دانشور نہیں اٹھا جو ہمیں درد کا علاج بتائے۔ ہر تحریک کے افادی پہلو بھی ہوتے ہیں اور جب قومیں مخالفت کرنا اپنا شیوہ بنا لیتی ہیں اور غور و فکر کرنا ترک کر دیتی ہیں تو ان میں پھر علامہ شبلی نہیں پیدا ہو سکتے۔

---

(۱۷۰)

ڈاکٹر فضل امام

[۱۹۴۰-۲۰۱۹ء]

ڈاکٹر فضل امام رضوی ادیب اور نقاد کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کے مضامین کے مجموعے تنقیدی معیار اور افکار و نظریات شائع ہو چکے ہیں۔ کچھ اور کتابیں بھی ان کے قلم سے نکلی ہیں۔ ان کا ایک کارنامہ ''موازنہ انیس و دبیر'' کی ترتیب و تقدیم ہے۔ جسے ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ نے شائع کیا ہے اور جس کے اب تک متعدد ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں اور اب بھی وہ برابر شائع ہو رہا ہے۔

موازنہ انیس و دبیر کی ترتیب و تدوین میں ڈاکٹر فضل امام نے کیا کاوش کی ہے، مقدمہ میں اس کی صراحت نہیں ہے اور کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیق متن میں انھوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی ہے۔ ہاں ایک مبسوط مقدمہ ضرور ان کے قلم سے ہے، جس میں انھوں نے موازنہ کی اولیت کا اعتراف کیا ہے۔ باوجود اس کے انھوں نے علامہ شبلی اور موازنہ انیس و دبیر پر اتنے اعتراضات کئے ہیں کہ شاید ہی کسی اور نقاد نے کئے ہوں۔ وہ جس طرح دبیر کے مداح اور علامہ

شبلی کے ناقد ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید دبیر یے ہیں؟ بہر حال ان کے اعتراضات ملاحظہ ہوں:

ا۔ موازنہ انیس و دبیر کی جہتیں ہی فی نفسہ موزوں اور مناسب نہیں، دونوں شاعروں کی نہاد فکر ہی مختلف اور منفرد ہے تو موازنہ اور تقابل کس کام کا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ردالموازنہ، تردیدالموازنہ اور المیز ان تک نوبت پہونچی۔''

(مقدمہ، ص:٦)

٢۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی اس تصنیف کا نام موازنہ انیس و دبیر رکھ کر غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ (ایضاً، ص:٩)

٣۔ انیس کے کلام کی صفات بیان کرنے میں وہ ایک کامیاب صاحب طرز انشا پرداز ضرور ثابت ہوتے ہیں لیکن تنقید نگاری کے مزاج اور معیار کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔'' (ایضاً)

٤۔ شبلی نعمانی کی تنقید نگاری کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ شخصیتوں سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔'' (ایضاً)

٥۔ شبلی انیس کے محسنات شعری بیان کرنے میں زبردست تضادات کا شکار ہوئے ہیں اور یہ بھول گئے ہیں کہ ان کے قلم سے کیا لکھا جا چکا ہے اور خود اس کی تردید کس طرح کرتے ہیں، موازنہ کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ ہر جگہ اپنی ذاتی پسند کو اہمیت دیتے ہیں اور اس کے بعد اسباب پسندیدگی تلاش کرتے ہیں جس کے نتیجے میں خود اپنا بیان ذہن نشین نہیں کر پاتے۔ اور جا بجا ٹھوکریں کھاتے ہیں۔'' (ایضاً، ص:١٠)

٦۔ یوں تو شبلی کی سبھی تحریروں میں تضادات اور تردیدات کا پہلو نمایاں ہے لیکن موازنہ میں اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔'' (ایضاً ص:١٢)

٧۔ جہاں تک سوال کلام انیس اور دبیر کے موازنے کا ہے یہ بھی ایک مستند اور مدلل المیہ ہے کہ شبلی نے دبیر کے مراثی کے وہ ٹکڑے اور حصے نہیں پیش کیے ہیں جو واقعی

انیس کے ہم پلہ قرار دیئے جاسکتے ہیں، اس غیر محتاط تقابل میں شبلی سے فاش غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں، جیسے بعض ایسے کلام کو مرزا دبیر کا کلام کہہ کر نقل کیا گیا ہے اور کلام انیس سے موازنہ کیا گیا ہے، جو سرے سے مرزا دبیر کا کلام ہی نہیں ہے۔"

(ایضاً ص:۱۳)

۸۔ شبلی نعمانی اردو مراثی کی مفصل تاریخ اور مواد کا بھی مطالعہ نہیں رکھتے تھے اور تقابلی مطالعے کے لئے متن کی چھان بین اور صحت کی ضرورت پر بھی توجہ نہیں کرتے تھے۔" (ایضاً ص:۱۴)

۹۔ وہ تاریخ مرثیہ، صنف مرثیہ اور موضوع مرثیہ کے سلسلے میں ناقص اور ادھورا علم رکھتے ہیں۔ حالانکہ علامہ شبلی نے تاریخ اسلام بھی لکھی ہے اور مورخ کی حیثیت سے بھی متعارف ہیں، لیکن موازنہ کی روشنی میں ان کی تاریخ دانی بھی ضعیف نظر آتی ہے۔" (ایضاً)

۱۰۔ اور بہت سی مثالیں ان کی تاریخی کتب میں بھی موجود ہیں، جہاں وہ تاریخیت کا خون کر دیتے ہیں اور تاویلات وتدلیسات سے کام لیتے ہیں۔ شبلی کا انتشار ذہنی یوں تو ان کی بھی کتب کا طرہ امتیاز ہے لیکن اس کی واضح اور مضحکہ خیز مثالیں موازنہ میں ملتی ہیں۔" (ایضاً)

ان شدید تنقیدوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فضل امام کس درجہ کے نقاد ہیں۔ قاری کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ انھوں نے موازنہ کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، لیکن دراصل ان کا یہ جائزہ اوران کے خیالات موازنہ کے جواب میں لکھی جانے والی جوابی کتابوں المیزان، ردالموازنہ، اور تردیدالموازنہ کا خلاصہ ہیں۔ اسے تنقید کے بجائے تبرئی کہنا چاہئے۔

اردو ادب بالخصوص نقد وانتقاد میں "تبرئی" بھی ہمارے ادب کا حصہ رہا ہے، جس کے مطالعہ وجائزہ کی اب تک کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اکثر یہ ادب وہاں وجود میں آتا ہے جہاں نقادوں کے دلائل کمزور پڑجاتے ہیں، یا ان کے ترکش میں تیر باقی نہیں رہتے۔ اور جس پر نقد کر رہے ہوں وہ سنی مسلمان ہو۔

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ ''موازنہ انیس و دبیر'' اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ اس سے پہلے نہ مرثیہ پر کوئی کتاب لکھی گئی تھی اور نہ انیس و دبیر کے موازنہ اور فکر و فن پر ہی کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ انیس کی شاعرانہ عظمت نے علامہ شبلی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

موازنہ انیس و دبیر تقابلی ادب کا بھی اردو میں پہلا نمونہ ہے۔ نقش اول میں جو کمیاں ہوتی ہیں اور جو ہونی چاہئے وہ موازنہ میں بھی در آئی ہیں، لیکن نفس موضوع ہی کو غلط قرار دینا، حتیٰ کہ کتاب کے نام کو غلط کہہ دینا۔ یا موازنہ میں انتشار ذہنی کی نشاندہی کرنا، یا ان کی تمام تاریخی کتب کو ضعیف قرار دینا اور تاویلات و تدلیسات کا مجموعہ بتانا خود فاضل نقاد کے انتشار ذہنی کا پتہ دیتا ہے۔ علامہ شبلی اردو تنقید کے بانیوں میں ہیں اور ڈاکٹر فضل امام کو وہ نقاد ہی نظر نہیں آتے۔ اسے کوتاہی اور کم نظری کے سوا اگر اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا ہے تو وہ وہی ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔

موازنہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس پر جس قدر اعتراض ہوتا ہے اسی قدر زیادہ پڑھی جاتی ہے اور یہ شرف اسی کتاب کو حاصل ہے کہ یہ نہ صرف ذوق شعر و ادب میں اضافہ کرتی ہے بلکہ ادبی و تنقیدی شعور کو بھی جلا بخشتی ہے۔ راقم نے اپنی کتاب ''آثار شبلی'' میں تنقیدات موازنہ کے جوابات دیئے ہیں، جس میں ڈاکٹر فضل امام مرحوم بھی شامل ہیں۔

ان تمام اعتراضات اور تنقیدات کے باوجود ڈاکٹر فضل امام ''موازنہ انیس و دبیر'' کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں کہ

> ''اس سے قطعی انکار نہیں کہ سب سے پہلے باضابطہ طور پر انیس شناسی کے میدان میں علامہ شبلی نعمانی کا موازنہ منصۂ شہود پر آتا ہے، لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنے میں قطعی تردد نہیں ہونا چاہئے کہ موازنہ انیس و دبیر کی جہتیں ہی فی نفسہ موزوں و مناسب نہیں۔ دونوں شاعروں کی بنیادی فکر ہی مختلف ہے تو موازنہ کس کام کا۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ ردالموازنہ، اور المیزان تک نوبت پہنچی۔ بہرحال اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ تمام تر اختلافات اور تردیدات کے باوجود موازنہ کو انیس شناسی کی سرخیل کیا جائے۔'' (انیس شخصیت اور فن، ص: ۲۰)

(۱۷۱)

مولانا محمد ثناء اللہ عمری

[پ:۱۹۴۰ء]

مولانا محمد ثناء اللہ عمری ایم اے بڑے مصنف اور اہل قلم ہیں۔ان کے قلم سے متعدد گراں مایہ کتابیں نکل کر مقبول ہو چکی ہیں۔خاص طور پر انہیں تذکرہ نگاری میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ ان کی کتابوں کے نام یہ ہیں: کاروان حق، تذکرہ واجدی، کہکشان جامعہ، بات ایک مسیحانفس کی، آثار رفتگاں، نذرانہ اشک، مجھے یاد آنے والے، وغیرہ

علاوہ ازیں ڈاکٹر ابراہیم احمد عددی کی کتاب ''علامہ رشید رضا'' کو مولانا محمد ثناء اللہ عمری نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جسے خود مترجم نے ۲۰۰۲ء میں شائع کیا ہے۔اس کے پیش لفظ میں فاضل مترجم نے علامہ رشید رضا سے اپنی واقفیت کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

''علامہ رشید رضاؒ [۱۸۶۵-۱۹۳۵ء] کے نام نامی اور اسم گرامی سے روشن دلان سلف کے اس نامہ سیاہ عقیدت مند اور سوانح نگار کی پہلی واقفیت جامعہ دار السلام عمر آباد کے در و دیوار کی مرہون منت ہے جبکہ وہ یہاں طفل مکتب تھا۔ ع

ماطفل کم سواد و سبق قصہ ہائے دوست

خوب یاد ہے، یہ واقفیت اس عنوان سے ہوئی تھی کہ علامہ اپریل ۱۹۱۲ء میں علامہ شبلی کی دعوت پر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو کے جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت کے لئے تشریف لائے تھے۔ع

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے

کئی باتیں اس انتخاب کی اہمیت دل میں بٹھا دینے والی تھیں۔معزز مہمان، موقر میزبان سے سات آٹھ برس چھوٹے تھے۔یہ بھی تھا کہ علامہ رشید رضا ''المنار'' کے ایڈیٹر تھے تو علامہ شبلی علم و فضل کے روشن مینار تھے۔مسلم ادیب اور مصنف تھے۔ تقسیم اسناد کا جلسہ ندوۃ العلما کا تھا۔اس کا صدر برصغیر ہند کے کسی شہر دہلی

لاہور وغیرہ سے نہیں، سات سمندر پار مصر سے آرہا تھا اور اس بحرِ علم وعمل نے اپنے ملک مصر سے ہمارے ملک ہندوستان تک کا ہزاروں میل کا فاصلہ دشوار گذار اور دقت طلب بحری راستے سے طے کیا تھا۔ ہوائی سفر کا اس وقت بس نام ہی نام تھا۔ ایسے میں اس انتخاب کے منتخب روزگار ہونے میں کیا کلام ہوسکتا تھا! ایک علامہ نے دوسرے علامہ کو ایک بڑے کام کے لئے بلایا تھا۔ ع

قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

(علامہ سید رشید رضا، ص، ہ]

مدارس کی تاریخ میں علامہ شبلی کا علامہ رشید رضا کو ندوہ کے اجلاس کی صدارت کے لئے مدعو کرنا اور ان کا تشریف لانا، بلاشبہ اس دور میں بہت بڑی بات تھی۔

علامہ شبلی نے ندوہ کے لئے بہت کچھ کیا۔ اسے معمولی مدرسہ سے ایک بڑے مدرسہ اور ادارہ کی شکل انہی نے دی۔ ملک کی متعدد ریاستوں سے اس کے لئے ایک مشت یا ماہوار امداد کی راہ انہی نے ہموار کی۔ ندوہ کے سلسلہ میں ان کی اولیات میں عالم عرب سے اس کا رشتہ قائم کرنا بھی شامل ہے۔ یعنی سب سے اول انہی نے ایک عرب کو بلا کر تحریک ندوہ سے واقف کرایا اور بتایا کہ علمائے ندوہ کے کیا عزائم ہیں۔

---

(۱۷۲)

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی

[پ: ۱۹۴۲ء]

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کے سابق ڈائرکٹر اور ماہنامہ معارف کے سابق مدیر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی علامہ شبلی اور ان کی فکر ونظر پر گہری نگاہ ہے۔ انگریزی اور اردو میں انھوں نے متعدد مقالات لکھے ہیں۔ علامہ شبلی کی کئی نادر تحریریں، مراسلات اور قصائد وغیرہ ان کی دریافت ہیں، جنھیں انھوں نے معلومات افزا حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے۔

یہی نہیں انھوں نے علامہ شبلی کی صحیح تاریخ پیدائش کی بھی تعیین کی ہے۔۴؍جون ۱۸۵۷ء کی تاریخ انہی کی طے کردہ ہے۔اس سے پہلے ہمارے کرم فرما ڈاکٹر محمد طاہر مرحوم [م: یکم جنوری ۱۹۹۶ء] سابق صدر شعبہ اردو شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ نے اپنی تحقیق سے ۳؍جون ۱۸۵۷ء کی تاریخ طے کی تھی۔

ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی صاحب کا اسلوب نگارش خاص طور پر قابل ذکر ہے۔وہ بڑی شستہ اور شگفتہ نثر لکھتے ہیں۔دوسرے موضوعات پر بھی ان کی جو مختصر کتابیں اور مقالات شائع ہوئے ہیں ان میں بھی یہ خوبی موجود ہے۔

دارالمصنفین کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے انھوں نے مطبوعات دارالمصنفین پر جو دیباچے لکھے ہیں وہ خاصے اہمیت کے حامل اور قابل ذکر ہیں۔

۲۰۱۱ء میں راقم نے ''کتابیات شبلی'' مرتب کی جسے دارالمصنفین نے بہت اہتمام سے شائع کیا۔اس کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی کی علمی، تحقیقی، ادبی اور ملی خدمات کی وجہ سے ان کی حیات اور کارناموں کے بارے میں خود ان کی زندگی میں بہت کچھ لکھا گیا اور اس کے بعد مسلسل لکھا جاتا رہا ہے۔اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مختلف اسباب کی وجہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، ان پر اتنا کام نہیں ہوسکا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے، اس کے باوجود ان کی گوناگوں خدمات کے بارے میں گذشتہ تقریباً ایک صدی کے عرصہ میں جو کچھ لکھا گیا وہ کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے بہت وقیع ہے۔'' (کتابیات شبلی، ص:۵)

دارالمصنفین نے ۲۰۱۳ء میں راقم کی ضخیم کتاب ''آثار شبلی'' شائع کی۔اس میں علامہ شبلی کی تمام دستیاب علمی وادبی اور تاریخی تحریروں کا مفصل تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔دراصل یہ ''حیات شبلی'' کا تکملہ اور دوسرا حصہ ہے۔اس کے دیباچہ میں علامہ شبلی کی علمی کاوشوں اور ان کی حیرت انگیز کوششوں اور کاوشوں کے بارے میں ظلی صاحب نے لکھا ہے کہ

> ''علامہ شبلی نعمانی ایک عبقری، عہد ساز اور کثیر الجہات شخصیت کے حامل تھے۔ان

کی خدمات، علم وادب اور تحقیق وتصنیف تک محدود نہیں ہیں جو اصل میدان کار تھا، بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ مسلمانوں کی علمی، فکری، ملی، دینی، سماجی اور سیاسی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جوان کی مختصر زندگی میں کسی نہ کسی وقت ان کی توجہ کا مرکز نہ بنا ہو۔ علم وتحقیق کے میدان میں انھوں نے ایک ایسی روایت کی طرح ڈالی جو مغرب میں رائج معیار تحقیق سے ہم آہنگ تھی اور اس وقت تک بر صغیر کے علمی حلقوں میں معروف نہیں تھی۔ ان کے قلم سے سیرۃ النبی اور الفاروق جیسے شہ پارے نکلے جن کی اہمیت، معنویت اور ندرت ایک صدی بعد بھی ویسے ہی قائم ہے۔ علم وادب، تحقیق وتصنیف اور تعلیم کے فروغ اور توسیع کے میدان میں ان کی خدمات غیر معمولی حیثیت کی حامل ہیں اور ان میں متعدد کو علمی دنیا میں اولیات کا درجہ حاصل ہے۔ تحقیق وتصنیف کے میدان میں ان کے کارناموں میں بڑا تنوع ہے، یہ یقین کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ اتنے مختلف اور متنوع موضوعات پر یہ شاہکار تصنیفات ایک ہی مصنف کے قلم سے نکلی ہیں۔ مسلسل بیماریوں اور بے شمار موانع ومشکلات کے باوجود ایک مختصر زندگی میں انھوں نے جو کچھ کر دکھایا اسے غیر معمولی ہی کہا جاسکتا ہے۔'' (آثار شبلی، ص:۱۳)

آثار شبلی کے زمانہ تصنیف میں الندوہ کے شذرات شبلی پر نظر پڑی جو سو برس سے اس کی فائلوں میں دبے پڑے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ کی ایک ایک تحریر شائع کی۔ غالباً اس کی طرف ان کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ ورنہ وہ اسے ضرور شائع کرتے۔ چنانچہ راقم نے ان کی جمع وترتیب کا کام شروع کیا۔ ماہنامہ الندوہ کے شمارے کسی لائبریری میں یکجا نہیں تھے۔ اس لئے مختلف کتب خانوں کا چکر لگایا۔ بہر حال ایک برس کی مسلسل تگ ودو کے بعد انھیں مرتب کرنے میں کامیابی ملی۔ شبلی صدی کے موقع پر دارالمصنفین نے اسے بڑے اہتمام سے شائع کیا اور ڈائرکٹر دارالمصنفین نے ''شذرات شبلی'' کو قدردانان شبلی کے لئے ایک نادر تحفہ قرار دیا۔ اس کے دیباچہ میں پروفیسر ظلی نے علامہ شبلی کی خدمات ندوہ کا ایک عمدہ مرقع پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ

''ندوہ میں قیام کے دوران علامہ شبلی نے جو بڑے علمی اور ملی کام انجام دیئے ان

میں اپنے نتائج کے لحاظ سے ماہنامہ الندوہ کے اجرا کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔
الندوہ صرف ایک اعلیٰ درجہ کا علمی و تحقیقی مجلّہ ہی نہیں تھا جس میں بڑے بلند پایہ
مضامین چھپتے تھے بلکہ اس نے ایک علمی تحریک کی صورت اختیار کرلی تھی۔ایک
طرف اس نے نئی تعلیم یافتہ نسل کو مسلمانوں کے مذہبی اور علمی کارناموں سے
روشناس کیا تو دوسری طرف طبقہ علماء کو نئے زمانے کی ضروریات، تقاضوں اور
اسلوب سے آگاہ کیا اور انھیں اسلام اور تاریخ اسلام پر کئے جانے والے
اعتراضات کے علمی اور تحقیقی جواب بھی فراہم کئے گئے۔علماء اور مدارس اسلامیہ
میں زیر تعلیم طلبہ کو تحقیق و تصنیف کے نئے اسلوب اور انداز سے متعارف کیا اور
انھیں اپنے علمی ذخیروں کو استعمال کرنے کا سلیقہ سکھایا۔اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا
کہ نوجوان علماء اور طلبہ کے اندر علمی موضوعات پر لکھنے کا شوق اور سلیقہ پیدا ہوا۔
ان میں سے کئی نے علم وادب کی خدمت میں بڑی ناموری حاصل کی اور تصنیف و
تالیف کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔اس طرح نئے لکھنے والوں
کی علمی اور تصنیفی تربیت میں الندوہ کا کردار بہت اہم رہا ہے۔''
(شذرات شبلی، ص:۱۱)

علامہ شبلی کے تعلیمی نظریات کے مطالعہ میں شذرات شبلی سے اب تک اہل علم نے استفادہ
نہیں کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کے نہ صرف تعلیمی نظریات بلکہ اس سلسلہ میں ان کی جدو
جہد کا ایک نیا منظرنامہ ان شذرات میں محفوظ ہے۔

۲۰۱۳ء میں دارالمصنفین نے ڈاکٹر شمس بدایونی کے مضامین کا مجموعہ ''شبلی کی ادبی وفکری
جہات'' شائع کیا۔اس کے دیباچہ میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے لکھا ہے کہ

''علامہ شبلی نے جتنے متنوع اور کثیر الجہات موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اردو زبان و
ادب کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے
جس موضوع پر قلم اٹھایا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہی ان کا موضوع اختصاص تھا اور
اسی کی تحصیل ان کی عمر کا حاصل۔یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی سے ان کے افکار اور ان

کی تصنیفات اہل علم کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہے۔ گذشتہ ایک صدی کے دوران ان کی تصنیفات کی ایک تسلسل سے نکلنے والی اشاعتیں ان کی مقبولیت کی شاہد ہیں۔'' (شبلی کی ادبی وفکری جہات، ص:۵)

۲۰۱۴ء شبلی صدی کا سال تھا۔ چنانچہ ہندوپاک کے مختلف شہروں میں اس کی تقریبات منعقد ہوئیں۔ خود دارالمصنفین نے اس کا بڑا اہتمام کیا۔ چار روزہ بین الاقوامی سمینار کے علاوہ متعدد کتابیں علامہ شبلی کی حیات وخدمات پر شائع ہوئیں۔ اسی سلسلہ میں دارالمصنفین نے ڈاکٹر آفتاب صدیقی کی کتاب ''شبلی ایک دبستان'' بھی شائع کی۔ اس کے دیباچہ میں پروفیسر ظلی نے نہ صرف کتاب کی اہمیت کا ذکر کیا ہے بلکہ مصنف کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ چونکہ ''حیات شبلی'' محض سوانح عمری ہے اور سید صاحب اسی وجہ سے اس کا ایک حصہ قلم بند کرنا چاہتے تھے جو نہ ہوسکا۔ اس کتاب کی اشاعت سے ظلی صاحب نے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش بتایا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے ناچیز کی کتاب '' آثار شبلی'' شائع ہوچکی تھی، جس میں اب تک کے دستیاب علامہ کے علمی مواد اور ذخیرہ تصنیفات کا مکمل جائزہ پیش کیا جاچکا تھا۔ اور وہ دراصل حیات شبلی کی تکمیل اور اس کا حصہ دوم ہے۔

شبلی صدی کے موقع پر دارالمصنفین نے جو اہم کتابیں شائع کیں، اس میں ہمارے کرم فرما ڈاکٹر خالد ندیم صاحب کی کتاب ''شبلی کی آپ بیتی'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے دیباچہ میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے علامہ شبلی کی غیر معمولی شخصیت اور ان کی مساعی جلیلہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''علامہ شبلی نعمانی غیر معمولی حالات میں پیدا ہونے والے ایک غیر معمولی انسان تھے۔ مختصر فرصت حیات میں بیماری کے شدید اور طویل وقفوں اور سخت ذاتی مسائل اور مصائب کے باوجود انھوں نے جو علمی وفکری ورثہ چھوڑا ہے وہ حیرت انگیز ہے لیکن دین وملت کے لئے ان کی خدمات اور احساسات یہیں تک محدود نہیں بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہے اور یہ ان کی کثیر الجہات شخصیت کا محض ایک پہلو ہے۔ مبدء فیض سے ان کو دردمند دل عطا ہوا تھا، دین وملت کے لئے درد

مندی اور دل سوزی ان کی شخصیت کا نمایاں ترین پہلو تھا، جس دردمندی، دل سوزی اور حوصلہ سے ملی مسائل کے لئے انھوں نے کوشش کی اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔'' (شبلی کی آپ بیتی، ص:۷)

علامہ شبلی کے سیاسی اور علمی وفکری اثرات کا مطالعہ اب تک ہمارے اہل قلم کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکا ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ظلی نے لکھا ہے کہ

''برصغیر کے مسلمانوں کی دینی، ملی اور سیاسی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جو کسی نہ کسی وقت ان کی توجہ کا مرکز نہ بنا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس پورے خطے میں مسلمانوں کے مختلف ادارے، انجمنیں اور تحریکیں علمی، فکری اور عملی سطح پر جو کچھ کر رہی ہیں ان کا سرا کہیں نہ کہیں علامہ شبلی سے جا ملتا ہے۔ ماضی کے گہرے مطالعہ اور تجزیہ اور حال کے حقیقت پسندانہ مشاہدہ نے ان کے اندر مستقبل آگاہی کا شعور پیدا کر دیا تھا، چنانچہ انھوں نے برصغیر میں مستقبل میں ممکنہ طور پر ابھرنے والی صورت حال کا کسی قدر ادراک کر لیا تھا۔ اسے انھوں نے قوم کے سامنے پوری دل سوزی اور جرات سے پیش کیا۔'' (ایضاً، ص:۷)

کاش کوئی اہل قلم علامہ شبلی کے ان افکار کا تسلسل سے مطالعہ کر کے ان کے ذہنی وفکری اثرات واضح کرتا اور دکھاتا کہ علامہ شبلی کے اثرات کہاں کہاں اور کس نوع سے مرتب ہوئے۔

علامہ شبلی کے محققانہ مقالات سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ ان کی داد سرسید احمد خان نے علامہ شبلی کو دی تھی۔ قیام علی گڑھ کی یادگار ان کے علمی وتاریخی مقالات کا ایک مجموعہ جو خود علامہ نے ''رسائل شبلی'' کے نام سے مرتب کیا تھا، جو ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا تھا۔ شبلی صدی مطبوعات کے تحت دارالمصنفین نے بطور یادگار اسے شائع کیا ہے۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے اس کا جو دیباچہ لکھا ہے وہ بہت اہم اور قابل مطالعہ ہے۔ چونکہ وہ خود تاریخ کے آدمی ہیں اس لئے ان کے جذبات بھی اس میں آگئے ہیں۔

پروفیسر ظلی صاحب کی شبلی شناسی، شبلی صدی بین الاقوامی سمینار کی رپورٹ اور روداد سے پورے طور پر سامنے آجاتی ہے۔ اس موقع پر انھوں نے ماہنامہ معارف کا ''شبلی نمبر'' بھی شائع

کیا۔ ماہنامہ معارف کی تاریخ میں یہ اس کا اگر چہ دوسرا خصوصی شمارہ تھا، تاہم وہ اپنے مشمولات اور مقالات کے لحاظ سے ہندوپاک سے شائع ہونے والے تمام خصوصی شماروں پر سبقت لے گیا، اس کی دو بڑی خصوصیات ہیں۔ایک یہ کہ بعض بالکل اچھوتے اور منفرد موضوعات پر مقالات شامل ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں کوئی بھی مقالہ مطبوعہ شامل نہیں کیا گیا ہے۔

شبلی صدی سمینار میں پیش کئے گئے مقالات کا مجموعہ بھی ظلی صاحب کی ترتیب وتقدیم کے ساتھ ۲۰۱۶ء میں دارالمصنفین نے ''مطالعات شبلی'' کے نام سے شائع کیا۔ اس کا دیباچہ بھی ظلی صاحب نے جی لگا کر لکھا ہے اور علامہ شبلی کے کئی اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''زندگی بھر بیماریوں کا ایسا ساتھ رہا کہ ۵۷ر سال کی عمر میں ۸۰ر سال کے بوڑھے نظر آتے تھے۔ کثرت مطالعہ سے آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ اخیر میں بیماری کی شدت کا یہ عالم تھا کہ بمشکل چند لقمہ غذا رہ گئی تھی اور ایک گھنٹہ سے زیادہ پڑھنے لکھنے کا کام نہ کرسکتے اور کئی مرتبہ اس سے بھی معذور رہتے۔ اس کے باوجود اپنے پیچھے علم وادب، تحقیق وتصنیف اور عملی خدمات کا اتنا بڑا سرمایہ یادگار چھوڑ گئے کہ ایک صدی کا طویل عرصہ گذرنے کے بعد بھی اس کے جملہ مضمرات ابھی تک سامنے نہیں آسکے ہیں۔'' (مطالعات شبلی، ص:۷)

علامہ شبلی ۱۶ر سال علی گڑھ سے وابستہ رہے، اس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

''علامہ شبلی کی خدمات اور اکتسابات کا دائرہ صرف علم ودانش اور تحقیق و تصنیف تک محدود نہیں تھا جو ان کا اصل میدان تھا اور جس اقلیم کے وہ تاجدار تھے، ایم اے او کالج کے تدریسی عملہ میں سرسید کے عہد میں اصحاب کمال کا مجمع تھا لیکن یہ امتیاز صرف ان کو حاصل ہے کہ وہ کالج کے پروفیسر ہی نہیں تھے بلکہ ان کا شمار سرسید کے اہم رفقا میں ہوتا تھا۔ کالج اور علی گڑھ تحریک کے لئے ان کی خدمات غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ اگر چہ ان کا قرار واقعی اعتراف نہیں کیا گیا اور ان کے بھرپور تعارف وتجزیہ کا کام باقی ہے۔'' (ایضاً، ص:۸)

دوسرے علمی وتعلیمی اداروں کے حوالہ سے علامہ شبلی کی جو خدمات ہیں ان کے بارے

میں لکھا ہے کہ

''انھوں نے کئی علمی اداروں کے تخیل، منصوبہ بندی اور تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کیا جن میں سب سے اہم نام جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کا ہے۔ ان کے قائم کئے ہوئے اداروں میں نیشنل اسکول خاص طور سے قابل ذکر ہے جو اب ایک عظیم الشان پوسٹ گریجویٹ کالج کا قالب اختیار کر چکا ہے۔ ندوۃ العلما جن خصوصیات کے لئے جانا پہچانا گیا اور جو علمی دنیا میں اس کی شناخت قرار پائیں وہ سب علامہ شبلی کی دین اور ان کی کوششوں کی مرہون منت تھیں۔ مدرسۃ الاصلاح کی ابتدائی اٹھان میں ان کا ہاتھ رہا، دارالمصنفین ان کا خواب تھا جس کو ان کے تلامذہ نے پورا کیا۔ ان کے علمی و فکری ورثہ کا ایک بہت اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے تلامذہ کی ایک پوری ٹیم تیار کر دی جس نے ایثار و قربانی کی اعلیٰ ترین مثال قائم کرتے ہوئے ان کے مشن کو پوری قوت اور آب و تاب سے جاری رکھا اور اس کے نتائج خاص طور سے دارالمصنفین کی عظیم الشان خدمات کی صورت میں دنیا کے سامنے ہیں۔'' (ایضاً ص:۸-۹)

علامہ شبلی میں ملی حمیت اور غیرت اسلامی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کے ذکر میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے لکھا ہے کہ

ملی دردمندی کے میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ دنیا کے کسی حصہ میں اسلام پر کوئی حملہ ہو یا کہیں بھی مسلمانوں کو زک پہونچے وہ ذاتی طور پر اس کا درد محسوس کرتے تھے اور اس کی مدافعت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ زندگی بھر اسلام کے خلاف اغیار کے حملوں کا دفاع کیا اور اس کے لئے ہمیشہ سینہ سپر رہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کو خاص طور سے اپنی تاریخ سے جوڑنا اور ان کے اندر روشن ماضی پر فخر کا احساس پیدا کرنا ایک ایسا کارنامہ ہے، جس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔'' (ایضاً ص:۹)

ظلی صاحب نے جہاں اداروں کے حوالہ سے خدمات شبلی کا ذکر کیا ہے، اس میں ایک

اضافہ کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور اس کے ذیلی ادارہ انجمن ترقی اردو، جس کے علامہ شبلی پہلے سکریٹری مقرر ہوئے تھے۔ ان دونوں کے حوالہ سے علامہ شبلی کی خدمات کا بالتفصیل مطالعہ نہیں کیا گیا ہے مثلاً وہ ایجوکیشنل کانفرنس میں پہلی بار کب شریک ہوئے، اور کتنے اجلاسوں میں شریک رہے۔ کیا کیا قراردادیں پیش کیں، کتنی منظور ہوئیں اور کتنی نامنظور۔ اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ اسی طرح انجمن ترقی اردو کے حوالہ سے بھی محض چند مضامین ہی لکھے گئے ہیں اور خاطر خواہ جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ اب ناچیز نے ان دونوں موضوعات پر مستقل کتابیں ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی کا حصہ'' اور ''علامہ شبلی اور انجمن ترقی اردو'' لکھ دی ہیں۔ پہلی کتاب دارالمصنفین کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔ جبکہ دوسری کتاب مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتا نے شائع کی ہے۔

شبلی صدی مطبوعات میں ایک اہم کتاب ''شبلی شناسی کے اولین نقوش'' دارالمصنفین نے شائع کی ہے۔ اسے مشہور محقق پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے مرتب کیا ہے۔ وہ علامہ شبلی کے افکار ونظریات کے بڑے واقف کار تھے اور شبلی شناسی پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ چنانچہ انھوں نے علامہ شبلی پر ان کے بزرگ، معاصرین، تلانذہ وغیرہ کی تحریروں کو یکجا کر دیا ہے۔ ظلی صاحب نے اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ

> ''علامہ شبلی کی تصنیفات کو جو قبول عام ملا وہ کم مصنفین کو نصیب ہو سکا، اسی طرح ان کے عہد کے ارباب کمال اور اہل قلم نے جس قدر ان کی تحریروں پر اظہار خیال کیا ہے اتنا شاید ہی کسی ہم عصر مصنف کی نگارشات پر کیا گیا ہو، جس طرح ان کی تصنیفات کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے اسی طرح ان کے بارے میں اظہار خیال کرنے والوں اور ان کے تاثرات کی نوعیت میں بھی بہت تنوع ہے۔ یہ تاثرات مادحانہ بھی ہیں اور ناقدانہ بھی۔ ان کے اندر تحسین اور اعتراف کمال بھی ہے اور تنقید بھی۔ کہیں تحسین میں مبالغہ کی آمیزش ہوگئی ہے تو کہیں تنقید میں تندی اور تلخی آ گئی ہے۔ جب معاملہ شبلی جیسے ہشت پہل شخصیت کا ہو تو ایسا ہونا بھی چاہئے، جس طرح تحسین اور اعتراف کمال سے کام کی تحریک ہوتی ہے اسی طرح

صحت مند تنقید سے صاحب نظر محقق کو رہنمائی ملتی ہے۔ البتہ جہاں تک معاندانہ تنقید کا تعلق ہے تو اس سے صرف تنقید نگار کے مزاج اور افتاد طبع کا اظہار ہوتا ہے اور اس کے اثرات وقتی ہوتے ہیں۔" (شبلی شناسی کے اولین نقوش، ص:۱۱-۱۲)

غالباً علامہ شبلی واحد ایسے اہل قلم ہیں جنھوں نے رسائل و جرائد میں علمی، ادبی، تنقیدی اور تعلیمی مراسلات لکھے۔ شبلی صدی کے موقع پر ان کا ایک مجموعہ "مراسلات شبلی" راقم کی ترتیب و تقدیم کے ساتھ دارالمصنفین سے شائع ہوا ہے۔ اس کے دیباچہ میں پروفیسر ظلی نے لکھا ہے کہ

"قومی و ملی مسائل پر مراسلہ نگاری علامہ شبلی کی اولیات میں شامل ہے۔ یہ روایت انھوں نے شروع کی اور انھیں پر ختم بھی ہوگئی۔ اہم ملی مسائل کے سلسلہ میں رائے عامہ بنانے اور عوامی بیداری پیدا کرنے کے لئے علامہ شبلی نے اخبارات میں مراسلات لکھنے کی طرح ڈالی۔ یہ مراسلات نہایت اہم امور و مسائل سے متعلق ہیں اور ان کی ملی دردمندی کے مظہر ہیں، جو ان کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی۔" (مراسلات شبلی، ص:۷)

شبلی صدی کے موقع پر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے بانی دارالمصنفین کی یاد کو رسمی سے ہٹ کر یادگار بنانے کے لئے جو کوشش کی وہ ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ متعدد اشاعتی سرگرمیوں کا ذکر گذشتہ اوراق میں آچکا ہے۔ اس سلسلہ کا شاید سب سے اہم اشاعتی منصوبہ ماہنامہ الندوہ کی اشاعت تھا۔ اس میں اگرچہ بہت سے مسائل اور دقتیں تھیں، تاہم پروفیسر ظلی نے ان پر قابو پالیا۔ ماہنامہ الندوہ جولائی ۱۹۰۴ء میں علامہ شبلی کی ادارت میں نکلا، مئی ۱۹۱۲ء تک علامہ اس کے مدیر رہے۔ اس عرصہ کے تمام شمارے ۹/ جلدوں میں آئے ہیں۔ انھیں یکجا دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ علامہ شبلی نے تن تنہا یہ سب کیسے انجام دیا۔ گو اس میں ان کے طلبہ معاون رہے تاہم خود ان طلبہ کی تربیت بھی خود اپنے آپ میں ایک بڑا کام تھا۔ بہرحال دارالمصنفین نے اسے شائع کرکے اپنے بانی کو بہت بڑا شاندار نذرانہ پیش کیا ہے۔ اس کی طباعت و اشاعت کی تمام تفصیلات پروفیسر ظلی صاحب نے اس کے دیباچہ میں پیش لکھی ہیں۔ یہاں ان تفصیلات سے قطع نظر علمی حیثیت سے ظلی صاحب نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

''علامہ شبلی کے علمی کارناموں میں الندوہ کو ایک اہم مقام حاصل ہے، وہ علماء کو جس مہتم بالشان کام کے لئے تیار کرنا چاہتے تھے اس کے لئے تحریر وتقریر دونوں میں مہارت ضروری تھی۔ حفاظت واشاعت اسلام کا کام جس کو وہ علماء کا اصل کام سمجھتے تھے اس کے بغیر انجام نہیں پاسکتا تھا۔ خطابت کی مشق وممارست کے لئے انھوں نے جو کوششیں کیں اس کے نمونے دنیا نے اولاً ندوہ کے اجلاسوں میں دیکھے۔ باصلاحیت اور ذی استعداد طلبہ کی تحریری لیاقت کو نکھارنے کے لئے ان کی کوشش الندوہ کے ذریعہ اہل علم کے سامنے آئیں اور حیرت وحسرت کی باعث ہوئیں۔ ان کی دلچسپی اور تربیت سے ندوہ میں ایسے اہل قلم تیار ہوئے جو یگانہ روزگار تھے اور اس ادارہ کی طویل اور نہایت روشن تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔'' (الندوہ ج ا، ص: ۵، ۱۹۰۴ء)

جولائی ۱۹۰۴ء میں ماہنامہ الندوہ نکلا اور بڑی شان سے نکلا، مگر علامہ شبلی کو اس کے لئے کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، اس کی تفصیل مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھی ہے۔ پروفیسر ظلی صاحب نے بھی یہ داستان لکھی ہے:

''الندوہ کی منصوبہ بندی علامہ شبلی کے لئے زیادہ مشکل کام نہ تھا، کالج میگزین کی ادارت کی وجہ سے وہ اس وادی کے نشیب وفراز سے بخوبی واقف تھے، لیکن الندوہ کے اجراء کے سلسلہ میں ان کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اس کا سبب ان کے ادارتی تجربہ کی کمی نہیں تھی بلکہ اس کا اصل سبب اس سلسلہ میں ارکان اور ذمہ داروں کی عدم دلچسپی تھی۔ تجویز علامہ شبلی کی تھی مگر مجوزہ رسالہ کا مدیر حبیب شبلی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو مقرر کیا گیا۔ بڑی تگ ودو کے بعد جب مولانا شروانی کے ساتھ ان کو بھی ایڈیٹر مقرر کردیا گیا تو اجازت کے لئے درخواست دینے کے لئے ناظم صاحب تیار نہیں ہوتے تھے۔ بالآخر یہ مسئلہ مولانا سید عبدالحی صاحب کی توجہ سے حل ہوا۔ انھوں نے اپنے نام سے درخواست دی اور منظوری حاصل کی۔ یہ ایک نمونہ ہے ان مشکلات کا جن کا سامنا ندوے کے سلسلہ میں

علامہ شبلی کو قدم قدم پر کرنا پڑا۔ اگر انھیں سازگار حالات ملے ہوتے اور متعلقہ افراد کا بھرپور تعاون حاصل رہا ہوتا تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انھوں نے ندوہ کی تعمیر و ترقی کے لئے اور کیا کچھ نہ کیا ہوتا اور اپنے اس عزیز ادارے کو جس کے لئے انھوں نے سب کچھ تج دیا تھا مزید کن بلندیوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہوتے۔'' (ایضاً ص:۵-۶)

ماہنامہ الندوہ کے بڑے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کا ذکر حیات شبلی میں کیا ہے۔ راقم نے بھی اپنی کتاب آثار شبلی میں الندوہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب نے بھی اپنے دیباچہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

الندوہ کا ایک بہت اہم پہلو تصنیف و تالیف کے لئے طلبہ کی تربیت بھی ہے۔ علامہ شبلی ہمیشہ اس کی طرف متوجہ رہے اور الندوہ کے زمانہ اشاعت میں اس پر ان کی خاص توجہ مرکوز رہی۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے بھی اس پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی کو مولانا عبد الماجد دریابادی نے مصنف گر کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ ان کی مصنف گری کا سب سے بڑا اسٹیج یہی رسالہ تھا۔ وہ بڑے جوہر شناس تھے، جہاں بھی ان کو جوہر قابل نظر آتا اس کو اپنے دامن تربیت میں لے لیتے اور اس کی صلاحیتوں کو صیقل کر کے ان کو چار چاند لگا دیتے۔ ان کی نگاہ انتخاب میں جو لوگ خصوصی تربیت کے لائق نظر آتے ان کو الندوہ کا سب ایڈیٹر مقرر کر دیتے اور ان کو اپنی نگرانی میں نہ صرف تحقیق و تصنیف کے گر سکھاتے بلکہ رسالہ کی ادارت اور ترتیب کی ٹریننگ بھی دیتے اور اس سلسلہ میں کوئی رو رعایت روا نہ رکھتے۔ اس کام کے لئے انھوں نے جن لوگوں کا انتخاب کیا وہ علم و ادب اور تحقیق و تصنیف کے میدان سے منتخب روزگار بن کر نکلے اور ایک عالم کو اپنے علم و فن کی ضیا پاشیوں سے منور کیا۔ اس زمرہ میں مولانا عبد اللہ العمادی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبد السلام ندوی جیسی یگانہ روزگار شخصیات شامل ہیں۔'' (ایضاً، ص:۷)

سرسید کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر دارالمصنفین اعظم گڑھ نے ماہر سرسید پروفیسر اصغر عباس کی کتاب ''شذرات سرسید'' شائع کی۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے اس کے دیباچہ میں بھی علامہ شبلی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''سرسید اور کالج سے علامہ شبلی کی نسبتیں متعدد تھیں۔ کالج کے منتخب روزگار اساتذہ میں صرف علامہ شبلی کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ اپنی کم عمری کے باوجود سرسید کے رفقا میں شامل تھے۔ سرسید اور کالج سے ان کے تعلق کے بارے میں کسی تفصیل کا یہ موقع نہیں البتہ اتنا کہے بغیر چارہ نہیں کہ علامہ شبلی کی زندگی کے اس پہلو کا ابھی تک اس طرح مطالعہ اور تجزیہ نہیں ہوسکا ہے جو اس کا حق تھا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں بہت سی ایسی غلط فہمیاں راہ پا گئی ہیں جن کا حقیقت واقعہ سے کوئی واسطہ نہیں۔'' (شذرات سرسید، ص:ب)

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب کی شبلی اور مطالعات شبلی پر کس درجہ گہری نگاہ ہے۔

---

(۱۷۳)

اختر وقار عظیم

[•••]

اردو کے نامور ادیب اور نقاد سید وقار عظیم [۱۹۱۰-۱۹۶۷ء] کے صاحبزادے اور مشہور پاکستانی براڈ کاسٹر اختر وقار عظیم نے ''شبلی بحیثیت مورخ'' کے عنوان سے مقالہ لکھا۔ جس کے ہندو پاک سے مختلف ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اور اب بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ دہلی سے اعتقاد پبلشنگ ہاؤس نے ایک سے زیادہ بار اسے شائع کیا۔

یہ کتاب دراصل ان کا ایم اے کا تحریری مقالہ ہے۔ جو ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اب انہوں نے ایک اور کتاب ''شبلی بحیثیت سیاست داں'' مرتب کی ہے۔ جسے سنگ میل پبلی کیشنز

لاہور نے ۲۰۱۶ء میں شائع کیا ہے۔ یہ اہل علم کے مضامین کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کے دیباچہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''شبلی نعمانی کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ وہ ایک مورخ، شاعر، متکلم، انشاپرداز، خطیب، سوانح نگار، نقاد اور سیاست داں سبھی کچھ تھے۔ ان کی ہمہ پہلو شخصیت پر مختلف لکھنے والوں نے مختلف زاویوں سے نظر ڈالی ہے، لیکن ان کی شخصیت کا ایک پہلو جس کا تعلق ملکی سیاست سے ہے عموماً لوگوں کی نظر سے اوجھل رہا ہے۔ میں نے شبلی کی تاریخ نویسی پر تحقیقی کام کیا تو ان کی سیاست سے دلچسپی کے کئی حوالے اور تحریریں نظر سے گذریں۔ انہیں اپنے عہد کا بھرپور سیاسی شعور تھا۔ وہ اپنے زمانے کی سیاست اور اس کے مختلف پہلوؤں پر سوچی سمجھی رائے رکھتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی سیاست میں ایک حد تک عملاً اور بہت حد تک ایک مفکر کی حیثیت سے اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔''
>
> (شبلی بحیثیت سیاست داں، ص:۸)

---

(۱۷۴)

ایس، اے، صدیقی

[***]

ایس اے صدیقی (شبیر احمد صدیقی) ناردن ریجنل لینگویج سینٹر پٹیالہ سے وابستہ تھے۔ انہوں نے پنجاب کے بعض سمیناروں میں حصہ لیا اور مقالات پیش کئے۔ ان کے قلم سے دو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ایک ''ادب اور لسانیات'' جو ان کے مضامین کا مجموعہ ہے اور اسے ادارۂ اشاعت بھوپال نے دسمبر ۱۹۷۶ء میں شائع کیا ہے، جبکہ دوسری کتاب ''مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری'' ہے۔

ظاہر ہے انیس یا دبیر پر جب بھی کوئی قلم اٹھائے گا، علامہ شبلی اور ان موازنہ کے ذکر کے بغیر اپنے موضوع کا حق ادا نہیں کر سکے گا۔ ایس اے صدیقی نے تو مرزا دبیر ہی پر کتاب لکھی ہے،

جن کے بارہ میں دبیریوں کی عام اور بعض انیسیوں کی بھی رائے ہے کہ علامہ نے ان سے انصاف نہیں کیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت نہیں ہے متعدد نقادوں نے اس کے برخلاف رائے دی ہے۔ صدیقی صاحب نے علامہ شبلی اور ان کے موازنہ کے حوالہ سے دیباچہ میں دو باتیں لکھی ہیں اور دونوں لائق توجہ اور مبنی برحقیقت ہیں۔ پہلی یہ کہ موازنہ انیس و دبیر کی تصنیف سے پہلے یہ تنازعہ موجود تھا، اور دوسری بات انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

"(دبیر پر انیس کی) برتری کا یہ رجحان سب سے پہلے آزاد کے یہاں ملتا ہے۔ جو شبلی کے یہاں اس دعوے کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ "اردو علم و ادب کی جو تاریخ لکھی جائے گی اس کا سب سے عجیب تر واقعہ یہ ہوگا کہ مرزا دبیر کو ملک نے میر انیس کا مدمقابل بنایا اور اس کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ ان دونوں فریقوں میں ترجیح کا تاج کس کے سر پر رکھا جائے۔" اردو تنقید میں یہ پہلا دعوی ہے اور یہی سب سے پہلا فیصلہ بھی، جس کے بعد ترجیح کا تاج انیس کے سر پر رکھ دیا گیا۔ شبلی کے اس فیصلہ نے عمومی طور پر ادبی آرا کو متاثر کیا، لہٰذا بعد جن ناقدین نے انیس و دبیر کا مطالعہ کیا ہے، ان کے یہاں شبلی کے اثرات کا صاف پتہ چلتا ہے، جو دراصل برتری کا وہ اعتراف ہے جس کی طرف اوپر اشارا کیا گیا اور جو علم سینہ کی طرح ادبی حلقوں میں جاری و ساری ہے۔" (مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری، ص ۵-٦)

اور یہی سچائی بھی ہے۔

ایس اے صدیقی دراصل یہ کہہ رہے ہیں کہ موازنہ "موازنہ انیس و دبیر" کی تصنیف سے پہلے بھی تھا۔ البتہ ترجیح کا تاج علامہ شبلی نے میر انیس کے سر پر رکھ کر ایک فیصلہ سنا دیا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے جیسا کہ اوپر گذرا کہ یہ اردو ادب میں پہلا دعوی اور پہلا فیصلہ ہے جو علامہ شبلی کے قلم وجود میں آیا۔ اور بلاشبہ ادبی دنیا کا یہ بڑا اہم فیصلہ تھا۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ اہل قلم کا ایک بہت بڑا حلقہ میدان میں اتر آیا اور عرصہ تک معرکہ آرائی رہی۔ اس سے ہمارے ذخیرہ ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔

اس موضوع پر کتابوں کی بہتات ہے، مگر ان میں خاص طور پر موازنہ کے جواب میں جو

کتابیں لکھی گئیں وہ اس لائق نہیں کہ موازنہ کے مقابلہ میں ان کا ذکر کیا جائے۔ البتہ جو عمدہ کتابیں لکھی گئیں، جیسے المیز ان تو خود علامہ شبلی نے ان کی تحسین وستائش کی۔

---

(۱۷۵)

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی

[پ: ۱۹۴۳ء]

حضرت الاستاد مولانا مجیب اللہ ندوی کی یادگار ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ کے مدیر مسئول ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی سابق رفیق دار المصنفین شبلی اکیڈمی اردو کے مایہ ناز اہل قلم اور محقق و مصنف ہیں۔ ان کے قلم کے نور سے ماہنامہ الرشاد اور ماہنامہ معارف کے صفحات منور ہو چکے ہیں اور اب بھی روشن ہیں۔ مختلف موضوعات پر انھوں نے داد تحقیق وتصنیف دی ہے۔ ان کے قلم سے جو کتابیں نکلیں انھوں نے اہل علم کو متاثر کیا ہے۔ خاص طور پر تبع تابعین حصہ دوم، علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت وخدمات، حقیقت ایمان، یادوں کا چمن، ایمان ویقین کی باتیں، اسلام کے تابندہ نقوش، وہ یاد آئے بہت اور بزم دانشوراں ان کے قلم کے تابندہ نقوش ہیں۔

اعظم گڑھ میں پیدائش، دار المصنفین میں نشو ونما اور پھر اس کی رفاقت نے فطری طور پر ان کے سینہ کو شبلی وسلیمان کی محبت سے معمور کر دیا ہے اور ان کی ہر گفتگو شبلی وسلیمان کے ذکر سے پر شور رہتی ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے جس کے ذکر کا یہاں موقع نہیں۔ البتہ یہاں ان کے مقدمات کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے علامہ شبلی کا ذکر کیا ہے۔ مولانا ابو علی اثری کی کتاب ''علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں

> ''علامہ شبلی کے پرتو فیضان سے جو لعل وگہر دنیائے علم وادب میں کوہ نور بن کر چمکے ان میں مولانا آزاد کا نام بھی نمایاں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء تک مولانا آزاد علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہو سکے تھے لیکن جب اس سال وہ علامہ شبلی کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے تو الندوہ کے صفحات پر ان کی مشتی عصری

صلاحیتوں نے بال و پر نکالے اور پھر وہ نہ صرف اقلیم صحافت کے تاجدار بنے بلکہ ان کے ادبی و علمی کارناموں سے گنبد مینا آج تک پر شور ہے۔"

(علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد، ص:۵)

۲۰۰۸ء میں راقم کی کتاب "متعلقات شبلی" شائع ہوئی تو اس کے مختصر سے حرف چند میں انہوں نے علامہ شبلی کا ذکر بڑے بلیغ انداز میں کیا اور لکھا کہ

"لاریب اردو زبان وادب کی طویل جگمگاتی تاریخ میں علامہ شبلی جیسی جامع الکمالات، متنوع الصفات اور ہمہ جہت شخصیت کی نظیر یکسر مفقود ہے۔ وہ بیک وقت ایک عظیم عالم و مفکر بھی تھے، مایہ ناز مورخ و متکلم بھی اور بلند پایہ ادیب و نقاد بھی اور سب سے زیادہ ایک ایسے رعنا اور سدا بہار اسلوب نگارش کے بانی تھے جس کے تتبع کو ہر اہل قلم تا دم حاضر سر بلندی کے ساتھ اپنے مفاخر میں شمار کرتا ہے۔ بلاشبہ ان کے جدت اسلوب اور ندرت تحقیق نے محدود خیالات کو وسعت افلاک عطا کی ہے، عاجز کی اس رائے میں شمہ برابر مبالغہ نہیں ہے کہ شبلی کے شاداں و رقصاں اسلوب تحریر اور سخن سنجی کا سایہ بھی کسی پر پڑ جائے تو وہ آسمان ادب کا تارا بن جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ شبلی کی فطرت میں جو شاعرانہ تخیل آرائی اور جمال پسندی تھی اس کی صریر خامہ ان کی نثری تحریروں میں صاف سنائی دیتی ہے۔

شبلی کے نقد و نظر کا کمال اور شاعرانہ ذوق کی بہار دیکھنی ہو شعر العجم کا مطالعہ کریں۔ اس منفرد تصنیف نے اردو ادب کی آبرو بڑھائی اور اس کو رشک ثریا عروج عطا کیا۔ اس کتاب کے اسلوب کی شگفتگی اور رعنائی نے پندرہ سو صفحات کے مطالعہ کو "گلگشت مصلا" اور "آب رکناباد" بنا کر رکھ دیا ہے۔"

(متعلقات شبلی، ص:۷، طبع دوم)

مولانا کلیم صفات اصلاحی کے مضامین کا مجموعہ عرفان شبلی شائع ہوا تو اس کا دیباچہ بھی ڈاکٹر صاحب موصوف نے لکھا اور متعلقات شبلی میں جو باتیں لکھی تھیں اس میں ان کا اعادہ ہو گیا ہے۔ البتہ اس میں بعض قابل توجہ امور بھی آ گئے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"عاجز راقم سطور کا بلا خوف تردید ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ شبلی کے فکر و نظر کی غیر معمولی وسعت و آفاقیت، ان کی وہبی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ رفقائے سرسید کی مصاحبت اور ان سے باہمی تبادل افکار کا ثمرہ شیریں تھی۔ حیات شبلی کے مؤلف علام اپنے محسن استاذ سے فرط عقیدت، غایت درجہ شیفتگی اور وفور جذبات میں شبلی و سرسید کے اختلافات کو کچھ متوازن انداز میں پیش نہیں کر سکے، جس کے باعث یاران علی گڑھ کو اس سے فطری ناگواری پیدا ہوئی، مگر یہ تو ایک ثابت حقیقت ہے کہ شبلی جس قافلہ ادب کے ایک رکن تھے اس کے میر کارواں سرسید ہی تھے۔"

(عرفان شبلی، ص: ۱۱-۱۲)

مگر ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ واضح نہیں کیا کہ مولانا سید سلیمان ندوی کے غیر متوازن طریقہ کار کے ردعمل میں سید صاحب کے بجائے یاران علی گڑھ نے علامہ شبلی کو کیوں کر ہدف تنقید و تنقیص بنایا؟ اور سید صاحب کو تو ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند عطا کی اور علامہ شبلی کو سو برس تک یاد بھی نہیں کیا۔ البتہ ان کا یہ خیال درست ہے کہ

"ہاں یہ حقیقت بھی کوئی مخفی بات نہیں ہے کہ شبلی کو سرسید سے بعض مذہبی رجحانات، سماجی روایات اور سیاسی نظریات میں اختلاف رائے تھا، لیکن بایں ہمہ شبلی نے قیام علی گڑھ کے دوران سرسید اور ان کے نامور حلقہ فکر سے جو روشنی جذب کی تھی اس کا انعکاس ان کی شخصیت میں تازندگی قائم رہا اور بلا شائبہ شک وہ اس وقت بھی متنوع حیثیتوں سے رفقائے سرسید میں سب سے بلند قامت شخصیت کے حامل تھے۔" (ایضاً، ص: ۱۲)

موازنہ انیس و دبیر کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ

"راقم پوری جرات اندیشہ کے ساتھ موازنہ انیس و دبیر کو مختلف جہتوں سے حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے افضل اور شعر العجم کو فنی سے زیادہ ایک ادبی شاہکار قرار دیتا ہے، جس کا ہر صفحہ دستہ گل اور ہر سطر بوئے گل کے مانند دیدہ و دل کو فرحت و انبساط عطا کرتی ہے۔" (ایضاً، ص: ۱۲)

ڈاکٹر صاحب موصوف پہلے نقاد ہیں جنھوں نے موازنہ کو مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے افضل قرار دیا ہے۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ ان کے اس نظریہ کو تسلیم کیا جائے گا۔ اس لئے کہ موازنہ یک موضوعی و فنی مطالعہ ہے جب کہ مقدمہ کا دائرہ بہت وسیع تناظر رکھتا ہے۔ البتہ ڈاکٹر صاحب کے اس خیال میں کس کو اعتراض ہو سکتا ہے کہ

> ''لاریب اردو کی پوری ادبی تاریخ میں شبلی کو یہ شرف انفرادیت بھی حاصل ہے کہ ان کی ہر تخلیق میں (خواہ شعری ہو یا نثری) حمیت اسلامی اور غیرت ملی کی لہریں موجزن ملتی ہیں۔ چنانچہ ان کے قلم سے تراوش ناموران اسلام کی سوانح عمریاں، ملت اسلامیہ کی عظمت پارینہ کی داستانیں بھی ہیں اور اس کی بیداری کے لئے صور اسرافیل بھی۔'' (ایضاً)

علامہ شبلی کے اسلوب نگارش کی خوبصورتی اور اس کے وقار اور اس کی اہمیت کا اعتراف علی العموم کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی صاحب نے بھی اس کی تحسین فرمائی ہے، مگر جس ادبی انداز اور خوبصورت لب ولہجہ میں بیان کی ہے اس کی مثال سارے ذخیرہ شبلیات میں شاید ہی مل سکے گی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''شبلی کے تاج کمال کا ایک بیش قیمت موتی ان کا بے مثل طرز تحریر بھی ہے جو ان کے علمی و ادبی ورثہ میں اہم ترین اہمیت کا حامل ہے۔ ماقبل شبلی جدید اردو نثر کے ارتقا میں نثر نگاران عہد کی خدمات مسلم سہی، لیکن شبلی نے اپنی جدت و جودت پسندی سے اردو اسلوب ادا کو اوج ثریا عطا کیا ہے۔ عاجز راقم کے نزدیک اس اسلوب کا مثل روز روشن امتیاز یہ ہے کہ اس میں شبلی نے اپنے عہد تک کے تمام اسالیب بیان کا عطر کشید کر کے اپنا ایک انفرادی رنگ ایجاد کیا ہے، جس میں رعنائی خیال بھی ہے اور شگفتگی بیان بھی، افکار کا رس بھی ہے اور خون جگر کی چاشنی بھی جوئے آب کی روانی بھی ہے اور انفاس کی حدت بھی۔ اس کی مثال میں صرف ایک ظہور قدسی کا شہ پارہ پڑھیں، واللہ یوں لگتا ہے شبلی نے تر و تازہ پھولوں کے دامن پر شبنم کے موتی ٹانک دیئے ہوں۔ بلا شبہ یہ طرز تحریر دارالمصنفین اور

دبستان شبلی کے دیگر ادیبوں کے قلمی نقوش کی ایک پہچان بن چکا ہے۔"

(ایضاً، ص:۱۲۔ ۱۳)

---

(۱۷۶)

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

[۱۹۴۴-۲۰۱۹ء]

نامور عالم و محقق، مصنف اور سیرت نگار پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی مرحوم محض علامہ شبلی کے شیدائی ہی نہیں اس وقت برصغیر میں ان کے علوم افکار کے ایک بڑے شارح و ترجمان تھے۔ وہ شبلی و سلیمان کی سیرت نگاری سے متاثر تھے اور اس کا برملا اعتراف بھی کرتے تھے۔

علامہ شبلی کی سیرت نگاری کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے دسیوں محققانہ مقالات سپرد قلم کیے ہیں۔ انھیں جمع کر دیا جائے تو شبلیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہوگا۔

مرحوم علوم اسلامیہ پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ جدید علوم وافکار سے بھی بخوبی واقف تھے۔ مختلف موضوعات بالخصوص سیرت پر ان کی پچاس سے زائد تحقیقی کتابیں ملک و بیرون ملک سے شائع ہوئی ہیں۔ سیرت ان کے مطالعہ و تحقیق و تصنیف کی اصل جولان گاہ رہا۔ اور اس میدان میں انھوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے، جنھیں ہماری تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی بلکہ سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سیرت کے نت نئے گوشوں کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ ان پر انتہائی فاضلانہ مقالات اور کتابیں قلم بند کیں، جن سے ہمارے عہد میں سیرت نبویؐ کے مطالعہ و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے رجحان میں تیزی بھی آئی اور تنوع بھی پیدا ہوا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اور سب صلاحتیں اس پر صرف کر دیں۔ ہمارا ادبی سرمایہ جب سیرت نبویؐ کے مقدس لٹریچر سے خالی تھا۔ علامہ شبلی نے اس وقت سیرت اکیڈمی کا تصور پیش کیا تھا۔ ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی تصورات شبلی کی تکمیل میں مدۃ العمر منہمک رہے۔ سیرت کا دائرہ انھوں نے کافی وسیع کیا۔ سیرت کی پانچ جلدیں الگ، خطبات مدراس اور رحمت

عالم نے جو اثرات مرتب کئے اس سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔اس سلسلہ کونئی تگ وتاز اور نئی بلندیاں اور نئے آسمانوں سے ہمکنار کرنے والے پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی مرحوم ہیں۔اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔اور درجات بلند کرے۔

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے اپنی کئی کتابوں میں علامہ شبلی، ان کے کارناموں بالخصوص سیرت نبویؐ اور اس سے ان کے والہانہ لگاؤ اور ان کی عظمتوں کا ذکر کیا ہے اور کئی جگہ تنقید بھی کی ہے۔اور اس لحاظ سے تو ان کا کوئی ثانی نہیں کہ الفاروق کو انھوں نے ایک سمینار کا موضوع قرار دیا اور دو روزہ قومی سمینار منعقد کر کے اور ملک کے نامور اہل قلم کو جمع کر کے اور ان سے الفاروق کے مختلف گوشوں پر محققانہ مقالات لکھوا کر کے یہ ثابت کر دیا کہ علامہ شبلی کی تصنیفات اور تحقیقات بھی ہمارے موضوع تحقیق وتصنیف کا بنیادی حصہ ہیں۔

۲۰۰۱ء میں ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ میں سمینار منعقد کیا اور دو روز تک ہر طرف ایک بار پھر علی گڑھ کی فضاؤں میں فاروق اعظم کے کوکبہ جلال کا ذکر رہا۔۲۰۰۲ء میں سمینار میں پیش کئے گئے مقالات کا مجموعہ شائع ہوا۔اس کے دیباچے میں الفاروق کی اہمیت عظمت، تحقیقات شبلی کی انفرادیت اور اس کے بلند معیار تحقیق وتصنیف اور اسلوب نگارش کا ایسا عمدہ تجزیہ پیش کیا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں پیش کیا گیا تھا۔الفاروق پر کم نظر اہل علم کی طرف سے متعدد اعتراضات وارد ہوتے رہے ہیں۔ان کا ایسا مدلل اور مسکت جواب لکھا گیا کہ شاید اب اس طرح کے اعتراضات کی کوئی جرأت نہ کر سکے۔انسانی تخلیق چاہے وہ علامہ شبلی ہی کی کیوں نہ ہوں اغلاط سے پاک نہیں قرار دی جاسکتیں۔اس کے پروفیسر مرحوم بھی قائل ہیں، مگر بے جا اور لغو اعتراضات کو جائز بھی نہیں قرار دیتے۔اس کے دیباچہ کے چند اقتباسات سے اس کا اندازہ ہوگا۔وہ لکھتے ہیں:

> ’’الفاروق کی سب سے بڑی فضیلت آج بھی یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کی حیات وعہد پر اس سے بہتر کتاب ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے۔اردو، عربی، فارسی، انگریزی کی حد تک یہ بات دعوے کی حد تک کہہ سکتا ہوں۔دوسری زبانوں میں اگر اس پایہ کی کتاب لکھی گئی تھی تو ہم تک نہیں پہونچی۔ایمان ویقین کی دنیا تبلیغ وعلم سے ہی آباد ہوتی ہے۔الفاروق ہمارا مشاہدہ ومطالعہ بھی ہے اور علم وایقان

بھی۔" (الفاروق ایک مطالعہ، ص:۵)

یہ تو ان کا علم وایقان تھا، علمی و تحقیقی اعتبار سے الفاروق کو وہ اور بلند درجہ دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"وہ ایک تحقیقی، تاریخی اور علمی کتاب ہے۔ تحقیق کے تین بنیادی معیار ہوتے ہیں۔ مواد کی جمع وتدوین، اس کی چھان پھٹک، تحلیل و تنقیح اور تنقیدی وتجزیاتی انداز میں اور قابل قبول اسلوب میں اس کی پیش کش۔ الفاروق ان تینوں معیاروں پر کھری اترتی ہے۔ سوانح فاروقی اور تاریخ اسلام کے تمام دستیاب مصادر سے مواد تحقیق جمع ومدون کیا گیا۔ ان کی خوب تنقیح و تحلیل کی گئی۔ تنقید و تجزیہ سے ان کو گذارا گیا اور خوبصورت حسین ادبی علمی اسلوب میں اسے پیش کیا گیا۔" (ایضاً، ص:٦)

الفاروق پر جو تنقیدیں ہوئیں ان کے بارے میں صدیقی صاحب کا خیال ہے کہ وہ نقادوں کی کم نظری کی وجہ سے ہوئیں۔ وہ تحقیق وتنقید کے جاں سوز مراحل سے نہیں گذرے تھے، لیکن پھر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ الفاروق کتابوں کا تاج محل ہے:

"تاریخ نویسی میں تمام دستیاب مواد کا استقصا ممکن ہے نہ مطلوب، ضروری اور بنیادی مواد کا جوہر اور عطر کشید کر کے اسے صحیح تناظر میں پیش کرنا واجب ہے اور شبلی نے یہ فریضہ بخوبی انجام دیا ہے بالخصوص الفاروق میں ان کا فن تاریخ نویسی اپنے بلندترین معیار پر ہے۔ اگرچہ ان کو اپنے زمانے میں بعض اہم ترین مصادر حاصل نہ تھے، لیکن ان کی کمی انھوں نے دستیاب ماخذ کی روایات اور شواہد سے اکتساب نور کر کے خلاؤں کو پرنور کر دیا۔ آج تمام مصادر وماخذ کی موجودگی اور حصول ودستیابی کے باوجود الفاروق جیسی کتاب نہیں لکھی جاسکتی۔ کیوں کہ مواد کی موجودگی اور حصول ودستیابی جتنی ضروری ہے اس سے کہیں زیادہ لازمی ہے اس ملبہ سے تعمیر کی صلاحیت، تاج محل بار بار نہیں بنا کرتے۔ نہ مسجد قرطبہ دوبارہ تعمیر ہوسکتی ہے۔" (ایضاً، ص:۷)

الفاروق پر کی گئی تنقیدوں کا بھی انھوں نے علمی انداز میں جائزہ لیا ہے اوران کی کم مائیگی دکھلائی ہے، جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبیؐ کو دل سے اورالفاروق کو دماغ سے لکھی گئی کتاب لکھا ہے۔ پروفیسر لیٰسین مظہر صدیقی اسے ستم قرار دیتے ہیں اور اسے ایک غلط موازنہ بتاتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ

''رہی شاگرد رشید کی دل ودماغ کی کشمکش، یہ شبلی کی نہیں ان کی اپنی تھی۔ الفاروق میں شبلی کا دل بھی اسی طرح دھڑکتا ہے جس طرح ان کا دماغ جلوہ سامانی کرتا ہے۔ وہ سیرت النبیؐ سے دل ودماغ کی ہم آہنگی میں کسی طرح کم نہیں، بس فرق ہے کوکب فیض کے معیار واعتبار کا۔ سیرت النبی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین، سید المرسلین اور شہنشاہ دو عالم کی سیرت وتاریخ ہے۔ اس سے شیفتگی اور فریفتگی شبلی کا جزوایمان ہے۔'' (ایضا، ص:۹)

۱۹۹۹ء میں صدیقی صاحب کی ایک اہم کتاب ''غزوات نبویؐ کی اقتصادی جہات'' شائع ہوئی۔ اس کا انتساب علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کے نام ہے۔ دوسری کتاب ''بنو ہاشم اور بنو امیہ کے معاشرتی تعلقات'' کے دیباچہ میں علامہ شبلی کا دو جگہ نام لیا ہے۔ پہلے مقام پر مورخین کے افراط وتفریط کے سلسلے میں علامہ شبلی کے ایک قول کی تشریح ہے اور اچھے انداز میں نہیں ہے۔ جبکہ دوسری جگہ علامہ شبلی کے اس خیال سے کہ یورپین مورخین سیرت پر جو اعتراض کرتے ہیں بے پتہ نہیں کرتے کے ضمن میں لکھا ہے کہ

''بلا ریب ہماری اس روسیاہی میں بقول شبلی مرحوم سیاہی ہمارے قدیم تاریخی مصادر نے فراہم کی ہے مگر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے اور قدیم راویوں اور مورخوں کے شرف وعظمت کی علامت بھی ہے کہ ان کی تحریروں میں بہت سی روشنائی بھی موجود ہے جس سے اسلام، سابقین اور اسلاف کے روشن وتابناک چہروں کو ان کی اپنی روشنی اور تابناکی سمیت آئینہ کے مقابل کیا جاسکتا ہے۔''

(بنو ہاشم اور بنو امیہ کے معاشرتی تعلقات، ص:ب)

گویا صدیقی صاحب اس سے اتفاق نہیں رکھتے، لیکن علامہ شبلی نے خود مورخین یورپ کی

تردید انھیں ماخذ سے کی ہے۔

پروفیسر یسین مظہر صدیقی کی مشہور کتاب مصادر سیرت نبویؐ دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور بلاشبہ یہ ان کا ایک عظیم الشان علمی و تصنیفی کارنامہ ہے۔اس میں انھوں نے شبلی وسلیمان کی سیرۃ النبی کو بھی مصادر میں شامل کیا ہے۔لیکن مقدمہ میں جہاں اردو کی کتابوں کا ذکر کیا ہے، وہاں سیرۃ النبی کا نام بھی نہیں لیا ہے۔البتہ اپنی ایک اور اہم کتاب ''عہد نبوی کا تمدن'' کے دیباچہ میں علامہ شبلی کے نقطہ نظر پر تنقید کی ہے۔عرب اسلامی تمدن کے سلسلہ میں علامہ شبلی کا جو نقطہ نظر تھا، اسے پروفیسر یاسین مظہر صدیقی نے تسامح اور شاخسانہ سے تعبیر کیا ہے۔

(عہد نبوی کا تمدن، مقدمہ، ص: ۱۲)

تسامح ممکن ہے اور وہ تو ہوسکتا ہے، مگر اسے شاخسانہ سے کیونکر تعبیر کیا جاسکتا ہے۔؟

علامہ شبلی کو عرب تمدن کے سراغ نہ ملے اور انھوں نے جن الفاظ سے ان کے معنی و مفہوم نکالے وہ ممکن ہے درست نہ ہوں، مگر ان کی تردید میں نو دریافت مواد کو جس انداز سے دکھایا گیا ہے وہ اردو کے سب سے بڑے سوانح نگار علامہ شبلی وسلیمان کے شایان شان نہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس موضوع پر انتہائی گہرائی اور تحقیق سے مطالعہ اور اپنے موقف کی تائید میں مضبوط شواہد کا پیش کرنا پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی مرحوم کا کارنامہ ہوسکتا ہے۔

حیات شبلی کا یہ پہلو یہاں پر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مشہور عیسائی مورخ جرجی زیدان نے اپنی کتاب ''تاریخ التمدن الاسلامی'' کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ جب میں نے عرب تمدن کی تاریخ تلاش شروع کی تو مجھے اس کا مواد اور سراغ نہیں ملتا تھا۔اس کا سراغ مجھے ایک ہندی عالم شیخ شبلی النعمانی کی اردو میں لکھی ہوئی کتاب ''رسائل شبلی'' سے ہاتھ آیا۔

(تاریخ التمدن الاسلامی حصہ سوم ص ۳-۴)

گویا مرحوم کا موقف درست نہیں۔اور یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ متعصب عیسائی مورخ تو اعتراف کرے کہ عرب تہذیب و تمدن کا سراغ علامہ شبلی کی تحریروں سے ملا اور مسلمان اہل قلم اس کی عدم واقفیت دکھلائے۔

---

(۱۷۷)

پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ

[پ: ۱۷ مارچ ۱۹۴۵ء]

پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ ہمارے عہد کے ممتاز اہل قلم، ادیب وشاعر اور نقاد ہیں۔ انہوں نے متعدد کتابیں: شیریں کے خطوط، غبار خیال، غبار کارواں، موج نقد، گلدستہ (حصہ اول تا سوم) کانٹے (کشمیری انشائیے) وغیرہ لکھی ہیں۔ بازیافت کے مدیر کی حیثیت سے بھی انہوں اردو زبان وادب کی خدمت کی ہے۔ ان کی ایک اہم کتاب ''دبیر حیات اور کارنامے'' ہے۔ جو مرزا پبلی کیشنز سری نگر کشمیر سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے دیباچہ میں مرزا صاحب نے رثائی تنقید اور اس کی تاریخ کا تجزیہ کیا ہے اور علامہ شبلی اور موازنہ انیس ودبیر کے بارہ میں لکھا ہے کہ

> ''مولانا شبلی کی تصنیف موازنہ انیس و دبیر دستیاب ہے۔ یہ کتاب سب سے زیادہ چھپی بلکہ بار بار چھپتی رہی۔ موازنہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیونکہ اسے اردو کے دو اہم ترین مرثیہ نگاروں پر پہلی کتاب ہونے کی خصوصیت حاصل ہے، لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ مولانا شبلی نے مرزا دبیر کا مطالعہ ہمدردی و شغف سے نہیں کیا تھا۔ متحد المضامین کلام کی مثالیں پیش کرنے میں موصوف نے جانب داری کا رویہ اختیار کیا۔ میر انیس سے اپنی ذاتی دلچسپی کی بنا پر وسیع النظر ناقد ومحقق کے بجائے میر انیس کا وکیل بن کر جائز وناجائز ہر طرح کے حربے استعمال کر کے اپنے موکل کی کامیابی کے لئے جدوجہد کی۔ یہاں تک کہ اکثر و بیشتر ایسا کلام مرزا دبیر کی طرف منسوب کردیا جو سراسر الحاقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی کتابیں اس کے خلاف منصۂ شہود پر آئیں۔'' (دبیر حیات اور کارنامے ص ۸)

زماں آزردہ کا رثائی ادب سے سروکار رہا ہے۔ انیس ودبیر پر بعض دوسری تحریریں بھی انہوں نے لکھیں۔ ایک مضمون جو موج نقد میں شامل ہے دبیر کی نثر پر گفتگو کی ہے، مگر علامہ شبلی کے سلسلہ میں ان کے خیالات محل نظر ہیں۔ غالباً انہوں نے علامہ کو صحیح طریقہ سے نہیں پڑھا۔

(۱۷۸)

ڈاکٹر محمد منظور عالم

[پ: ۹/ اکتوبر ۱۹۴۵ء]

ڈاکٹر محمد منظور عالم چیرمین انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی نے کئی کتابیں سپرد قلم کی ہیں۔ ان کی ملی ودینی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ ان کا ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی مختلف موضوعات پر سیکڑوں علمی وتحقیقی کتابیں شائع کر چکا ہے۔ شبلی صدی کی مناسبت سے ڈاکٹر علاء الدین خاں صدر شعبہ تاریخ شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کی مرتبہ کتاب ''بیاد شبلی'' انہی کے ادارہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے دیباچہ میں انھوں نے علامہ شبلی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور خاص طور پر ان کے اثرات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

''سرسید کے بعد شبلی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام پر لکھی گئی مستشرقین کی کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ اپنے مضامین اور کتابوں میں ان کے اٹھائے ہوئے شکوک وشبہات کے تحقیقی جوابات دیئے اور اسلام کا دفاع کیا۔ انھوں نے علماء کا ایک ایسا گروہ تیار کیا جو اس نئے زمانے میں اسلام کی ضرورت کو پورا کرتا رہے۔ شبلی نے موازنہ انیس ودبیر اور شعر العجم لکھ کر شعر وادب کی نکتہ سنجی اور نقد و تبصرہ کی روایت کو مستحکم کیا۔ آخر عمر میں انھوں نے سیرۃ النبی لکھنا شروع کیا جسے وہ اپنی زندگی کا کارنامہ اور سرمایہ سعادت سمجھتے تھے۔'' (بیاد شبلی، ص:۵)

وہ علامہ شبلی کے علمی کارناموں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شبلی کو مورخ، سیرت نگار اور ادبی نقاد کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ بلاشبہ ان میدانوں میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ الفاروق، المامون، سیرۃ النبیؐ، شعر العجم اور موازنہ انیس ودبیر کی شکل میں اہل علم کے سامنے ہیں۔ تاریخ ہند سے متعلق ان کے تاریخی مضامین کے علاوہ اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر بہت مشہور ہوئی۔ اسی طرح فلسفہ وکلام سے متعلق علم الکلام، الکلام،

الغزالی اور سوانح مولانا روم ایسی کتابیں ہیں جو مواد، اسلوب اور اپنے متنوع مضامین کے لحاظ سے مسلم ہندوستان کی علمی، ادبی، فکری وثقافتی وتمدنی تاریخ کا حصہ ہیں۔" (ایضاً ص:۵-۶)

علامہ شبلی کی تعلیمی خدمات کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"تعلیم کی ترویج واشاعت اور اسلامی فکر کے ارتقا میں وہ ہمہ وقت مشغول رہتے، وہ ہندوستانی مسلمانوں کو تعلیمی پس ماندگی سے نکالنا چاہتے تھے اور تعلیمی نظام میں ایسی اصلاحات چاہتے تھے جو دور جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سرسید تحریک سے متاثر ہو کر ۲۰ رجون ۱۸۸۳ء میں نیشنل اسکول کے نام سے اعظم گڑھ میں ایک ادارہ قائم کیا جو آج شبلی نیشنل کالج کے نام سے معروف ومشہور ہے اور بلا تفریق مذہب وملت ملک کے باشندوں کی علمی آبیاری کر رہا ہے۔ اعظم گڑھ میں ان کے خواب کی تعبیر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی بھی ہے۔" (ایضاً ص:۶)

علامہ شبلی کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شبلی نے اپنے علمی وتصنیفی کارنامے سے اسلامی علوم وفنون میں نئی روح پھونک دی، اپنی علمی صلاحیت اور کارناموں سے سرسید تحریک کو مزید وسعت دی جو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں برصغیر کے مسلمانوں میں جاری وساری ہے۔ شبلی نے جو تلامذہ تیار کیے انھوں نے بھی تصنیف وتالیف کے میدان میں کارنامہائے نمایاں انجام دیے، عبدالسلام ندوی، سید سلیمان ندوی، حمید الدین فراہی ابوالکلام آزاد اور عبدالماجد دریابادی کے علاوہ بہت سے ایسے نام ہیں جن کے کاموں کا غلغلہ عالم اسلام میں پھیل گیا، شبلی کے تلمیذ رشید حمید الدین فراہی قرآنیات کے میدان میں ایک مستقل مکتبہ فکر "نظم قرآن" کے بانی ہیں، اسی طرح مولانا آزاد اور سید سلیمان ندوی کے زریں علمی کارناموں پر پورا عالم اسلام فخر کر سکتا ہے۔

شبلی نے مستشرقین کے الزامات واعتراضات کا علمی انداز میں جواب دے کر مابعد کے مصنفین کے لئے ایک لائحہ عمل پیش کیا اور یہ بتایا کہ ہر زمانے میں اسلام کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کا مقابلہ کس طرح علمی انداز میں کیا جائے اوران کا جواب کس طرح دیا جائے، بعد کے مصنفین کی تحریروں سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے شبلی کا اثر قبول کیا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔" (ایضاً،ص:٦)

---

(۱۷۹)

ڈاکٹر افضل حق قرشی

[پ:۱۵رنومبر ۱۹۴۵ء]

مجلس ترقی ادب لاہور کے ترجمان مجلّہ صحیفہ کے مدیر ڈاکٹر افضل حق قرشی صاحب ممتاز اہل قلم، محقق ومصنف اور مولف ہیں۔ان کے قلم سے کئی کتابیں نکل چکی ہیں۔عرصہ ہوا انہوں نے نوادرِ شبلی کے عنوان سے بہت عمدہ مقالہ سپرد قلم کیا تھا جو صحیفہ کے "شبلی نمبر" میں بھی شامل ہے۔اس سے راقم نے بہت فائدہ اٹھایا اور واقعہ یہ ہے کہ "نودرات شبلی" کے مرتب کرنے میں اس سے ناچیز کو بڑی مدد ملی۔صحیفہ شبلی نمبر کا حرفے چند انھیں کے قلم سے ہے۔وہ علامہ شبلی کی تاریخ نویسی اور تحقیقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اپنے عہد کے مسلمان مورخین میں وہ تنہا شخصیت ہیں جو تاریخ نویسی کے بارے میں ایک واضح نقطہ نظر رکھتے تھے، ذوق تحقیق ان کے اندر ایسا رچا بسا تھا جیسے فولاد میں جوہر۔وہ اردو تحقیق کے بانیوں میں تھے۔انھوں نے مصادر کے اسناد کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا۔اصول روایت ودرایت کا استعمال کیا اور پھر نتائج کا استنباط کیا۔گویا وہ سب کچھ کیا جسے جدید اصطلاح میں سائنسی طریقہ تحقیق کے نام سے جانا جاتا ہے۔" (مجلہ صحیفہ، شبلی نمبر،ص:۷)

علامہ شبلی کے طریقہ استدلال، جدید علم کلام اور سیرۃ النبیؐ کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ

''سرسید کی رائے میں شبلی نے جو طریقہ استدلال اپنایا اس کی نسبت سے کم سے کم یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ اس سے ہمارے لٹریچر میں فلسفہ مذہب کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔'' انھوں نے جدید علم کلام کی تحقیق اور اجتہاد کو ہمیشہ اہمیت اور اولیت دی۔ سیرۃ النبیؐ کی تالیف شبلی کا عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی مثال سارے اسلامی ادب میں نہیں ملتی۔ علامہ اقبال کے نزدیک یہ مولانا مرحوم کا مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہے، جس کا صلہ دربار نبویؐ سے عطا ہوگا۔'' (ایضاً)

ڈاکٹر افضل حق قرشی صاحب نے تین جملے اور لکھے ہیں اور یہ تینوں جملے ادیب کے نہیں کسی جج کا فیصلہ معلوم ہوتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''شبلی شاعر بھی تھے اور نقاد بھی، گو ان کی شاعری بھی جواہر ریزوں سے خالی نہیں مگر ان کی فارسی شاعری انھیں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ انھوں نے اردو تنقید کے انداز کو بھی یکسر بدل دیا ہے۔ حالی کے معرکہ آرا مقدمہ شعر و شاعری کو چھوڑ دیں تو اردو میں اور کوئی کتاب نہیں جو شبلی کی کتابوں کے مقابلے میں قابل ذکر بھی سمجھی جائے۔'' (ایضاً)

---

(۱۸۰)

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی

[پ: ۱۵/ اکتوبر ۱۹۴۶ء]

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی ادیب، شاعر اور ناقد کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کے قلم سے متعدد اہم درسی کتابیں نکل چکی ہیں۔ ادب نما، ادبی زاویے، شعور فن، غالب فکر و فن اور اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ جو طلبہ کے معیار و مذاق کے مطابق لکھی

گئی ہیں۔انھیں عربی، فارسی اور انگریزی کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے کئی کتابیں ترجمہ بھی کی ہیں۔ ان میں دکن کی قدیم تاریخ اور تدبر قرآن وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان کے بعض ادبی مقالات ملک کے مستند رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔انھوں نے کئی سمیناروں کی بھی رونق بڑھائی ہے۔ان کی تعلیمی اور سماجی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ مدرسۃ الاصلاح کے ناظم اور جامعۃ الفلاح کے رکن ہیں۔اوران کی تعمیروترقی میں حصہ لیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مدرسۃ الاصلاح کے ممتاز فرزند ہیں۔ جدید تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ تحصیل علم کے بعد شبلی نیشنل کالج کے شعبہ عربی میں خدمات انجام دیں۔ مدرسۃ الاصلاح اور شبلی کالج علامہ شبلی کی یادگاریں ہیں۔اس طرح گویا انھوں نے ذکروفکر شبلی کے درمیان زندگی گذاری ہے۔ قیام لکھنؤ کے زمانہ میں علامہ شبلی کے ایک شاگرد اوران کے بڑے شیدائی مولانا عبدالباری ندوی فلسفی کے ساتھ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علامہ شبلی کے افکار و خیالات کو علمی دنیا کے لئے قیمتی علمی وتہذیبی سرمایہ خیال کرتے رہے اوراس کی حفاظت کو اپنی اہم ذمہ داری۔ (شبلی کالج میگزین، شبلی نمبر، ص:۶)

شبلی نیشنل کالج کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعدان کی ساری توجہ کا مرکز دارالمصنفین ہے۔ اب وہ اس کی انتظامیہ کے رکن اور ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں اور بظاہر بلا معاوضہ اور بغیر کسی صلہ و ستائش کی تمنا کے شب وروز اس کی خدمت میں مصروف ہیں۔

ان کا ایک بڑا ادبی کام یہ بھی ہے کہ وہ برسوں شبلی کالج میگزین کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اوراس کے بڑے اہم شمارے شائع کئے۔ ۲۰۰۷ء میں اس کا ایک بڑا قیمتی ''شبلی نمبر'' شائع کیا۔اس کے دیباچہ سے نہ صرف ان کی علامہ شبلی سے والہانہ دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ شبلی شناسی، اس کے اثرات اور علامہ شبلی کے بارے میں ان کے خیالات کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بہت پہلے علامہ شبلی کی کتابوں میں لونی لگنے کا اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ آج علمی دنیا میں علامہ شبلی کی کتابوں کی جتنی پذیرائی ہورہی ہے اتنی شاید ہی کسی اور مصنف کی کتابوں کی ہوئی ہو، علامہ شبلی کی علمی وادبی خدمات پر

مضامین لکھے جا رہے ہیں، کتابیں شائع ہو رہی ہیں اور ملک کے مختلف حصوں میں سمینار منعقد کیے جا رہے ہیں، اس شبلی شناسی کی وجہ غالباً یہ ہے کہ علامہ نے ماضی سے اپنا رشتہ استوار رکھنے، اپنے عہد کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے ساتھ ساتھ آنے والی نسلوں کی راہ سے کانٹا چننے اور تاریک راہوں میں فکر روشن کی قندیلیں روشن کرنے کی کوشش کی۔'' (ایضاً، ص:۵)

علامہ شبلی کو اپنے عہد کی ضرورتوں کا شاید سب سے زیادہ احساس تھا۔ ڈاکٹر صاحب ان کے انداز غور و فکر کو اپنے عہد کی ضرورت بتاتے ہیں۔ انھوں نے علامہ شبلی کے طریقہ کار کی اہمیت بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ

''آج جب کہ اسلام کی روشن شبیہ کو دھندلا کرنے اور اس کی تعلیمات کو غلط انداز میں پیش کیے جانے کی منصوبہ بند شازشیں ہو رہی ہیں، ایسی صورت حال میں علامہ شبلی کی علمی و فکری خدمات کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ علامہ شبلی نے مستشرقین کے الزامات و اعتراضات کا علمی انداز میں جواب دے کر ان خطوط پر کام کرنے والوں کے لئے ایک لائحہ عمل پیش کر دیا ہے کہ ہر زمانے میں اسلام کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کا کس طرح جواب دیا جائے۔'' (ایضاً)

ڈاکٹر صاحب اپنے گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ موجودہ زمانہ کی علمی شناخت دراصل علامہ شبلی کی شناخت سے وابستہ ہے۔ وہ اثرات شبلی کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مودودی، اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تحریروں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بعد میں آنے والے اصحاب فکر و نظر نے علامہ کی تحریروں سے کتنا زیادہ اثر قبول کیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں سنجیدہ اہل قلم کی تحریروں میں بھی شبلی کا رنگ صاف جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں علمی شناخت شبلی کی شناخت سے جڑی ہوئی ہے۔''

(ایضاً، ص:۵-۶)

---

(۱۸۱)

پروفیسر مولانا محمد رفیق چودھری

[پ:۱۹۴۷ء]

مولانا پروفیسر محمد رفیق چودھری ایک بڑے عالم اور بڑے مصنف ہیں۔ان کے قلم دسیوں اہم کتابیں اور کئی ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

آسان ترجمہ قرآن،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسکراہٹیں،عشرہ مبشرہ،ام الکتاب تفسیر سورۂ فاتحہ،آسان قرآنی عربی ،تفسیر البلاغ،قرآن کی عظمت وفضیلت،قرآنی الفاظ کے مادے،قرآن کے دامن میں، حدرجم،سلطان محمود محدث جلال پوری حیات وخدمات اورآثار، ارکان اربعہ،منتخب عربی اشعار،مراۃ البخاری،جنتی کون اور دوزخی کون قرآن کی روشنی میں،اللہ کی پسند وناپسند،قرآن سے ایک انٹرویو،اقبال سے ایک انٹرویو،سنت سے ایک انٹرویو،فتنہ غامدیت کا علمی محاسبہ،غامدی مذہب کیا ہے؟،اے لوگو!،شرعی ڈاڑھی،تعلیم العربیہ،شفاف نعتیں،آسان علوم قرآن،حدیث قرآن کی تشریح کرتی ہے۔صحیفہ ہمام بن منبہ وغیرہ۔

مولانا محمد رفیق چودھری کوعلامہ شبلی وسلیمان اوران کی سیرۃ النبی سے بڑی عقیدت اور شیفتگی ہے۔چنانچہ انہوں نے سیرت کی ساتوں جلدوں کی ایک جلد میں تلخیص کی ہے۔اسے مکتبہ قرآنیات لاہور نے ۲۰۰۸ء میں شائع کیا ہے۔اس کے دیباچہ میں سیرۃ النبی کے بارہ میں مولانا محمد رفیق چودھری نے لکھا ہے کہ

> ''سیرت النبی (از علامہ شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی) کواردوزبان وادب میں کلاسیک کادرجہ حاصل ہے۔اس لئے اب یہ کتاب کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ سیرت کے اس نقش اول کے بعد کا ہر نقش دیگر بالواسطہ یابلاواسطہ اسی سے مستفاد ہے۔اردو کا کوئی سیرت نگاراس عظیم کتاب کے مطالعے اوراستفادے سے کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتا۔''(مختصر سیرت النبی،ص:۱۷)

سیرۃ النبی کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے مولانا چودھری لکھتے ہیں:

"یہ کتاب محض سیرت کے موضوع پر نہیں لکھی گئی بلکہ اس میں سیرت نبویؐ کے ساتھ ساتھ سیرت کا پیغام یعنی دین اسلام کی عام تعلیمات بھی شامل ہیں۔اس طرح یہ کتاب سیرت اور اسلامی تعلیمات کا اچھا خاصا انسائیکلو پیڈیا بن گئی ہے۔" (ایضا)

اس کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پاک وہند میں اس کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔انگریزی سمیت کئی غیر ملکی زبانوں میں اس کے تراجم موجود ہیں۔اس کتاب میں واقعات کی تفتیش وتلاش اور مسائل ونظریات کی بحث وتحقیق پر بڑی محنت وکاوش اور دیدہ ریزی کی گئی ہے۔" (ایضا،ص:۱۹)

مولانا چودھری کو سیرۃ النبیؐ کی تحقیق وتدقیق کے علاوہ علامہ شبلی کا اسلوب نگارش بہت پسند ہے اور اس کی انہوں نے تحسین وستائش کی ہے اور لکھا ہے کہ

"شبلی کا اسلوب نگارش اپنے اندر گوناگوں خصوصیات رکھتا ہے۔(جس کی پیروی سید سلیمان ندوی نے بڑی کامیابی سے کی ہے)۔اس اسلوب (Style) کی پہلی خصوصیت اس کا ایجاز واختصار ہے۔شبلی کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ دریا کو کوزے میں بند کرنا جانتے ہیں۔

داستان حسن جب پھیلی تو لا محدود تھی
اور جب سمٹی تو تیرا نام ہوکر رہ گئی

وہ بعض اوقات ایک جملے میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں جس کے لئے پوری کتاب کے صفحات درکار ہوتے ہیں۔ان کا قلم اعجاز رقم ہے۔جو باغ وبہار طبیعت رکھتا ہے۔شبلی بنیادی طور پر مورخ ہیں،لیکن وہ خشک تاریخی واقعات کو اتنی شگفتگی اور ادبیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ قاری کو دلچسپ محسوس ہوتے ہیں۔فن تاریخ میں ان کا اپنا قیاس واجتہاد بھی حقیقت بلکہ الہام معلوم ہوتا ہے۔وہ اپنی تحریر میں اپنے تبحر علمی سے ایسے رموز واسرار منکشف کرتے جاتے ہیں کہ قاری پر ان کے

علم کا سحر طاری ہوتا جاتا ہے۔ بعض ہندی دانشوروں اور ادیبوں نے شبلی کو ''علم کا دیوتا'' کہا ہے۔'' (ایضاً ص:۲۰)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا محمد رفیق چودھری علامہ شبلی نعمانی سے کس درجہ متاثر تھے۔ وہ سیرت سے بھی بہت متاثر ہیں اور اسے۔ علامہ شبلی کا شاہ کار بتاتے ہیں۔

تمام جلدوں کی ضخامت کو تلخیص کا سبب بتایا ہے۔ اس تلخیص کی خوبی یہ ہے کہ مصنف کی اصل تحریریں باقی رکھی ہیں اور اپنی طرف سے کچھ اضافہ نہیں کیا ہے۔

---

(۱۸۲)

ڈاکٹر سفیر اختر

[پ: ۱۹۴۷ء]

نامور محقق و مصنف، اشاریہ ساز اور ماہر شبلیات ڈاکٹر سفیر اختر صاحب نے علم وادب اور تحقیق و تدوین کے میدان میں نہایت اہم اور عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ علم وادب کے مختلف موضوعات پر ان کی ایک درجن سے زاید بلند پایہ کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔

پاکستان میں جس طرح حافظ نذر احمد علامہ شبلی کے عاشق زار تھے اسی طرح ''سرگذشت ایام'' کے مرتب ڈاکٹر سفیر اختر صاحب بھی علامہ شبلی کے ایک بڑے اداشناس ہیں۔ اللہ تعالی ان کے سایہ علم وادب کو تادیر قائم و دائم رکھے۔

ڈاکٹر سفیر اختر صاحب نے ۱۹۸۱ء میں حافظ نذر احمد کی خواہش پر ''کتاب نامہ شبلی'' مرتب کی جس سے شبلی شناسی کا کارواں تیز گام ہوا اور جس سے خود مجھ ناچیز کو ''کتابیات شبلی'' مرتب کرنے میں بڑی مدد ملی۔ یہ اس دور میں جب علامہ شبلی کی طرف ذرا کم توجہ دی جاتی تھی، ایک بڑا کارنامہ تھا۔ علامہ شبلی نعمانی کے بارے میں ڈاکٹر سفیر اختر صاحب کا نظریہ بہت واضح ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] ان عہد آفریں شخصیات میں سے ہیں، جن

کے فکر و عمل نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ ان کی ادبی اور تنقیدی کاوشوں سے اردو اور فارسی زبانوں کے ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ ان کی سوانحی اور تاریخی تحریروں نے فکر و فہم کو نیا رخ دیا اور ان کی علمی و تعلیمی تحریک ایک مدرسہ فکر بن گئی۔" (کتاب نامہ شبلی، ص:٦)

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ

"مسلمانان برعظیم پاکستان و ہند کی تہذیبی و ادبی روایت کے نمائندہ مشاہیر میں ایک بڑا روشن نام علامہ شبلی نعمانی کا ہے۔ ان کے فکر و دانش اور سرمایہ نظم و نثر سے تین چار نسلوں نے اکتساب فیض کیا ہے اور ان نسلوں نے جدید تر فکر و نظر کے نئے نئے چراغ روشن کیے ہیں۔"

(سہ ماہی فکر و نظر اسلام آباد، ج ۳۹، ش ۴، ص: ۱۳۷)

"کتاب نامہ شبلی" کے اصل محرک حافظ نذر احمد صاحب مرحوم تھے۔ سرگزشت ایام کے مقدمہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"علامہ شبلی نعمانی کی علمی، تعلیمی اور فکری خدمات سے زمانہ آگاہ ہے۔ حافظ صاحب علامہ شبلی کی ان خدمات کی تجلیل کرتے رہتے تھے۔......میں ان کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا کہ ایک روز انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ علامہ شبلی نعمانی کے سوانح و افکار کے حوالے سے کتابیات شائع ہونا چاہئے۔ میں نے اس کی بھرپور تائید کی تو ان کے دل کی بات زبان پر آ گئی کہ یہ کام تم کرو۔ میں نے ان کی خواہش کو حکم سمجھا اور اپنی طالب علمانہ صلاحیت کے مطابق کتاب نامہ شبلی مرتب کیا جو انہوں نے اپنے ادارے مسلم اکادمی اور شبلی کالج کی بزم ادب کی جانب سے شائع کیا۔ انہوں نے کتاب نامہ شبلی اصحاب ذوق بالخصوص علامہ شبلی نعمانی کے فکر و دانش سے دلچسپی رکھنے والوں میں تقسیم کیا اور جب بھی کسی نے ان سے کتاب نامے کے لئے رابطہ کیا انہوں نے نسخہ بھیج کر مسرت محسوس کی۔"

(سرگزشت ایام، ص: ۲۷)

مارچ ۲۰۱۱ء میں ڈاکٹر صاحب موصوف کی شبلی شناسی کا ایک اور جلوہ سامنے آیا۔ ڈاکٹر صاحب جس مجلّہ نقطہ نظر اسلام آباد کے مدیر ہیں، اس میں ''کتاب نامہ شبلی'' کے اضافات شائع کئے۔ یہ کتابیات کے سلسلہ کی ایک اور قابل ذکر کوشش تھی۔ راقم یہاں ہندوستان میں اس وقت ''کتابیات شبلی'' پر کام کرر ہا تھا اور پاکستان میں ہونے والی شبلی شناسی کی سرگرمیوں سے ناواقف تھا۔ چنانچہ مجلّہ نقطہ نظر، اکتوبر ۲۰۱۱ء کے اضافات کی اشاعت سے میرا حوصلہ اور بڑھ گیا اور کتابیات پایہ تکمیل کو پہنچی۔ واقعہ یہ ہے کہ کتابیات شبلی کا آغاز بھی کتاب نامہ شبلی سے ہوا اور وہ پایہ تکمیل کو بھی اسی کے اضافات کی اشاعت سے پہونچی۔ کتابیات شبلی کی تکمیل سراسر ڈاکٹر سفیر اختر صاحب کی کوششوں کی مرہون منت ہے۔ اس موقع پر بطور تمہید ڈاکٹر صاحب نے ''مطالعہ شبلی'' کے عنوان سے جو تحریر لکھی ہے، وہ بے حد اہم ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] ان عہد آفریں شخصیات میں سے ہیں جن کی ادبی اور تنقیدی کاوشوں سے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے، ان کی سوانحی تحریروں نے فکر و فہم کو نیا رخ دیا ہے۔ اور ان کی علمی تعلیمی تحریک ایک مدرسہ فکر بن گئی ہے۔ مختصر یہ کہ ان کے فکر و عمل نے مسلمانان برصغیر کو خاصا متاثر کیا ہے۔''
>
> (نقطہ نظر، اسلام آباد (۲۹) اکتوبر۔ مارچ ۲۰۱۱ء، ص: ۱۸۳)

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کتابیات کی اہمیت اور کتابیات شبلی کے سلسلہ کی ابتدائی کوششوں کی تفصیل قلم بند کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ

> ''علامہ کے حالات زندگی اور کارنامے پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور مستقبل میں مزید لکھا جائے گا۔ تحقیق و مطالع کے سلسلے میں مراجع و مصادر تک رسائی کے لئے کتابیات کی اہمیت کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ اسی پس منظر میں علامہ شبلی کے احوال و آثار پر کتابیات کی ترتیب و تدوین شروع ہوئی۔ اس سلسلہ میں اولیت کا سہرا احمد اسحاق نعمانی کے سر ہے جنہوں نے ''مقالہ نما برائے شبلی'' کے عنوان سے ایک فہرست مرتب کی جو ماہنامہ ''آج کل'' (دہلی) کے ایک شمارے بابت جنوری ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ مرحوم بشیر الحق دسنوی (م ۱۹۶۴ء) نے احمد اسحاق نعمانی

فہرست میں کچھ حوالوں کا اضافہ کیا۔اور یہ دوسری کاوش ''مقالہ نما برائے شبلی'' ہی کے عنوان سے ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) کی زینت بنی۔ (معارف جون ۱۹۶۰ء) آخرالذکر مقالہ نما میں ۴۲ اہل قلم کی نگارشات کا اندراج ہے۔مرحوم دسنوی نے بعض ان مضامین کو بھی شامل فہرست کرلیا تھا جن میں علامہ شبلی کا ذکر ضمناً آیا ہے۔(مثال کے طور پر نیاز فتح پوری کی تحریر مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت سے متعلق ہے۔اور نجم الہدیٰ ندوی نے سید سلیمان ندوی کی یاد میں قلم اٹھایا،مگر ضمناً علامہ شبلی کا ذکر خیر بھی موجود ہے۔)

ستمبر ۱۹۶۰ء ماہنامہ ''ادیب'' (علی گڑھ) کا ''شبلی نمبر'' شائع ہوا۔اس خصوصی اشاعت کے لئے ادارہ ''ادیب'' نے احمد اسحاق نعمانی کی کاوش کو اضافات کے ساتھ ''کتب نما برائے شبلی'' اور ''مقالہ نما برائے شبلی'' کے دو حصوں میں شائع کیا۔ادارہ ''ادیب'' کی اضافی کوششوں کے باوجود متعدد اندراجات کا احاطہ نہ ہوسکا۔تاہم یہ اعزاز نعمانی صاحب ہی کو حاصل ہے کہ انہوں نے اس راہ میں پہلا قدم اٹھایا۔'' (نقطہ نظر،اسلام آباد،اکتوبر-مارچ ۲۰۱۱ء،ص:۱۸۳-۱۸۴)

احمد اسحاق نعمانی علامہ شبلی کے چھوٹے بھائی مسٹر محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ الہ آباد کے پوتے ہیں۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے۔انہوں نے علامہ شبلی کی شخصیت پر متعدد مضامین لکھے۔آرمی میں کیپٹن کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہوکر ممبئی میں مقیم ہیں۔اور پیرانہ سالی کے دن گذار رہے ہیں۔اب انہیں یہ بھی یاد نہیں کہ اس سلسلہ میں انہوں نے کون کون سے مضامین لکھے۔ان کے مضمون کا انداز بڑا بیباکانہ تھا،جس پر بڑی لے دے مچی تھی۔انہیں یہ بھی یاد نہیں لیکن خاندانی احوال خوب سناتے ہیں اور مجھ سے اس لئے محبت کرتے ہیں اور فون سے احوال معلوم کیا کرتے ہیں کہ میں ان کے بڑے دادا یعنی علامہ شبلی پر بےلوث کام کر رہا ہوں۔

کتاب نامہ شبلی کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر سفیر اختر صاحب خاموش نہیں بیٹھے بلکہ اس کے بعد ہونے والی سرگرمیوں پر اس لئے نظر رکھ رہے تھے کہ کتاب نامہ شبلی کا دوسرا بھرپور ایڈیشن شائع کیا جاسکے۔کتاب نامہ شبلی کی اشاعت کے بعد اور ناچیز کی ''کتابیات شبلی'' کی اشاعت سے

پہلے کتابیات شبلی کے حوالہ سے کون کون سے کتابیاتی مضامین لکھے گئے، ان کا ذکر بھی انہی کے قلم سے ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

''کتاب نامہ شبلی کی اشاعت کے ساتھ ہی اس امر کا اہتمام کیا گیا کہ موضوع سے متعلق جوں ہی کسی پرانی تحریر کا سراغ ملے، اسے حاصل کیا جائے، جو اندراج بوجوہ نامکمل رہ گئے ہیں، انہیں مکمل کیا جائے۔ نیز علامہ شبلی نعمانی کے بارے میں شائع ہونے والی ہر نئی کاوش پر نظر رکھی جائے۔ الحمدللہ مقدور بھر یہ کام کیا جاتا رہا۔ اسی دوران میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے معروف سہ ماہی مجلے ''فکر و نظر'' نے جون ۱۹۹۶ء میں ''شبلی نمبر'' شائع کیا جس میں محمد ضیاء الدین انصاری (ڈپٹی لائبریرین مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی مرتبہ کتابیات ''جہان شبلی'' کے عنوان سے شائع ہوئی جو مرتب کے الفاظ میں ''علامہ شبلی نعمانی کی تصانیف اور ان کی شخصیت و فن پر کتابوں، رسالوں اور مضامین کی تفصیلی فہرست'' ہے۔ ''جہان شبلی'' کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ ''کتاب نامہ شبلی'' جناب انصاری کے پیش نظر رہا اور اس سے استفادہ کیا گیا۔

''کتاب نامہ شبلی'' کے سلسلے کی ایک کاوش جناب کبیر احمد خاں کی مرتبہ ''علامہ شبلی۔ منتخب کتابیات'' ہے جو ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ کی شائع کردہ کتاب ''الفاروق۔ ایک مطالعہ'' (۲۰۰۲ء) میں شامل ہے۔''

(ایضاً، ص: ۱۸۴-۱۸۵)

مجلہ نقطہ نظر اسلام آباد کے اس شمارہ میں انہوں نے اب تک جو معلومات یکجا کی تھیں انہیں شائع کیا۔ اور بلاشبہ کتابیات شبلی کے حوالہ سے بڑی اہم اور وقیع معلومات یکجا کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نقطہ نظر کا یہ قیمتی شمارہ ناچیز کے پاس بھیجا تھا۔

راقم نے جو کتابیات شبلی تیار کی ہے اور جسے دارالمصنفین نے شائع کیا ہے، اس زمانہ میں زیر ترتیب تھی اور ڈاکٹر صاحب کو اس کی اطلاع تھی، اس لئے کہ اس سے پہلے اس سلسلہ میں ناچیز

کا مراسلہ اخبار اردو اسلام آباد میں شائع ہو چکا تھا۔ بہر حال اس کے بعد ''کتابیات شبلی'' شائع ہوئی اور ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پہنچی تو انہوں نے اس پر بڑا وقیع تبصرہ لکھا۔ جسے مولانا عرفات اعجاز اعظمی نے اپنی کتاب ''ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی بحیثیت مصنف'' حصہ اول میں شامل کر دیا ہے۔

اس کے بعد بھی ڈاکٹر سفیر اختر صاحب اس سلسلہ کی معلومات جمع کرتے رہے جسے حال میں مجلہ نقطہ نظر اسلام آباد کے تازہ شمارہ (۳۹) ۲۰۲۲ء میں شائع کیا ہے۔ یہ دراصل مجلہ نقطہ نظر کی علامہ شبلی پر خصوصی اشاعت ہے۔ یوں تو اس شمارہ کے تمام مشمولات بہت قیمتی ہیں لیکن اس شمارہ کی سب سے خاص بات ''کتاب نامہ شبلی'' کی دوسری اشاعت کی اس شمارہ میں شمولیت ہے۔

اگر آپ ''کتاب نامہ شبلی'' سے لے کر آج تک کی علامہ شبلی سے متعلق کتابیاتی سرگرمیوں کا جائزہ لیں تو یہ بات صراحت سے سامنے آجائے گی کہ ڈاکٹر سفیر اختر صاحب سے بڑا کوئی شخص مطالعات شبلی کا واقف کار نہیں اور بلا شائبہ مبالغہ وہ اس دور کے ایک منفرد شبلی شناس ہیں۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ کتاب نامہ شبلی اور مجلہ نقطہ نظر کی علامہ شبلی پر خصوصی اشاعت کبھی فراموش نہیں کی جا سکے گی۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک اور خوبی کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ناچیز اور ان میں موضوع کے اشتراک کے باوجود انہوں نے نہ کبھی کوئی بات چھپائی اور نہ کسی کا شکوہ کیا اور نہ الزامات لگائے۔ بڑے لوگ بڑے ہی ہوتے ہیں۔ یہ ایک ضمنی بات درمیان میں آگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ حافظ نذر احمد مرحوم کے بعد انہی نے پاکستان میں دبستان شبلی کی علمی وفکری نمائندگی کی ہے۔ اور حق یہ بھی ہے کہ پاکستان میں ڈاکٹر صاحب دبستان شبلی کے سرپرست اور سربراہ ہیں۔

ڈاکٹر سفیر اختر صاحب کی ایک کتاب ''اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں'' ہے۔ جسے بزم اقبال لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس کا مفصل دیباچہ یہ واضح کر رہا ہے کہ دبستان شبلی سے وہ کس قدر واقفیت رکھتے ہیں۔ اس دیباچہ سے چند منتخب تحریریں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ظہور الدین مجہور کے نام خط سے ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ وہ یہ ہے:

''ہاں تذکرہ (شعرائے) کشمیر لکھتے وقت مولانا شبلی نعمانی کی 'شعر العجم' آپ کے

پیش نظر رہنی چاہئے۔ محض حروف تہجی کی ترتیب سے شعرا کا حال لکھ دینا کافی نہ ہوگا۔'' (اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں، ص:۱۴)

سیرت النبی کے بارہ میں علامہ اقبال نے لکھا ہے کہ ''مولانا مرحوم نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے جس کا صلہ دربار نبوی سے ملے گا۔'' (اقبال نامہ، حصہ اول، ص:۳۹)

اس دیباچہ میں علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان کے علامہ اقبال سے گوناگوں تعلقات کی داستان بھی نوک قلم پر آ گئی ہے۔ اور واقعی یہ ایک طویل داستان ہے۔ اس سے علامہ اقبال کی شبلی و سلیمان سے بڑھی ہوئی محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں چند اور بھی اہم اندراجات ہیں، مگر وہ دوسری شخصیات کے ضمن میں آچکے ہیں۔

---

(۱۸۳)

پروفیسر عبدالجبار شاکر

[۱۹۴۷-۲۰۰۹ء]

دعوہ اکیڈمی اور سیرت اسٹڈی سینٹر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر عبدالجبار شاکر نامور عالم دین اور محقق و مصنف تھے۔ وہ ایک اقبال شناس بھی تھے۔ ان کی کتابیں قاموس الاقبال اور علامہ اقبال کی اردو نثر عمدہ کتابیں ہیں۔ سیرت پر ان کی گہری نظر تھی۔ سیرت پر بھی ان کے قلم سے کتابیں نکلیں۔ سیرت النبی کے امتیازات اور مرقع سیرت کو علمی حلقوں میں خاصا پسند کیا گیا۔

سیرت پر کام کرنے والے اہل قلم علامہ شبلی سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ پروفیسر عبدالجبار شاکر کی تحریروں میں بھی علامہ شبلی کی تنقید و تحسین موجود ہے۔ انہوں نے پروفیسر سعود عالم قاسمی کی کتاب 'علامہ شبلی کی قرآن فہمی' کا فلیپ لکھا ہے، جو دارالنوادر لاہور سے شائع ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] برصغیر کے علمی افق پر اپنے تحقیقی، تخلیقی، ادبی، تاریخی، سوانحی اور دینی کاموں کی بنا پر قطبی تارا بن کر چمکے۔ ان کی نگارشات کے

موضوعات میں تنوع ،منہاج میں استدلال ،خیالات میں جدت، اظہار میں ندرت، اسلوب میں تازگی اور بیان میں تاثیر ہے۔ دبستان سرسید کے ایک ممتاز مصنف شمار کیے جانے کے باوجود اپنا ایک الگ جداگانہ تشخص اور علمی امتیاز رکھتے تھے۔ان کی شخصیت قدیم وجدید کا امتزاج تھی۔ بیک وقت دینی اور ادبی دلچسپیوں اور صلاحیتوں نے تاریخ علم وادب میں انہیں ایک منفرد مقام عطا کیا ہے، جس کا ان کے بھر پور عہد میں کوئی ثانی نہیں ۔شبلی کثیر الجہات تھے۔ انہوں نے سیرت وسوانح ،فلسفہ وکلام، تعلیم وتہذیب، اور شعروادب کی اقلیم میں درخشندہ روایات قائم کی ہیں، جن کی تابندگی سے مطلع علم وادب ہنوز فروزاں ہے۔ان کی علمی اورفکری میراث سے اختلاف کیا گیا مگر دینی ادب میں ان کے طرز استدلال، منہاج کار اور اسلوب نگارش کی تازگی بدستور نمایاں ہے۔''

(علامہ شبلی نعمانی کی قرآن فہمی، ص آخر)

---

(۱۸۴)

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

[پ: ۱۹۵۰ء]

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی مدرسۃ الاصلاح کے نامور فرزند اور صاحب نظر عالم وادیب اور مصنف ہیں۔ان کے قلم سے مختلف موضوعات پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں نکل چکی ہیں۔ وہ علامہ شبلی کے کارناموں کے واقف کار، شیدائی اور دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن ہیں۔ تدریسی زندگی مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں نیک نامی سے گذاری ہے۔ سبکدوشی سے ذرا پہلے شعبہ کے مجلّہ ''علوم اسلامیہ کا شبلی نمبر'' مرتب کیا۔شبلی صدی کے موقع پر ملک وبیرون ملک سے رسائل کے جو خصوصی شمارے شائع ہوئے ان میں اپنے مشمولات کے لحاظ سے یہ خصوصی اشاعت قابل ذکر ہے۔اس کے ادارتی کلمات سے پروفیسر موصوف کے چند جملے یہاں

نقل کیے جاتے ہیں:

”علامہ شبلی کی شخصیت جیسا کہ بخوبی معروف ہے کثیر الجہات ہے، اور ان کے تصنیفی وتالیفی کارناموں اور ملی وقومی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

علی گڑھ میں علامہ شبلی کی تقریباً ۱۶ رسالہ زندگی علمی وعملی دونوں اعتبار سے بڑی اہم سمجھی جاتی ہے اور بقول ایک مصنف مولانا شبلی کی زندگی کی کتاب میں ان کا قیام علی گڑھ ایک یادگار رباب ہے۔

اسلام اور اسلامی علوم کے تئیں علامہ شبلی کی خدمات کا ایک بہت ہی اہم پہلو اسلام، اسلامی علوم، قرآن مجید، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قوانین شریعت پر مستشرقین کے بے جا الزامات، نازیبا بیانات اور لغو اعتراضات کی مدلل تردید اور ان کا مسکت جواب دینا ہے۔

علامہ شبلی ایک ادیب اور قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں، اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی اور ایام علی گڑھ کی یادگاروں میں ان سب زبانوں میں ان کا کلام ملتا ہے۔“

(مجلہ علوم اسلامیہ، شبلی نمبر، ص:۹-۱۱)

علامہ شبلی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ان کے متعدد مقالات شائع ہوئے ہیں، ضرورت ہے کہ انہیں یکجا شائع کر کے زیادہ مفید طلب بنایا جائے۔

---

(۱۸۵)

پروفسر ابوالکلام قاسمی

[۱۹۵۰-۲۰۲۱ء]

پروفیسر ابوالکلام قاسمی مرحوم سابق صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہمارے عہد کے نامور ادیب اور نقاد تھے۔ وہ علی گڑھ سے مجلہ امروز بھی نکالتے تھے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی ادبی

رسائل کی ادارت کر چکے تھے۔

تنقیدان کا خاص موضوع مطالعہ و تحقیق و تصنیف تھا۔ ان کی متعدد ادبی و تنقیدی کاوشیں منظر عام پر آئیں۔ ''مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت'' ان کی مشہور کتاب ہے۔ جو ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے دیباچے میں انہوں نے اردو کے چند ممتاز نقادوں کا محاکمہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''محمد حسین آزاد کے بعد حالی اور شبلی صحیح معنوں میں اردو تنقید کو اعتبار و استناد کے درجے تک پہنچاتے ہیں۔ آزاد، حالی اور شبلی کی تنقید میں ہر چند کہ مغرب کے تنقیدی تصورات کی جھلک ملتی ہے مگر ان کی تنقید کا خمیر در حقیقت عربی و فارسی کی تنقیدی روایت سے اٹھا ہے۔''

(مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت، ص: ۱۵)

ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی کے مجموعہ مقالات ''سخن ہائے گفتنی'' پر پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے پیش لفظ لکھا ہے۔ چونکہ اس مجموعہ میں علامہ شبلی کے متعلق دو اہم مقالات شامل ہیں اس لئے ان کا اور ان کی فکر کا ذکر نسبتاً زیادہ آیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''الطاف احمد اعظمی صاحب نے اس کتاب کا انتساب ان لوگوں کے نام کیا ہے جو مثبت اور تعمیری ادبی اقدار پر یقین رکھتے ہیں۔ اس مناسبت سے بھی شبلی کے تصورات مصنف کو زیادہ بھاتے ہیں۔ اور ان تصورات میں وہ زیادہ دلچسپی محسوس کرتے ہیں۔ تاہم اگر شبلی کو ان کے معاصر الطاف حسین حالی کے تنقیدی افکار کے سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو شبلی نسبتاً زیادہ آزاد خیال اور جمالیاتی اقدار کو تمام اقدار پر ترجیح دینے والے نظر آتے ہیں۔......... مصنف نے عربی شعریات کے بعض ان مباحث کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کی ہے جو اردو کی شعریات کی بنیاد رہے ہیں۔ علامہ شبلی نے اپنی تاریخ، تہذیب اور علمی و ادبی روایت سے جس نوع کا استفادہ کیا ہے اس کا اندازان کی ایک ایک تحریر سے لگایا جا سکتا ہے۔''

(سخن ہائے گفتنی، ص: ۲۰)

پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی ایک خوبی دبستان شبلی کے اہل قلم سے متاثر نظر آتی ہے اور وہ ہے ان کا شگفتہ وسادہ اسلوب نگارش۔ وہ بڑی سے بڑی بات بغیر کسی تمہید وتعارف کے بآسانی لکھ جاتے ہیں اور جو قاری کے دل میں سیدھا اتر جاتی ہے۔ البتہ ان کے ادبی وتنقیدافکار شبلی وحالی سے مختلف ہیں۔

---

(۱۸۶)

ڈاکٹر ہلال نقوی

[پ: ۱۹۵۰ء]

ڈاکٹر نیر مسعود کی کتاب 'معرکہ انیس ودبیر' ستمبر ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آئی۔ اس میں انہوں نے دانستہ طور پر علامہ شبلی کا نام نہیں لیا ہے۔ اس کا مقدمہ ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ

> 'معرکہ انیس ودبیر' کا نام آتے ہی قاری کا ذہن 'موازنہ انیس ودبیر' کی طرف ضرور جاتا ہے۔ لیکن اس معرکہ کی خوبی یہ ہے کہ یہ موازنے کی راہ سے بالکل الگ ایک ایسی راہ کا سفر ہے، جس میں اردو کے دو عظیم مرثیہ نگار شعرا کی معرکہ آرائی کے جملہ سماجی وتہذیبی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔.......... شبلی نے کلام کا موازنہ کیا ہے جبکہ ڈاکٹر نیر مسعود نے کردار وشخصیت کے موازنے کو معرکے کا نام دے کر بہت دبے پاؤں خود کو کسی تقابلی بحث سے نکال لیا ہے۔
>
> (معرکہ انیس ودبیر، ص: ۷)

نیر مسعود کا یہ خیال بھی دراصل اسی موازنہ شبلی کا مرہون منت ہے۔ ہم اسے موازنہ انیس و دبیر کے ارتقاء کا نام بھی دے سکتے ہیں۔

---

(۱۸۷)

پروفیسر اختر الواسع

[یکم ستمبر ۱۹۵۱ء]

سابق صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی جناب پروفیسر اختر الواسع صاحب ہمارے عہد کے ہندوستان کے ممتاز اہل قلم، مصنف اور دانشور ہیں۔ قدیم وجدید کے امتزاج کا ایک حسین نمونہ ہیں اور اس سلسلہ فکر کی ایک نمایاں کڑی ہیں جس کا سرا علامہ شبلی سے جا ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا پیمانہ عقیدت شبلی سے لبریز اور جذبات فکر شبلی سے سرشار ہیں۔ انھوں نے علامہ شبلی پر مضمون لکھا۔ دار المصنفین میں خطبہ دیا اور اپنی ادارت میں نکلنے والے مجلّہ اسلام اور عصر جدید دہلی کا ''شبلی نمبر'' شائع کیا اور ایسا عمدہ خصوصی شمارہ شائع کیا کہ اسے برسوں یاد رکھا جائے گا۔ اور وہ حوالہ کا کام دے گا بلکہ دے رہا ہے۔ اس کا انھوں نے جو حرف آغاز لکھا ہے، اس کی سطر سطر سے عقیدت شبلی، فہم شبلی اور شبلی شناسی کا جذبہ فراواں نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''شبلی نعمانی برصغیر ہند میں مسلمانوں کی تہذیبی و علمی نشاۃ ثانیہ کے ایک ایسے نقش جمیل و جلیل ہیں جن سے صرف نظر کر کے ہندوستانی مسلمانوں کی گذشتہ ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کی جو بھی شکل پیش کی جائے گی وہ نہ صرف نامکمل اور بے بضاعت ہوگی بلکہ استناد و اعتبار سے بھی محروم ہوگی۔''
>
> (حرف آغاز، اسلام اور عصر جدید، دہلی، شبلی نمبر، ص:۵)

علامہ شبلی کے بارے میں اہل علم و دانش کا عام خیال ہے کہ وہ جامع کمالات تھے۔ پروفیسر اختر الواسع بھی ان کی جامعیت اور ہمہ جہتی کے معترف و مداح ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمہ جہت اور کثیر الابعاد ہونا ایک ایسا وصف ہے جسے انیسویں اور بیسویں صدی کی کئی علمی و تہذیبی شخصیتوں کا نشان امتیاز کہا جاسکتا ہے، مگر یہ وصف جس جس انداز سے شبلی کے یہاں ظاہر ہوا ہے اس کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔'' (ایضاً ص:۶)

تصانیف شبلی کی اہمیت اور انفرادیت اب ہماری علمی وادبی تاریخ کی مسلمہ باتیں ہیں۔
پروفیسر اختر الواسع نے ان کی تصانیف کا کس انداز سے ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''انھیں معروف طور پر مورخ اور سیرت نگار اور اس کے ساتھ ایک ادبی نقاد کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان میدانوں میں انھوں نے ایسے کارنامے انجام دیئے جو اپنی مثال آپ ہو کر رہ گئے۔ الفاروق اور المامون اور ان سب سے بڑھ کر سیرت نبویؐ پر ان کی ضخیم تالیف ایک عالم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ فارسی شعروادب کی تفہیم وتعبیر پر ان کی معرکۃ الآرا تالیف شعرالعجم اور اردو ادبی تنقید کے میدان میں موازنہ انیس و دبیر کی انفرادیت اور کلیدی اہمیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ شعرالعجم نے تو خود اہل ایران کو حیران و ششدر کر دیا تھا اور یہ بات ان کے فہم سے بالاتر تھی کہ ایک ایسا شخص جس نے نہ کبھی ایران کی سرزمین پر قدم رکھا ہو اور نہ فارسی زبان وادب کا زندہ ماحول نصیب رہا ہو اسے اہل زبان سے کوسوں دور رہ کر بھی اس زبان کے شعروادب کا ایسا گہرا درک کس طرح حاصل ہوا۔'' (ایضاً ص:٦)

پروفیسر اختر الواسع نے علامہ شبلی کے ذہن کی جولانیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ قدیم و جدید فکر و نظر سے ان کی گہری واقفیت، دینی علوم میں ان کی اجتہادی شان، ندوۃ العلما سے ان کی وابستگی کے اسباب وغیرہ کا ذکر بڑے خوبصورت اور موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ

''سماجی اور عملی جدوجہد کے ضمن میں شبلی نعمانی کا ایک بڑا اجتہادی کارنامہ ان کی سیاسی فکر کی صورت میں سامنے آیا، جس نے بیسویں صدی کی اولین دودہائیوں کے دوران مسلمانوں کے سیاسی رویوں اور ترجیحات کی تشکیل میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔'' (ایضاً ص:۷)

علامہ شبلی کے قیام علی گڑھ، سرسید سے افادہ واستفادہ اور وہاں کے ماحول سے اثر پذیری کا ذکر تمام اہل قلم کرتے ہیں، مگر پروفیسر اختر الواسع صاحب نے جس عالمانہ انداز سے تجزیہ کیا ہے وہ علی گڑھ تحریک اور علامہ شبلی کے ذہن و فکر پر ان کی گہری نظر کا پتہ دیتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سرسید کے افکار کی کشش شبلی کو علی گڑھ لائی، جہاں انھوں نے ۱۶ر برس ایسے ماحول میں گذارے جو زبردست علمی تحقیق و تحریر کے ساتھ شدید عملی سرگرمیوں سے عبارت رہا ہے۔ اس پورے عرصے میں شبلی نعمانی کی تمام ذہنی صلاحتیں پوری کاملیت کے ساتھ بروئے کار نہ آتیں اگر انھیں سرسید کے افکار اور قربت سے وہ تحریک حاصل نہ ہوئی ہوتی جو علی گڑھ کے قیام کے دوران ان کے حصے میں آئی۔ اس تحریک نے شبلی کی خداداد قوتوں میں ایسی دھار پیدا کر دی جس کی زد میں خود سرسید کے بہت سے افکار اور سرگرمیاں بھی آ گئیں، مگر اس کے باوجود دونوں عبقریوں کے درمیان ایک دوسرے کے لئے احترام کا رشتہ بے داغ رہا۔''

(ایضاً، ص:۷)

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ

''سرسید ہی کی طرح شبلی بھی اپنے مذہب اور اپنی قوم سے نہایت مخلصانہ اور شدید جذباتی وابستگی رکھتے تھے مگر دونوں ہی نے اس وابستگی کو علمی سطح پر انگیز کیا اور اسے ایک نظام فکر کے تحت لانے کی کوشش کی۔'' (ایضاً)

علامہ شبلی کے بلند تاریخی شعور، اس کے ثمرات اور اس کے فوائد خاص طور پر الفاروق اور سیرۃ النبیؐ کے بلند معیار کا ذکر و اعتراف عموماً کیا جاتا ہے، مگر علامہ شبلی کے اس لازوال طرز فکر اور سیرۃ النبی وغیرہ کی تصنیف کے پس پشت کیا مقاصد تھے، اس کا ذکر اس انداز سے نہیں کیا جاتا جو ان کے شدید جذبات اور تخیل نے پیدا کئے تھے۔ پروفیسر اختر الواسع لکھتے ہیں:

''شبلی نے ایک مورخ اور سیرت نگار کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک کے بعد ایک الفاروق اور المامون جیسی تحریریں پیش کیں، جنھوں نے مسلمانوں کو ان کے ماضی کی تابناک روشنیوں کے روبرو کیا اور فکر و خیال کا ایک نیا افق منور کیا۔ سیرت نگاری کے اس سلسلے کا نقطہ عروج بلاشبہ سیرۃ النبیؐ کی تالیف ہے۔ جو تاریخی تحقیق، واقعات کی ترتیب اور طرز تحریر ہر لحاظ سے سیرت طیبہ کی علمی پیش کش کا ناقابل عبور معیار بن گئی ہے۔ شبلی نے تاریخ نگاری کا فن کچھ تو اپنے ماضی

کی علمی روایت سے سیکھا اور کچھ اپنے زمانے کے فن تاریخ کے مطالعے سے اور
اس پر اپنی فطری ذہانت کے اضافے سے ایک ایسا طرز نکالا جس میں علمی صلابت
بھی تھی اور ادبی شان بھی۔ سیرۃ النبی کو آج بھی اپنے موضوع پر ایسی رہنما تحریر
تصور کیا جاتا ہے جس پر اضافہ کرنے کی کوئی بھی کوشش اسے نظر انداز یا مسترد
کر کے آگے نہیں بڑھ سکتی۔'' (ایضاً،ص:۹)

علامہ شبلی کی زندگی کا ایک بڑا اہم کارنامہ مستشرقین کے کذب وافترا کا پردہ چاک کرنا اور نہایت بلند آہنگی اور علمی و تحقیقی معیار پر ان کے اعتراضات کا جواب دینا بھی ہے۔ پروفیسر اختر الواسع صاحب نے علامہ شبلی نعمانی کی اس سلسلہ کی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے اور اسے زندہ حقیقت سے تعبیر کیا ہے۔

فلسفہ وکلام کے میدان میں علامہ شبلی کی انفرادیت بھی بیان کی ہے۔ ان کی ماضی پرستی اور اس پر تنقید کی بھی وضاحت کی ہے اور اپنے موقف کی تائید میں علامہ شبلی کی تحریروں کے متعدد اقتباسات بھی نقل کئے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ علامہ شبلی نے جدید وقدیم خیالات کے حاملین میں مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جذبات کو مشتعل نہیں کیا ہے۔ تعلیم کے متعلق علامہ شبلی کے خیالات کی توضیح کے بعد خواتین کی تعلیم کے بارے میں علامہ شبلی کے نقطہ نظر پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ

''شبلی شاید اپنے زمانے کے واحد عالم دین ہیں جنھوں نے اس شد ومد اور سنجیدگی
کے ساتھ مسلم عورتوں میں تعلیم کو فروغ دینے اور ان میں روشن فکری پیدا کرنے کی
وکالت کی۔ ان کے نزدیک خواتین کو بے تعلیم رکھنا مسلمانوں کے اجتماعی وجود
کے نصف حصے کو تاریکی میں رکھنے کے مترادف تھا۔ وہ اس معاملے میں مردوں
اور عورتوں میں کسی قسم کے امتیاز کے قائل نہیں تھے۔'' (ایضاً،ص:۱۳)

پروفیسر اختر الواسع نے علامہ شبلی کی شخصیت اور افکار ونظریات اور ان کی علمی، ادبی، تاریخی اور تحقیقی کاوشوں کے تجزیہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

''شبلی نعمانی حقیقی معنی میں ایک مجتہد اور عبقری تھے، جنھوں نے بہت سی راہیں

روشن کیں اور پرانی راہوں میں نئے امکانات پیدا کیے۔'' (ایضاً،ص:۱۴)

پروفیسر موصوف علامہ شبلی کا شمار عالمی شخصیات میں کرتے ہیں۔وہ راقم الحروف کی کتاب ''شبلی شناسی کے سوسال'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''برصغیر کی جن شخصیات کے علمی اور ادبی کارناموں کو بین الاقوامی سطح پر پذیرائی ملی اور اسے ترجمے کے ذریعہ دیگر زبانوں میں منتقل کیا گیا ان میں علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت سب سے نمایاں ہے۔علامہ کی وفات کو ایک صدی ہونے والی ہے مگر ان کے علمی اکتسابات پر نظر ڈالیں تو آج بھی نہ صرف وہ معنویت کے حامل ہیں بلکہ ان کے علمی ذخیرہ سے اخذ واستفادہ کا سلسلہ برابر جاری ہے۔علامہ کی کتابوں اور مقالات پر غور وخوض اور ان کی تعبیر و تفہیم کے ساتھ ساتھ تنقید و توصیف میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔شبلی علم وتحقیق اور تنقید کا باقاعدہ موضوع بن چکے ہیں۔شبلی کی زندگی میں ہی ان کی کتابوں پر تبصرہ کی شکل میں بہت کچھ لکھا گیا اور ان کے بعد یہ سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔آج اس کا دائرہ برصغیر کی سرحدوں سے کہیں آگے جا چکا ہے۔عالم عرب اور بعض دیگر ممالک میں بھی ترجمہ کے ذریعہ شبلی کی علمی شخصیت سے لوگ واقف ہیں۔علمی دنیا میں علامہ شبلی نعمانی نے برصغیر کی ایسی مستحکم نمائندگی کی ہے کہ اب تک اس کا کوئی بدل نہیں مل سکا۔شبلی کی ایک اور صفت جس کا ذکر ضروری ہے وہ یہ کہ ان کے اندر اسلامی شعائر کے تئیں غیر معمولی حمیت وغیرت تھی۔طبقۂ علماء میں ان جیسی غیرت وحمیت ،وسیع اسلامی لٹریچر کی فراہمی اور علمی کاموں میں آیندہ نسل کی تیاری کی مثالیں شاذ ہیں۔شبلی کے علمی مرتبے کے پیش نظر ان پر جس قدر لکھا جائے کم ہے۔خوشی کی بات ہے کہ علمی اور ادبی دونوں حلقوں میں شبلی پر خاطر خواہ کام ہو رہا ہے۔''

(شبلی شناسی کے سوسال،ص:۸-۹)

(۱۸۸)

وحشی محمود آبادی

[•••]

وحشی محمود آبادی نے فردوسی کے حالات اور شاعری پر نہایت مفصل کتاب ''فردوسی'' لکھی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ ان کے تصنیفی رہنما علامہ شبلی ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''میں نے اس سلسلہ کی کتب کا مطالعہ کیا اور واقعات میں راویوں کا اس قدر اختلاف پایا کہ قوت فیصلہ جواب دے گئی۔بالآخر علامہ شبلی کی شعرالعجم کو رہبر بنانا پڑا۔'' (فردوسی،ص:۵)

ہماری علمی تاریخ میں سیکڑوں ایسے اہل علم وکمال ہیں جنہوں نے علامہ شبلی کو رہبر بنایا اور اس کا اعتراف بھی کیا مگر ہمارے محدود صفحات نے ان کے ذکر کی اجازت نہیں دی۔

---

(۱۸۹)

پروفیسر ظفر احمد صدیقی

[۱۹۵۳-۲۰۲۰ء]

پروفیسر ظفر احمد صدیقی اردو کے ممتاز اہل قلم،نامور محقق ومصنف اور نقاد تھے۔بنارس ہندو یونیورسٹی کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر ہوئے۔بعدازاں صدر شعبہ ہوکر سبکدوش ہوئے اور اسی سال یعنی ۲۰۲۰ء میں جان جان آفریں کے سپرد کی۔

پروفیسر ظفر احمد صدیقی صاحب کی اردو زبان وادب اور اس کی تاریخ پر بڑی گہری نگاہ تھی۔چونکہ عالم دین تھے،اس لئے اسلام علوم وفنون میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔یہی سبب ہے کہ ان کی تحریروں میں مشرقی اور جدید علوم کے بھی اثرات صاف محسوس ہوتے ہیں۔متعدد کتابیں ان کے قلم سے نکل کر مقبول ہوئیں۔

مرحوم ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع ''شبلی نعمانی حیات اور کارنامے'' تھا۔ چونکہ وہ بھی سرزمین شبلی ہی کے لعل اور روشن چراغ تھے، اس لئے علامہ شبلی سے فطری طور پر لگاؤ تھا۔ ندوہ سے تعلیمی وابستگی نے اس میں اور جلا بخشی ہوگی۔ بہر حال ریسرچ کے زمانہ سے اپنی وفات تک انھوں نے علامہ شبلی پر متعدد مقالات سپرد قلم کئے اور علامہ سے متعلق پانچ اہم کتابیں مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار، شبلی کی علمی وادبی خدمات، شبلی (مونوگراف) اور شبلی شناسی کے اولین نقوش، اور شبلی معاصرین کی نظر میں شائع ہوئیں۔ آخر الذکر دونوں ایک ہی کتاب کے دو نام ہیں۔

پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے ایک محقق ومصنف اور نقاد کی طرح علامہ شبلی کی عظمت بھی بیان کی ہے اور ان پر نقد بھی کیا ہے۔ ان کے مطالعے کا یہ موقع نہیں کہ ان صفحات میں صرف مقدمات کے اندراجات سے بحث مقصود ہے۔ البتہ افسوس ہے کہ صدیقی صاحب کی اول الذکر تینوں کتابیں ہمارے موضوع سے خارج اور چوتھی کتاب پر انھوں نے محض دو صفحے کا دیباچہ لکھا ہے، تاہم مقدمہ کا درج ذیل اقتباس ان کے نزدیک عظمت شبلی کا پتہ دیتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''پیش نظر کتاب ...... ان تحریروں پر مشتمل ہے جو شبلی شناسی کی اولین روایات کا حصہ ہیں۔ اس کی قدر وقیمت کا اندازہ اس کے مشتملات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ان تحریروں کی جمع وترتیب کے دوران علامہ شبلی کی یہ امتیازی شان کھل کر سامنے آئی کہ انھوں نے اپنی شخصیت کی دلکشی ودلآویزی نیز کمالات فن کے لحاظ سے اپنے ہم عصروں اور ہم نفسوں کو سب سے زیادہ متوجہ کیا۔ ان کی عظمت کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ گذشتہ ایک صدی سے بہ کثرت اور متنوع پہلوؤں سے ان پر لکھے جانے کے باوجود یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ موضوع اپنے امکانات ختم کر چکا ہے۔ بلکہ ان سے متعلق تحریر وتسوید کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور ہر نئی نسل انھیں اپنے انداز سے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بقول اقبال:
>
> کیفیت باقی پرانے کوہ وصحرا میں نہیں
> ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر

(شبلی شناسی کے اولین نقوش، ص:۱۳)

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کی کتاب ''مولانا شبلی بحثیت سیرت نگار'' خاصی متنازعہ رہی۔ان کے جوابات بھی لکھے گئے۔مگر ظفر صاحب کی یہ بڑی خوبی ہے کہ انہوں نے اگرچہ علامہ شبلی پر اعتراضات بلکہ سخت اعتراضات کئے، مگر متانت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔اور اسے مناظرانہ نہیں بننے دیا۔اور اصل کتاب میں بھی محض سیرۃ النبی پر اعتراضات کئے۔علامہ شبلی کی شخصیت کو مجروح کرنے کی کوشش نہیں کی۔اور نہ بیجا اعتراضات کئے۔اور ساتھ ساتھ عظمت شبلی بھی بیان کرتے رہے تاکہ جو لوگ مخالفت سمجھ رہے ہیں وہ یہ تاثر نہ لیں کہ کتاب عناد میں لکھی گئی ہے۔مثلاً وہ کتاب کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں:

''علامہ شبلی نعمانی کا شمار بیسویں صدی کی مایہ ناز شخصیات میں کیا جاتا ہے۔قدیم و جدید کے امتزاج اور گوناگوں اوصاف وکمالات کی جامعیت کے لحاظ سے وہ یگانہ روزگار تھے۔علم اور ادب کے مختلف میدانوں میں ان کی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔'' (مولانا شبلی بحثیت سیرت نگار، ص:۸)

اسی دیباچہ میں مزید لکھتے ہیں:

''جہاں تک علامہ شبلی کی شخصیت کا تعلق ہے، تو وہ راقم کی نگاہ میں پہلے بھی محبوب و محترم تھی اور اب بھی محبوب ومحترم ہے۔ان کی علمی وادبی فتوحات واکتسابات کے سامنے پہلے بھی سر نیاز خم تھا اور اب بھی خم ہے۔ان کی نثر کی رعنائی ودلکشی پہلے بھی دامن دل کو اپنی جانب کھینچتی تھی اور اب بھی کھینچتی ہے۔'' (ایضاً، ص:۱۲)

---

(۱۹۰)

پروفیسر مظفر علی شہ میری

[پ:۳۰/ اپریل:۱۹۵۳ء]

پروفیسر مظفر علی شہ میری سابق وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کرنول اردو کے

ممتاز استاذ، اہل قلم، ادیب، شاعر اور نقاد ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف و مرتب بھی ہیں۔ سنجیدگی، وقار، وضع داری اور شرافت کا نمونہ ہیں۔ مطالعہ گہرا اور فکر ونظر میں وسعت اور بلندی ہے۔ علامہ شبلی کے مداح ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ حیدر آباد سنٹرل یونیورسٹی میں استاذ تھے علامہ شبلی پر تحقیقی مقالہ لکھوایا۔ یہ مقالہ ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی نے ''مولانا شبلی کی اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے ان کی نگرانی میں لکھا۔ جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔

ابتدا میں علامہ شبلی کو شعرائے اردو کی صف میں جگہ نہیں ملی تھی اور برسوں تک شاعر کی حیثیت سے ان کا ذکر نہیں کیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اس روش کے خلاف احتجاج کیا۔ ڈاکٹر مظفر علی شہ میری کو بھی اس کا احساس ہے۔ اس کا سبب بھی انھوں نے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی کا نام لیتے ہی ان کی معروف نثری تصانیف شیشہ ذہن پر ابھر آتی ہیں اور بہت کم کسی کا دھیان ان کی شاعری کی طرف جاتا ہے۔ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی تخلیق کار، محقق یا ناقد کے نثری اور شعری کارنامے موجود ہوں اور دونوں کو یکساں طور پر مقبولیت حاصل ہوئی ہو، استثنائی صورت میں ہم مرزا غالب کا نام لے سکتے ہیں جن کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کے خطوط کو بھی بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مولانا شبلی کا اچھا خاصا شعری ذخیرہ موجود ہونے کے باوجود ہمارے ناقدین نے کما حقہ اس پر توجہ نہیں فرمائی، بڑی وجہ اس کی یہی سمجھ میں آتی ہے کہ مولانا موصوف کا نثری سرمایہ اس قدر وافر مقدار میں ہے کہ وہ ان کے مختصر سے شعری سرمائے پر غالب آ گیا۔''
>
> (مولانا شبلی کی اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، ص: ۷)

اسی احساس کے پیش نظر انھوں نے علامہ شبلی کی شاعری پر تحقیقی مقالہ قلم بند کرایا۔ اب اس موضوع پر خاصا کام ہو چکا ہے۔ پچاسوں مقالات کے علاوہ ڈاکٹر مطیع الرحمٰن عاشق نے پوروانچل یونیورسٹی سے علامہ شبلی کی شاعری پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند لی ہے۔ جسے ہمارے مرحوم دوست ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی سابق مدیر عالمی گزٹ مئو کے اشاعتی ادارہ عدیلہ پبلی کیشنز

مئو کی جانب سے شائع کیا جاچکا ہے۔

---

(۱۹۱)

شمیم طارق

[پ: ۸/اگست ۱۹۵۳ء]

جناب شمیم طارق صاحب ممتاز اہل قلم، ادیب، شاعر، نقاد، صحافی اور محقق و مصنف ہیں۔ ان کے قلم سے متعدد اہم کتابیں نکل کر مقبول ہو چکی ہیں۔ غالب اور ۱۸۵۷ء ان کی اہم کاوش ہے۔ انھوں نے علم و ادب کی خدمت میں اک عمر گذاری ہے اور آج بھی وہ سرگرم عمل ہیں۔

ہارون اعظمی مرحوم نے بمبئی میں مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن قائم کیا تو شمیم طارق صاحب نے ان کا بڑا تعاون کیا اور اسے ایک ادارہ کی شکل دینے میں ان کے مشوروں اور حوصلوں کا بڑا حصہ ہے۔ افسوس ہارون اعظمی کے ساتھ ہی مولانا عبدالسلام فاؤنڈیشن بھی مرحوم ہو گیا۔

مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن ممبئی کے لئے جناب شمیم طارق نے کتب خانوں سے متعلق مولانا عبدالسلام ندوی کے مقالات کو ''مشرقی کتب خانے'' کے عنوان سے مرتب کیا اور اس پر ایک بڑا قیمتی مقدمہ لکھا ہے۔ یہ مقدمہ کتب خانہ کے حوالہ سے انتہائی معلومات افزا ہے بلکہ اپنے موضوع پر نہایت وقیع مقالہ ہے۔ اس میں نہ صرف مولانا عبدالسلام ندوی کے مقالات پر گفتگو ہے بلکہ مسلمانوں کے شوق علم اور ان کے کتابوں اور کتاب خانوں سے شغف کے ساتھ خاص طور پر دبستان شبلی کی کتب شناسی کا تفصیل سے ذکر ہے۔ علامہ شبلی کا ذوق مطالعہ، کتب بینی اور نادر کتابوں کی تلاش و جستجو کا شوق مثالی تھا۔ نسبتاً اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے، اس لئے اس دیباچہ کے علامہ شبلی سے متعلق مندرجات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ شمیم طارق صاحب علامہ شبلی کی کتب خانوں سے دلچسپی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی نے کتب خانوں سے متعلق جو مضامین لکھے یا اپنے سفرنامے میں جن کتب خانوں کا حال لکھا ہے ان سے کتب خانوں کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہی ہے،

ان میں موجود قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی تفصیل اور ان کے انتظام ونظام سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔'' (مشرقی کتب خانے، ص:۱۶)

برادر مکرم شمیم طارق نے علامہ شبلی کی کتب خانوں سے متعلق معلومات کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ

''ایک تیسری بات جو علامہ شبلی کے مضامین ومقالات سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ ان کی نظر صرف کتب خانوں کی تاریخ پر نہیں ان کے نظام ترتیب پر بھی تھی جس کو موجودہ دور میں Library Science کہا جاتا ہے۔ سرکاری کتب خانہ رام پور (رضا لائبریری) کا معائنہ کرنے کے بعد انھوں نے Visit رجسٹر پر نوٹ لکھ کر نہ صرف اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا بلکہ ۱۳ر دفعات میں کتابوں کی فہرست سے متعلق تجاویز پیش کر کے یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ انھیں اس بات کا دوسروں سے زیادہ ادراک وشعور ہے کہ کتب خانوں میں کتابیں کس طرح یا کس ترتیب سے رکھی جائیں۔'' (ایضاً ص:۱۸)

شمیم طارق صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ کتاب اور کتاب خانوں سے دلچسپی علامہ شبلی کے تلامذہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبد السلام ندوی نے بھی پورے طور پر لی اور ان موضوعات پر مضامین لکھے۔ اور یہ سلسلہ دیگر رفقائے دار المصنفین کے یہاں بھی کافی اہمیت کا حامل رہا ہے اور ان کے قلم سے متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں۔ شمیم طارق صاحب تو دار المصنفین کے بنیادی مقاصد کو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی قرار دیتے ہیں۔ (ایضاً ص:۹-۱۰)

---

(۱۹۲)

حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی

[پ: دسمبر ۱۹۵۳ء]

مولانا حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی دریابادی سینئر رفیق دار المصنفین ماہنامہ معارف کی

ادارت سے وابستہ ہیں۔ان کا شمار ہندوستان کے ممتاز اہل قلم میں ہوتا ہے۔ان کے قلم سے چند کتابیں اور متعدد مضامین نکل کر مقبول ہو چکے ہیں۔وہ گذشتہ تیس سال سے ماہنامہ معارف میں مطبوعات جدیدہ پر تنقید و تبصرہ لکھ رہے ہیں۔وفیات تو اس قدر لکھی ہیں کہ اگر انھیں یکجا کیا جائے تو ان کی کئی جلدیں شائع ہو سکتی ہیں۔انھیں تحریر و تصنیف کا خاص ہنر آتا ہے۔خاص طور پر ان کی نثر میں جو شیرینی، شگفتگی اور نغمگی ہے، وہ بس انہی کا حصہ ہے۔واقعہ یہ ہے کہ وہ دبستان شبلی کی آبرو اور اس سلسلہ زریں کی شاید آخری کڑی ہیں، جس کا سرا مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے سلسلہ سے علامہ شبلی نعمانی سے جا ملتا ہے۔اللہ ان کی عمر اور کام میں برکت دے۔

حافظ عمیر الصدیق ندوی نے علامہ شبلی کی حیات و خدمات کے مختلف پہلوؤں پر متعدد مضامین لکھے ہیں اور بہت سے خطبات بھی دیے ہیں اور علامہ شبلی سے متعلق کئی کتابوں کے مقدمے ان کے قلم سے ہیں۔ناچیز کی کتاب ''متعلقات شبلی'' اور ڈاکٹر شاداب عالم کی کتاب ''تنقیدی مباحث اور شبلی کا نظام نقد'' کی تقدیم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اس سے جہاں شبلی اور علوم و افکار شبلی پر ان کی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں عہد حاضر کی شبلی شناسی پر ان کی گہری نظر کا بھی اظہار ہوتا ہے۔چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

۱۔ ''علامہ شبلی انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کی ان چند شخصیات میں ہیں جن کے کاموں کے تنوع بلکہ تضادات کے باوجود متفقہ نہ سہی لیکن عام طور پر اعتراف کیا گیا کہ وہ ہمہ گیر، ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ان کے سب سے بڑے اور غالباً سب سے مستند سوانح نگار نے ان کی ہمہ جہتی اور ہمہ گیری کے جو ابعاد و جہات شمار کیے ہیں وہ مدح و توصیف کی کامل شان رکھنے کے باوجود اب تک مدلل مداحی کی قدح سے مامون و محفوظ ہیں۔عالم، مورخ، سیرت نگار، معلم، مصلح، ادیب، انشا پرداز، سخنور و انقلابی اور بھی ہیں لیکن بیک وقت ان تمام اوصاف و کمالات کے جامع کی نادر تصویر یقیناً علامہ کی زندگی کا مرقع ہے۔''
(تنقیدی مباحث اور شبلی کا نظام نقد، ص:۹)

۲۔ ''شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر تو شبلی کے ادبی خزانہ عامرہ کا راس المال ہیں۔ ان کی چند ادبی تحریریں اور خطوط بھی شبلی کی ادبی و تنقیدی ٹکسال کے زر خالص کے طور پر دیکھی گئیں۔ اور اردو تنقید کے آسمان پر وقفے وقفے سے تجلیوں کی نمائش ہوتی رہی کہ شبلی نے موازنہ انیس و دبیر کے کلاسیکی فارمولے میں فصاحت و بلاغت جیسی دو ترکیبوں کو تعین قدر کا پیمانہ بنایا۔ مشرقی شعریات میں خصوصاً مرثیہ گوئی میں ان دونوں کو جو اہمیت حاصل ہے۔ جدید نقطہ نظر خواہ کچھ بھی سمجھے یا سمجھائے لیکن شبلی کا پیمانہ قابل لحاظ ہے۔'' (ایضاً ص:۱۰)

۳۔ ''ایک نقاد نے شبلی کے اس قول کی واقعیت کو کھرا قرار دیا کہ شاعری کا دوسرا نام قوت احساس ہے۔ پہلے نام سے سب واقف ہیں کہ شاعری وجدانی اور ذوقی چیز ہے۔ اس قول نے بھی اردو تنقید کی صالحیت و سالمیت کا احساس فزوں کیا کہ شبلی نے صوتی رمزیت کے نکتہ کو واضح کیا کہ وہ صورت و معنی کے امتزاج کو پہچانتے تھے۔ فصاحت و بلاغت کو غور سے دیکھا جائے تو یہ دراصل تشکیل اسلوب کا مسئلہ ہے۔ آج جدید لسانیات میں اسلوبیات کی عمارت کی بنیاد شبلی ہی کی دین ہے۔'' (ایضاً ص:۱۱)

دارالمصنفین کے ایک قدیم خدمت گذار مولوی ابوعلی اثری مرحوم تھے۔ انہوں نے دارالمصنفین، اس کے نظما اور رفقا پر بہ کثرت مضامین لکھے۔ جن کے آٹھ مجموعے خود انہوں نے مرتب کئے تھے۔ ان میں سے دو یا تین ان کی زندگی میں اور اتنے ہی بعد از مرگ شائع ہوئے۔ ''امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد'' ان کا اسی طرح کا ایک مجموعہ ہے، جسے عبدالمجید کھوکھر یادگار لائبریری گوجرانوالہ نے شائع کیا ہے۔ اس میں مولانا عمیر الصدیق ندوی کے تاثرات بھی شامل ہیں۔ اس میں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

۱۔ ''مدح و اعتراف کا ان کا (ابوعلی اثری) معیار بڑا سخت تھا، اگر کوئی شخصیت اس معیار پر صد فی صد کھری اتری تو وہ علامہ شبلی کی ذات گرامی تھی، جن کے ذکر و بیان میں ان کا نطق و کلک سرمستی و رعنائی کے درجہ نہایت پر ہوتا۔ ان

کے بیان کو وہ ہزار طرح سے باندھتے تھے۔''

۲۔ ''اسلوب شبلی اردو کا دلکش ترین اسلوب ہے، جس کا تتبع آسان نہیں، فیضان شبلی کے حصول کے لئے روح شبلی سے ہم کنار ہونا بلکہ خود کو اسی میں جذب کر دینا شرط اول ہے۔ جناب ابو علی اثری مرحوم کے اس جذبہ کا کون منکر ہو سکتا ہے، اس مجموعہ کی ہر تحریر یہی کہتی ہے کہ

انہیں کو سب پکار اٹھیں گذر جائیں جدھر ہو کر

(امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، ص:۸)

ناچیز نے جب علامہ شبلی، ان کے تلامذہ، تصنیفات اور ان کے اداروں پر اولاً مضامین لکھے تو مولانا عمیر الصدیق ندوی نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ میرے پہلے مجموعہ مضامین ''عظمت کے نشاں'' میں ان کی جو تحریر شامل ہے وہ عظمت شبلی ہی کے بیان کے سبب مصنف کے مداح ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''دارالمصنفین کی تاریخی خدمات، علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ اور تذکرۃ القراء جیسی اہم کتابوں اور ہندو پاکستان کے ممتاز علمی و تحقیقی مجلوں میں شائع ہونے والے عمدہ مقالات و مضامین کی وجہ سے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا نام غیر معروف ہے نہ محتاج تعارف، خصوصاً علامہ شبلی پر ان کے بہ کثرت مضامین نے ان کو شبلیات کے ایک مستند ماہر کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ ان کے اسلوب پر بھی اس کا صاف اثر محسوس ہوتا ہے، نوعمری میں انھوں نے پختہ مشقی کی دولت، جس محنت، لگن اور ذوق وشوق سے حاصل کی ہے اس کو صرف سعادت خداداد ہی کہا جا سکتا ہے۔'' (عظمت کے نشاں، ص:۱۲)

مولانا عمیر الصدیق ندوی علامہ شبلی کی یادگار دارالمصنفین سے گذشتہ تقریباً نصف صدی سے وابستہ ہیں۔ اس کے نشیب و فراز بلکہ اس کی وہ زندہ تاریخ ہیں۔ صباح الدین صاحب کے دور میں وہ آئے اور آج تک تمام سرد و گرم کے باوجود اسی کے بام و در جوان سے ہو سکا سنوار رہے ہیں۔ اب وہ عمر کے اس مرحلہ میں ہیں کہ اپنی یادوں کو سمیٹ کر دارالمصنفین کے قدردانوں کو

سنائیں۔ خدا اس کی انہیں توفیق دے۔

---

(۱۹۳)

ڈاکٹر مہ جبیں زیدی

[***]

شعبہ اردو کراچی یونیورسٹی کی سابق استاذ ڈاکٹر مہ جبیں زیدی نے شبلی صدی کے موقع پر علامہ شبلی کو یاد کرتے ہوئے ایک ضخیم کتاب ''علامہ شبلی نعمانی صدی کے آئینے میں'' مرتب کی ہے، جسے کراچی کے مشہور مکتبہ قرطاس نے شائع کیا ہے۔ ۵۱۲ رصفحات کی اس ضخیم کتاب میں علامہ شبلی کے حالات وسوانح اور ان کے عظیم الشان کارناموں پر اہل علم ونظر کے مقالات ومضامین جمع کیے گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سے ایک صدی میں علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر ونظر پر جو عمدہ مقالات لکھے گئے اور جس طرح ان کی عظمتوں کا اعتراف کیا گیا ہے اس کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے۔ مضامین کا انتخاب بھی قابل داد ہے۔

ڈاکٹر مہ جبیں زیدی نے اس کتاب پر جو مقدمہ لکھا ہے، اس میں علامہ شبلی کے حالات، شاعری، تصانیف اور ان کی متنوع شخصیت اور متنوع کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ماہر القادری اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے ایک ایک مقالہ سے طول طویل اقتباسات دے کر علامہ شبلی کے متنوع کارناموں کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔

یہ مقالات اہل علم کے دسترس میں ہیں۔ البتہ مقدمہ میں مولانا ماہر القادری کے حوالہ سے یہ ذکر خاص اہمیت رکھتا ہے کہ علامہ شبلی کی مشہور نظم ''عدل جہانگیری'' کے مرکزی خیال کو لے کر ایک فلم ''پکار'' بنائی گئی۔ (علامہ شبلی صدی کے آئینے میں، مقدمہ، ص:۱۴)

اس میں ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کی تحریر بھی بہت وقیع ہے۔

---

(۱۹۴)

مولانا نعمت اللہ اعظمی

[پ:۱۹۵۳ء]

مولانا نعمت اللہ اعظمی صاحب استاد حدیث دارالعلوم دیوبند بڑے عالم وفاضل شخص ہیں۔ان کی علمی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں اساتذہ اور طلبہ کے درمیان بحرالعلوم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

پروفیسر ظفر احمد صدیقی کی کتاب ''مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار'' پر مولانا نعمت اللہ اعظمی نے بھی اظہار خیال کیا ہے۔اور پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے موقف کی ہم نوائی کی ہے۔ظاہر ہے جو موقف ظفر احمد صدیقی نے اختیار کیا ہے علامہ شبلی اوران کی سیرت نبویؐ کے متعلق وہی موقف تقریباً علمائے دیوبند کا بھی رہا ہے۔مولانا نعمت اللہ اعظمی نے اسی کی تائید کی ہے اوراسے درست قرار دینے کی مدلل کوشش کی ہے۔البتہ یہ بھی لکھا ہے کہ

> ''جہاں تک علامہ شبلی کی شخصیت کا تعلق ہے تو اس میں عظمت کے کتنے ہی پہلو پوشیدہ ہیں۔وہ تاریخ کے ان چند مردم ساز اساتذہ میں گذرے ہیں جنہوں نے ذوق تحریر کی حامل ایک نسل پیدا کی اوراپنے بعد اہل قلم اوراہل علم کی ایک جماعت کو چھوڑا۔ان کے نام پر تصنیف وتالیف کا ایک بڑا ادارہ وجود میں آیا۔خودان کی تصانیف کو منفرد اسلوب نگارش ،معیار تحقیق ،قوت استدلال اور سلیقہ ترتیب کے اعتبار سے خصوصی مقام دیا گیا ہے۔بلکہ سیرۃ النبی کو اپنے موضوع پر سب سے اچھا کارنامہ قرار دیا گیا ہے۔''
>
> (مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار،ص:۱۳)

اس اعتراف کے ساتھ وہی باتیں دہرائی ہیں جوان سے پہلے متعدد علمائے دیوبند لکھ چکے ہیں۔اس میں انہوں نے متعدد علماء کے نام بھی درج کیے ہیں۔لیکن ان میں سے بعض نے علامہ کی شخصیت کے ساتھ صریحاً زیادتی کی اور کفر ثابت نہ ہوتے ہوئے بھی تکفیر کی اور بعد میں

اس سے رجوع کرلیا۔ ان کا ذکر نہیں کیا۔ تاہم بڑی بات ہے کہ کسی نوع سے سہی مولانا مدظلہ نے اعتراف تو کیا ہے۔ علمائے دیوبند میں شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جون پوریؒ نے جس فراخدلی سے عظمت شبلی کا اعتراف کیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

---

(۱۹۵)

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

[پ: ۲۰ر دسمبر ۱۹۵۴ء]

شعبہ تاریخ اسلام کراچی یونیورسٹی کراچی کی سابق سربراہ ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر نامور اہل قلم اور ممتاز مصنفہ ہیں۔ ان کے قلم سے کئی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ تاریخ اسلام کا ان کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہے اور یہی دراصل ان کا موضوع مطالعہ و تحقیق و تدریس بھی رہا ہے۔

ان کے تحقیقی مقالات ماہنامہ معارف اور ہندو پاک کے مؤقر رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔ وہ خود بھی ایک تحقیقی مجلہ ''الایام'' کی مدیرہ ہیں۔ یہی نہیں ان کا اشاعتی ادارہ ''قرطاس'' مصادر کتب کی اشاعت کے لئے برصغیر میں نیک نام ہے۔ اس طرح انھوں نے اسلام اور اسلامی علوم و فنون کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس کا اعتراف بھی ہوا ہے اور ہونا بھی چاہئے۔ عہد حاضر کی وہ واحد خاتون ہیں جن کا مطالعہ اس قدر وسیع و عمیق ہے۔ ایک اور وصف فطرت نے انھیں ودیعت کیا ہے اور وہ ہے ان کا اسلوب تحریر، متانت، شائستگی اور سنجیدگی نے ان کی تحریروں میں بڑا وزن اور وقار پیدا کیا ہے۔

۲۰۱۴ء میں شبلی صدی کے موقع پر انھوں نے بھی علامہ شبلی کو اس طرح نذرانہ عقیدت پیش کیا کہ ان کی شخصیت اور فکر و فن پر اپنے ادارہ سے تین اہم کتابیں شائع کیں۔ شاید پاکستان کا یہ واحد ادارہ ہے جس نے شبلی صدی کی مناسبت سے بیک وقت علامہ شبلی پر تین کتابیں شائع کیں، ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ علامہ شبلی نعمانی صدی کے آئینے میں۔ ڈاکٹر مہ جبیں زیدی

۲۔ معارف شبلی۔ ڈاکٹر محمد سہیل شفیق

۳۔ مطالعہ شبلی۔ پروفیسر ابوسفیان اصلاحی

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ نے ان پر اور ڈاکٹر خالد ندیم کی کتاب ''شبلی شکنی کی روایت اور دوسرے مضامین'' پر جو دیباچے لکھے ہیں، ان سے ان کے مطالعہ شبلی کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ علامہ شبلی کے بارے میں لکھتی ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] ہندوستان ہی کے نہیں بلکہ جدید عالم اسلام کی ان شخصیات میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے علمی دنیا کو متاثر کیا اور مشرق و مغرب میں ان کی عبقریت کا اعتراف کیا گیا۔'' (علامہ شبلی نعمانی: صدی کے آئینے میں، ص:۹)

علامہ شبلی کی شخصیت کثیر الجہات تھی۔ ان کے ابعاد و جہات کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر نے لکھا ہے کہ

''شبلی کی پہچان کے کئی حوالے ہیں۔ عالم، متکلم، مورخ، ادیب، شاعر، مصنف اور مصنف گر، بلکہ اپنی ذات میں ایک ادارہ ایک انجمن۔ شبلی کی تحریروں کے اثرات صرف ادب پر ہی نہیں پڑے بلکہ اس عہد کی فکر اور ذہنی زندگی پر بھی پڑے۔ ایک نہیں کئی نسلوں کی ذہنی تشکیل میں شبلی کا حصہ ہے۔ شبلی کی شہرت سب سے زیادہ ایک مورخ اسلام کی حیثیت سے ہے۔ انھوں نے صرف اسلامی تاریخ بیان کرنے سے ہی غرض نہیں رکھی بلکہ مستشرقین اور بعض متعصب مورخین کے ان اعتراضات کا مدلل اور محققانہ جواب بھی دیا ہے جو انھوں نے اسلامی تاریخ اور تہذیب و ثقافت لگائے۔'' (شبلی شکنی کی روایت اور دوسرے مضامین، ص:۸)

شبلی صدی کے موقع پر ہندوپاک میں متعدد سمینار ہوئے۔ رسائل کے خصوصی شمارے اور گوشے شائع ہوئے۔ کتابیں شائع ہوئیں اور مقالات کے مجموعے بھی شائع ہوئے۔ ڈاکٹر نگار ان کے خلاف نہیں تاہم ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ

''ہمیں سوچنا ہوگا کہ شبلی صدی کا تقاضا کیا ہے؟ کیا ہم علامہ شبلی کے کاموں کو

دہراتے رہنے سے اپنے فرائض سے سبکدوش ہوسکتے ہیں یا ان کے کام کو نئی جہتوں سے آگے بڑھایا جاسکتا ہے؟ شاید اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک طرف تو شبلی نعمانی کی تصانیف کو تحقیق وتدوین کے جدید اصولوں کے مطابق از سر نو مدون کر کے شائع کیا جائے اور دوسری طرف خصوصاً تاریخ کے حوالے سے ان کی محققانہ کاوشوں کا سلسلہ آگے بڑھایا جائے۔

شبلی نعمانی کے یہاں تحقیق وتنقید کا ایک معیار تھا۔ علمی بے خوفی اور بے تعصبی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معروضیت تھی۔ شبلی شناسوں کو اس طرف توجہ کرنی ہوگی کہ عہد حاضر میں شبلی کی معنویت کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے اور شاید یہی شبلی صدی کا تقاضا بھی ہے۔'' (علامہ شبلی صدی کے آئینے میں، ص:۱۰)

دوسری جگہ لکھتی ہیں:

''شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کسی کی برسی پر یا برسی کی صدی پر اس کی قبر پر پھول چڑھا دینے اور عرق گلاب انڈیل دینے سے تعلق کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ شبلی صدی کا تقاضا ہے کہ ایک 'شبلی عصر' پیدا کیا جائے اور اس کا پہلا درجہ یہ ہے کہ شبلی کو فراموش نہ ہونے دیا جائے۔'' (شبلی شکنی کی روایت، ص:۹)

افسوس ان صائب مشوروں کی طرف علی العموم توجہ نہیں دی گئی۔ البتہ علامہ شبلی کی آخری یادگار دار المصنفین اعظم گڑھ نے بڑے پیمانہ پر شبلی صدی تقریبات منعقد کیں۔ چار روزہ بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ دنیا بھر کے اہل علم ودانش کو مقالات پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ اس میں مختلف ممالک کے اہل قلم نے شرکت کی اور مقالات پیش کیے۔ اس سمینار کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ بیک وقت اس کے تین تین اجلاس منعقد ہو رہے تھے۔ اس سمینار کے موقع پر علامہ شبلی کی کئی اہم کتابوں کے محقق ایڈیشن دار المصنفین نے شائع کیے اور بیس سے زائد نئی کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ تھا، جس میں ہدف اور توقع سے زیادہ کامیابی ملی۔ راقم نے اس موقع پر چار کتابیں مرتب کیں جن میں دو کتابیں ''شذرات شبلی'' اور ''مراسلات شبلی'' دار المصنفین ہی نے شائع کی ہے۔ اس موقع پر ماہنامہ الندوہ جس کے علامہ شبلی ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۲ء تک مدیر رہے

مکمل شائع کرنے کا منصوبہ تھا جو بعد میں پورا ہوا۔ اوراس سلسلہ کی بقیہ کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ البتہ علامہ شبلی کی کتابوں کے محقق ایڈیشن کی اب بھی یعنی شبلی صدی کے بعد بھی ضرورت باقی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی دبستان شبلی سے قربت کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ انہوں نے دارالمصنفین کے ترجمان ماہنامہ معارف کا ایک مفصل اشاریہ اپنے رفیق کار ڈاکٹر سہیل شفیق سے مرتب کرا کے شائع کیا۔ یہی نہیں معارف میں ایک صدی کی طویل مدت میں جو وفیاتی مضامین لکھے گئے ان کا ایک انتہائی ضخیم مجموعہ ''وفیات معارف'' بھی شائع کیا۔ اشاریہ معارف کے مقدمے کا آغاز ڈاکٹر صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''شیراز ہندوستان اعظم گڑھ کا ذکر ہو اور دارالمصنفین کا تذکرہ نہ ہو، دارالمصنفین کا تذکرہ ہو اور معارف کا خیال نہ آئے، محال ہے۔ دارالمصنفین کے ساتھ ساتھ ''معارف'' علامہ شبلی نعمانی کا تخیل تھا جسے ان کی وفات کے بعد شرمندۂ تعبیر ہونا نصیب ہوا۔ علامہ شبلی نعمانی کے رفقاء اور شاگردوں نے ان کے انتقال پر یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنی بساط بھر ان کی تمام تحریکوں اور منصوبوں کو وہ زندہ رکھیں گے۔ ابتدائی دو سال دارالمصنفین کے قیام و تاسیس میں صرف ہوئے، اس کے بعد ایک علمی، دینی و تحقیقی ماہنامہ (معارف) کے اجرا کے لئے مراحل طے کئے گئے۔
>
> جب معارف اشاعت پذیر ہوا تو پوری دنیا جنگ عظیم اول کی ہلاکت آفرینیوں (خیزیوں) سے گذر رہی تھی۔ ہندوستان کی سیاسی بساط پر بھی بہت کچھ ہل چل تھی۔ غیر یقینی کی ان فضاؤں میں جبکہ کاغذ کی گرانی اور سامان طبع کی نایابی کی وجہ سے بعض پرانے مطابع بھی بند ہو رہے تھے۔ ایک خالص علمی و تحقیقی ماہنامہ نکالنا بظاہر گھاٹے کا سودا بلکہ یک گونہ دیوانہ پن معلوم ہوتا تھا۔ جب معارف کا اجرا ہوا تو چند ہی قابل ذکر ماہنامے شائع ہو رہے تھے، مثلاً کان پور سے زمانہ، لکھنو سے الناظر، آگرہ سے نقاد، اور لاہور سے مخزن نکلتے تھے۔ ان میں الناظر کے سوا تمام رسائل ادبی نوعیت کے تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سنجیدہ، ٹھوس، علمی و تحقیقی مضامین کی نہ ملک میں مانگ ہے نہ ذوق، لیکن جب معارف

شائع ہونا شروع ہوا تو اس کی پذیرائی نے اس مفروضہ کو غلط صابت کردیا۔"

(اشاریہ معارف، ص:۱۲)

---

(۱۹۶)

پروفیسر سید محمد ہاشم

[پ:۶رمئی ۱۹۵۷ء]

جناب پروفیسر سید محمد ہاشم صاحب شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق چیرمین ہیں۔اسی شعبے سے انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کی ادبی خدمات پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سندلی ہے۔سرسید احمد خاں، مولانا سید سلیمان ندوی اور علی گڑھ تینوں سے علامہ شبلی کی زندگی کا بڑا گہرا ربط و تعلق رہا ہے۔اسی ربط و تعلق کی بنا پر پروفیسر سید محمد ہاشم نے شبلی صدی کے موقع پر مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں "علامہ شبلی کی شخصیت اور عصری معنویت" کے موضوع پر دوروزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا اور پھر اس میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ اسی عنوان سے شائع کیا۔اس کے حرف آغاز میں پروفیسر سید محمد ہاشم نے لکھا ہے کہ

> "علامہ شبلی جدید ادب کے بنیاد گذاروں میں سے ہیں، جنھوں نے مختلف جہتوں سے فکر جدید کے علمی وادبی اسلوب کو متاثر کیا اور تاریخ و تحقیق، تنقید و شاعری، سوانح و صحافت، تعلیم و خطابت، سفرنامے اور علم کلام وغیرہ میدانوں میں اپنا غیر معمولی اور دیرپا اثر چھوڑا ہے۔" (شبلی نعمانی شخصیت اور عصری معنویت، ص ۷)

حالی و شبلی صدی کے موقع پر سہ ماہی مجلّہ فکر و نظر علی گڑھ نے خصوصی شمارہ شائع کرنے کا اعلان کیا تھا۔اس وقت پروفیسر سید محمد ہاشم فکر و نظر کے ایڈیٹر تھے۔چنانچہ مارچ ۲۰۱۵ء میں ایک مختصر سا خصوصی شمارہ شائع کیا، جس میں حالی و شبلی دونوں پر مضامین شامل ہیں، لیکن علامہ شبلی کے مقابلہ میں مولانا حالی پر مضامین ادارہ کو کم موصول ہوئے۔اسی طرح پورے ملک میں سمینار بھی نسبتاً علامہ شبلی نعمانی پر زیادہ منعقد ہوئے۔پروفیسر سید محمد ہاشم نے اس "کم و بیش" کا جائزہ لیا ہے

اور لکھا ہے کہ

''یہ احساس ذہن کو بار بار جھنجھوڑ رہا ہے کہ زیر نظر شمارے میں ہی نہیں بلکہ گذشتہ چار پانچ ماہ یعنی صدی تقریبات کے پورے عرصے میں جو سمینار منعقد ہوئے یا رسائل کے جو نمبر نکالے گئے ان سب میں علامہ شبلی کے مقابلہ میں مولانا حالی پر غور وفکر کا یہی تناسب برقرار رہا ہے جب کہ حالی کو شبلی سے بہت پہلے سر سید کا تقرب حاصل ہو چکا تھا اور شبلی کے علی گڑھ سے رخصت ہونے (۱۸۹۸ء) کے بعد بھی آخر عمر تک حالی علی گڑھ تحریک سے سرگرمی سے وابستہ اور کالج کے ٹرسٹی رہے۔ اس کے علاوہ ادبی اعتبار سے ہر صنف اور ہر میدان میں بھی وہ شبلی کے سینئر اور پیش رو تھے چنانچہ تہذیب الاخلاق میں مضامین لکھنے کا معاملہ ہو یا نظم جدید کے آغاز اور مسدس مد و جزر اسلام جیسی پہلی طویل جامع اور مربوط نظم لکھنے کا سہرا ہو، تنقید پر اعلی درجے کی کتاب لکھنے کی اولیت کا اعزاز ہو یا اردو میں سوانح نگاری اور عملی تنقید کی قافلہ سالاری کا کارنامہ، غرض اسی طرح کے تمام میدانوں میں حالی کو شبلی پر تقدم حاصل تھا۔'' (فکر ونظر، مارچ ۲۰۱۵ء، ص:۶)

اس کے بعد سید ہاشم صاحب نے اس کے اسباب بتائے ہیں اور اسے علی گڑھ کے اہل علم ودانش کی سرد مہری اور علامہ شبلی کے سلسلے میں جذباتیت کے رجحان کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ ایک اور وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ علامہ شبلی نے ادارے قائم کئے اور دارالمصنفین جیسے سدا بہار ادارے کے قیام نے علامہ شبلی پر مطالعہ وتحقیق کا رجحان پیدا کیا۔ وغیرہ

حالی اور شبلی پر متعدد موازناتی مضامین لکھے گئے۔ دونوں کے علمی، ادبی اور سوانحی کاموں کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ اس میں ادبی کاوشوں کے علاوہ فکر ونظر کا بھی موازنہ ہوا ہے۔ علامہ شبلی مولانا حالی سے بیس سال چھوٹے تھے۔ موازنہ میں اس بات کا خیال بہت کم رکھا گیا ہے، جس کی وجہ سے صحیح نتائج سامنے نہیں آسکے ہیں بلکہ بعض بڑے غلط نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ اس میں علامہ شبلی کے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ یہی پس منظر ہے جس کی وجہ سے سید محمد ہاشم صاحب کا تقابل بھی درست نہیں قرار دیا جاسکتا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ حالی، سرسید اور علی گڑھ تحریک سے وابستہ تھے، لیکن علامہ شبلی علی گڑھ تحریک کے ساتھ ایم اے او کالج علی گڑھ کے ایک استاذ بھی تھے۔ انھوں نے جو کچھ کیا ہے اپنی تدریسی مصروفیات کے بعد کیا ہے۔

علامہ شبلی کی مثنوی صبح امید کسی درجہ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ سرسید سے قربت میں شبلی مولانا حالی سے کسی درجہ کم نہیں ہیں۔ روز مرہ کا ساتھ رہا اور وہ ان کے بہت سے کاموں میں ۱۶ ربرس تک شریک رہے۔ مقالہ ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' سرسید کی فرمائش پر لکھا گیا۔ قوم کے نام یہ علی گڑھ تحریک کا سب سے بیش قیمت تحفہ ہے۔ بے شبہ حیات سعدی مولانا حالی کا ایک بڑا کارنامہ ہے، لیکن المامون علی گڑھ کالج میں لکھی گئی۔ کالج کی طرف سے شائع ہوئی۔ یہی نہیں سیرۃ النعمان بھی۔ اور سب کی آمدنی کالج کے لئے تھی۔

کالج میں امراء و روٴسا کی آمد پر علامہ شبلی کی نظمیں اور قصیدے تحریک علی گڑھ کی ترقی میں بے حد معاون ثابت ہوئے۔ علامہ شبلی جب تک علی گڑھ میں رہے حالی سے زیادہ متحرک اور فعال رہے بلکہ جہاں رہے پیہم رواں دواں رہے۔ سرسید کی وفات کے بعد جب وہ علی گڑھ سے مستعفی ہوئے اس وقت سرسید کے بارے میں ان کی جو رائے تھی وہی مولانا حالی کی بھی تھی مگر دونوں اہل قلم علی گڑھ تحریک سے کبھی علاحدہ نہ ہوئے۔ صرف مولانا حالی نہیں علامہ شبلی بھی۔ ۱۹۰۱ء میں دینیات کی کمیٹی بنی تو علامہ شبلی بھی اس کے رکن تھے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے وہ بانی اراکین میں سے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف شعبے قائم ہوئے تو انجمن ترقی اردو کے نائب صدر مولانا حالی اور سکریٹری علامہ شبلی مقرر ہوئے۔ کانفرنس کے اجلاسوں میں بھی وہ برابر شریک ہوتے رہے۔ وہ کہیں بھی رہے کالج آکر طلبہ سے خطاب بھی کرتے رہے۔ اور جب یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی بنی تو اس کے ایک رکن علامہ شبلی بھی تھے۔ وفات سے چند ماہ پہلے بھی علامہ شبلی علی گڑھ کالج آئے اور طلبہ سے اسٹریچی ہال میں خطاب کیا۔ یہ تو کالج سے علامہ شبلی کے تعلق کی ایک مختصر داستان ہے، جسے فراموش کیا گیا، لیکن مٹایا نہیں جاسکا۔

حالی و شبلی کے موازنہ کو نا چیز درست نہیں سمجھتا، لیکن علامہ شبلی کی مقبولیت کا راز مولانا حالی کی اولیات میں تلاش کرنا، اس لئے درست نہیں کہ علامہ شبلی کی اولیات ان سے کم نہیں ہیں۔ اور

پھر انھوں نے جس طرح ندوہ کی خدمت کی، تحریک وقف علی الاولاد چلائی، جس طرح دارالمصنفین قائم کیا، طلبہ کی رہبری و رہنمائی کی، جس کا آغاز علی گڑھ کالج میں ہوا تھا اور جس طرح انھوں نے شعر و ادب، تحقیق و تنقید کے ساتھ سروکار رکھا اور سب سے آخر میں سیرۃ النبیؐ جیسا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، وہ سب مولانا حالی کے حصہ میں نہیں آیا اور سب سے آخر میں انھوں نے قوم پرستی کے جو جذبات برانگیختہ کیے اور جس نے سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں جیسے اہل نظر کو متاثر کیا، اس کی مثالیں مولانا حالی کی زندگی میں کہاں سے آئیں گی اور نہ ان کے یہاں تلاش ہی کرنی چاہئے۔

بہرکیف مولانا حالی کی عظمت کسی طرح کم نہیں اور اردو ادب کی تاریخ ان کے مقدمہ شعر و شاعری کو کبھی فراموش کرسکتی ہے۔ ہاں سرسید کی محض قربت کسی کو عظمت نہیں دلا سکتی۔ اس کا تعلق خون جگر جلانے سے ہے۔ مولانا حالی سے بیس سال چھوٹے علامہ شبلی نے دنیا انھیں کے ساتھ چھوڑی گویا جو کام مولانا حالی نے ۷۷ رسال کی عمر میں کیا اس سے زیادہ کام علامہ شبلی نے ۵۷ رسال کی عمر میں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی ہماری نئی نسل کی آرزو ہیں۔

---

(۱۹۷)

ڈاکٹر شباب الدین

[پ: یکم جولائی ۱۹۵۸ء]

ڈاکٹر شباب الدین سابق صدر شعبہ اردو شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ ایک لائق استاذ، اہل قلم اور کئی کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں۔ ان کے طرز تحریر میں بڑی شائستگی اور سنجیدگی ہے۔ سرسید احمد خاں کے ساتھ وہ علامہ شبلی کے بھی بڑے شیدائی ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی کے تو عاشق زار ہیں۔ ان پر ڈاکٹر شباب الدین کا پی ایچ ڈی کا شاندار مقالہ شائع ہو چکا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی حیات و خدمات پر یہ پہلا بھرپور مقالہ تھا۔ اس سے قبل ڈاکٹر شباب الدین نے ایم فل کے لئے ''دارالمصنفین کی ادبی خدمات کا تعارف'' کا عنوان منتخب کیا تھا

اور اچھا مقالہ لکھا ہے۔ یہ بھی کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ گویا شروع ہی سے ان کے مطالعہ وتحقیق کا مرکز توجہ دبستان شبلی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں متانت، سنجیدگی اور وقار کے پہلو نمایاں ہیں۔

وہ جب شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سے وابستہ ہوئے کالج میں یوم شبلی کی رونق بہت بڑھ گئی اور کالج میں علامہ شبلی کی اہمیت اور عظمت اور ان کے کارناموں کے مطالعہ کا شوق بڑھ گیا۔ انھوں نے کالج میں متعدد سمینار منعقد کر کے علامہ شبلی اور فکر شبلی کی تفہیم کی راہیں ہموار کیں۔ یہاں پر ڈاکٹر افتخار احمد صاحب سابق پرنسپل شبلی نیشنل کالج کا ذکر بھی ضروری ہے کہ وہ ڈاکٹر شباب الدین صاحب کی راہ میں روشن چراغ کی طرح روشنی بکھیرتے رہے۔

ڈاکٹر شباب الدین نے علامہ شبلی پر متعدد تحریریں لکھی ہیں۔ ۲۰۰۷ء میں علامہ شبلی کی ۱۲۵ رویں سالگرہ کے موقع پر بین الاقوامی سمینار منعقد کیا، جس میں ملک وبیرون ملک کے ممتاز اہل قلم نے شرکت کی۔ راقم بھی شریک بزم تھا۔ اس سمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ''علامہ شبلی نعمانی معنویت کی بازیافت'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے بہت مفصل اور طویل مقدمہ لکھا ہے اور حق تو یہ ہے کہ مقدمہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے دل میں علامہ شبلی کی کس قدر عظمت ہے، ان کے اس اقتباس سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ علامہ شبلی کے سیاسی شعور کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''علامہ شبلی نے عملی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا مگر دنیا میں رونما ہونے والے سیاسی انقلابات پر ان کی گہری نظر تھی، ان کا اپنا ایک الگ سیاسی نظریہ بھی تھا، بالخصوص مسلم سیاست کے تمام پہلوؤں پر وہ بڑی عالمانہ رائے رکھتے تھے، ان کی سیاسی فکر سے ملک کے بعض مقتدر رہنماؤں نے اپنی اپنی فکر کے چراغ روشن کئے، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کے سیاسی مسلک پر علامہ شبلی کے فکر کی گہری چھاپ نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔
>
> علامہ شبلی نے سیاست کے موضوع پر کوئی مستقل کتاب تو نہیں لکھی، لیکن ان کی نظموں، مقالوں اور خطبوں میں ان کے سیاسی افکار جگہ جگہ ملتے ہیں۔''

(علامہ شبلی معنویت کی بازیافت، ص:۱۹)

---

(۱۹۸)

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی

[پ:۱۹۶۰ء]

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، مدرسۃ الاصلاح اور مسلم یونیورسٹی کے نامور فرزند اور ہمارے عہد کے ممتاز اہل قلم ہیں۔ متعدد کتابیں ان کے قلم سے نکل کر مقبول ہو چکی ہیں۔ انہوں نے مستقل کتابوں کے علاوہ کثرت سے مضامین و مقالات بھی سپرد قلم کیے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی سے بے حد متاثر ہیں۔ ان کی شخصیت اور کارناموں پر دسیوں مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ 'مطالعہ شبلی' قرطاس کراچی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ ان کے مجموعہ مقالات انعکاس میں بھی علامہ شبلی سے متعلق چند مضامین شامل ہیں۔ ان کا ذکر انہوں نے اپنے دیباچے میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> "علامہ شبلی نعمانی کو عربی زبان و ادب کے اساطین میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ عربی مصادر و مراجع پر آپ کی وسعت نظر کو دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے، عربی میں پانچ تصانیف کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں جدید عربی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں پہلی آواز اور پہلی کوشش آپ ہی کی تھی۔ اس کا پہلا زینہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی لجنۃ الادب تھی، جس کی بناء کا سہرا علامہ کے سر ہے۔ اس کے علاوہ ندوۃ العلما کو جدید عربی زبان و ادب کا محور و مرکز بنانے میں آپ کی کاوشوں کا خصوصی دخل ہے۔" (انعکاس، ص:۶)

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی کی کتاب "مطالعہ شبلی" اپنے خاصے اہم مشمولات کی بنا پر لائق مطالعہ و استفادہ ہے۔

---

(۱۹۹)

ڈاکٹر محمد عارف عمری

[پ: ۱۳؍ جنوری ۱۹۶۱ء]

مولانا ڈاکٹر محمد عارف عمری دبستان شبلی کے ایک ممتاز اہل قلم ہیں۔ وہ موضع شیخوپور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ مدرسۃ الاصلاح اور دارالسلام عمرآباد سے تحصیل علم کے بعد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ پہنچے۔ تکمیل کے بعد عالم اسلام کے مایہ ناز تصنیفی ادارے دارالمصنفین کے رفیق منتخب ہوئے۔ کئی سال کی علمی و تصنیفی خدمات کے بعد والدین کی خدمت کے لئے ممبئی چلے گئے اور اب تک وہیں ایک مدرسہ عزیزیہ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

وہ بڑے اچھے اہل قلم ہیں۔ کئی کتابیں تذکرہ مفسرین ہند حصہ اول، اسلام اور مستشرقین جلد ہفتم، دارالمصنفین کی عربی خدمات، وغیرہ طبع ہو چکی ہیں۔ ایک مجموعہ مضامین ''سرمایہ قلم'' بھی ادبی دائرہ اعظم گڑھ سے شائع ہوا ہے۔

فطری طور پر انہیں علامہ شبلی سے گہری عقیدت ہے۔ چنانچہ جب ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے سیرت النبی پر سخت تنقیدیں کیں تو ان کا نام لئے بغیر جوابی مضمون لکھا۔ الانتقاد کی تدوین بھی ان کی ایک کاوش ہے۔ اس کے لئے انہوں نے دارالمصنفین کے علاوہ بعض دوسرے کتب خانوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ دارالمصنفین کی عربی خدمات، ان کا تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی ادبی دائرہ اعظم گڑھ سے طبع ہو چکا ہے۔ اس میں متعدد مقامات پر علامہ کا ذکر ہے۔ اس کے دیباچہ میں انہوں نے علامہ شبلی کی عربی تصنیف ''الانتقاد'' کا ذکر کیا ہے اور اس کی تلاش و جستجو اور طبع واشاعت کی داستان سنائی ہے۔ (ص: ۹-۱۰)

الانتقاد کا اب محقق ایڈیشن ڈاکٹر محمد اجمل ایوب صاحب کی تحقیق و مراجعت کے بعد دارالمصنفین اور بیروت دونوں جگہوں سے شائع ہوا ہے۔

علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ مجھے شعرالعجم سے پہلے شعرالعرب لکھنا چاہیے تھا مگر اس کے لئے قاری کہاں سے لاتا۔ بالآخر وہ ایک مضمون سے آگے کام نہ کر سکے۔ اس کے بعد ان کے ایک

عزیز شاگرد مولانا عبدالسلام ندوی نے پایہ تکمیل تک پہنچانے کا عزم کیا مگر وہ بھی غالباً مکمل نہ کر سکے۔ مولانا محمد عارف عمری نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ کے ایک باب میں اس کی تفصیل لکھی ہے:

> ''مقالہ کا چوتھا باب ''شعر العرب'' کے عنوان سے ہے۔ اس موضوع سے متعلق علامہ شبلی نعمانی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی تحریروں کو یکجا کر دیا گیا ہے، جس کے مطالعے سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ ہوگا کہ علامہ شبلی کے پیش نظر شعر العرب کی تالیف کا خاکہ کیسا تھا اور اب بھی یہ خاکہ تشنہ تکمیل ہے۔''
>
> (دارالمصنفین کی عربی خدمات، ص:۱۵-۱۶)

---

(۲۰۰)

پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی

[پ: یکم جون ۱۹۶۲ء]

پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی استاذ شعبہ اردو خواجہ معین الدین عربی فارسی یونیورسٹی لکھنؤ نے یونیورسٹی میں منعقدہ علامہ شبلی سمینار کے مقالات کا مجموعہ مرتب کیا ہے۔ اس کا نام ''شبلی شناسی'' ہے۔ اس میں علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کے افکار و خیالات پر بڑے اچھے مقالات یکجا ہو گئے ہیں۔ اس کا پیش لفظ سید شفیق احمد اشرفی نے لکھا ہے۔ انھوں نے علامہ شبلی کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے:

> ''علامہ ایک شخص نہیں ایک شخصیت تھے۔ ایک ذات نہیں ایک انجمن تھے، اور ایک فرد نہیں ایک ادارہ تھے۔ بعض شخصیات کسی ایک میدان کی شہسوار ہوتی ہیں اور اسی پر ان کی شناخت کا دار و مدار ہوتا ہے۔ لیکن علامہ شبلی ایک کثیر الجہات اور جامع الکمالات شخصیت کے حامل تھے۔ وہ بیک وقت ایک عالم، ادیب، شاعر، نقاد، محقق، فلسفی اور ماہر تعلیم تھے۔'' (شبلی شناسی، ص:۸)

---

(۲۰۱)

مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی

[پ: یکم فروری ۱۹۶۲ء]

مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی صاحب مدرسۃ الاصلاح کے ممتاز فرزند اور ہمارے عہد کے نامور عالم دین اور ایک بڑے خطیب اور اہل قلم ہیں۔ قرآن اور علوم القرآن پر ان کی بڑی گہری نگاہ ہے۔ انہوں نے جس مدرسۃ الاصلاح سے تحصیل علم کیا ہے اور جس کی خدمت میں وہ مصروف ہیں، علامہ شبلی اس کے بانیوں میں ہیں۔ فطری طور پر انہیں علامہ شبلی سے عقیدت ہے۔

مولانا عمر اسلم اصلاحی تصنیف و تالیف کا بڑا عمدہ مذاق رکھتے ہیں۔ ان کی متعدد علمی و تحقیقی کتابیں اور مضامین و مقالات ملک کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوکر اہل علم کے درمیان قابل قدر قرار پائے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں قرآن مجید کا طریقہ تدریس، معاشرتی اصلاح قرآن کی روشنی میں، قرآن مجید پر اعتراضات کا جائزہ، قرآن مجید بحیثیت ماخذ سیرت، انتخاب سنن نسائی و ابوداؤد، اور ''زندگی رسول'' کی خاص طور پر قابل ذکر اور لائق مطالعہ ہیں۔

وہ مدرسۃ الاصلاح میں تدریس قرآن کے ساتھ سہ ماہی مجلّہ نظام القرآن کی ادارت بھی کر رہے ہیں۔ بچوں میں بھی تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔

مولانا اصلاحی نے مدرسۃ الاصلاح ایک تعارف کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ چونکہ علامہ شبلی مدرسہ کے بانیوں میں ہیں اس لئے ان کا بھی ذکر خیر آیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''۱۹۱۰ء میں مدرسۃ الاصلاح میں انجمن اصلاح المسلمین کا سالانہ جلسہ ہوا، جس میں علامہ شبلی نعمانی بھی شریک ہوئے۔ مولانا محمد شفیع نے ان سے درخواست کی کہ وہ مدرسہ کی سرپرستی قبول فرمالیں۔ علامہ نعمانی نے بخوشی اس کی سرپرستی قبول فرمائی۔ ایک آئیڈیل مدرسہ کے لئے انہوں نے جو خاکہ بنایا تھا اس میں رنگ بھرنے کا انہیں موقع مل گیا اور انہوں نے مدرسہ پر پوری توجہ مبذول کر دی۔ انہوں نے اپنی معاونت کے لئے علامہ حمید الدین فراہی سے رابطہ کیا اور ان سے

یہ خواہش کی کہ وہ کچھ دنوں کے لئے مدرسہ پر آجائیں اور مدرسہ کا ایک جامع اور مکمل خاکہ تیار کر کے اسی کے مطابق اس مدرسہ کو چلایا جائے۔''

(مدرسۃ الاصلاح۔ایک تعارف،ص:۶)

ناچیز نے ''علامہ شبلی اور مدرسۃ الاصلاح'' کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا ہے،جو راقم الحروف کی کتاب بیان شبلی حصہ دوم میں شامل ہے۔

مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی صاحب کی ایک اہم کتاب ''قرآن مجید بحیثیت ماخذ سیرت'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔اس کے دیباچہ میں انہوں نے ذکر کیا ہے کہ

''مولانا ابوالکلام آزاد کی وہ تحریر نظر سے گذری،جس میں انہوں نے علامہ شبلی نعمانی سے گذارش کی تھی کہ وہ اپنی سیرت کی کتاب میں ایک ایسا باب ضرور باندھیں جس میں سیرت نبویؐ کا ماخذ اور مصدر قرآن مجید کو قرار دیا گیا ہو،اور انہوں نے جواب میں یہ فرمایا کہ اتنا مواد قرآن سے کہاں نکل سکتا ہے؟ تو پریشانی اور بڑھ گئی کہ جس کام میں شمس العلما کو تامل ہو رہا تھا وہ کام مجھ جیسے معمولی طالب علم کیوں کر ہو سکے گا،لیکن جب میں دیکھا کہ علامہ شبلی نعمانی نے اس جانب توجہ مبذول فرمائی تو بڑا ذخیرہ اکٹھا کر رہا ہوں تو مجھے بھی حوصلہ ملا اور میں نے خود قرآن مجید کا مطالعہ بحیثیت ماخذ سیرت شروع کیا تو اتنے گوشے سامنے آئے کہ مجھے مولانا آزاد کی وہ بات بالکل درست معلوم ہونے لگی کہ قرآن مجید سیرت نبوی کا بہت بڑا اور مکمل ماخذ سیرت ہے۔''

(قرآن مجید بحیثیت ماخذ سیرت،ص:۹-۱۰)

مولانا ابوالکلام آزاد کی علامہ شبلی سے اس گفتگو کا ذکر ان کی خودنوشت ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' میں بھی درج ہے۔

اس طرح کی کوشش بعض دوسرے اہل قلم نے بھی کی ہے۔اور سیرت کی بعض اور کتابیں بھی لکھی گئی ہیں،لیکن اس موضوع کا خیال بہرحال مولانا ابوالکلام آزاد کے اخاذ ذہن کی دین ہے۔

---

(۲۰۲)

ڈاکٹر خالد ندیم

[پ: ۹؍فروری ۱۹۶۳ء]

ادیب، شاعر، ناقد اور محقق ڈاکٹر خالد ندیم صاحب شبلی شناسی کے میدان میں سب سے آخر میں آئے، لیکن انتہا کو پہنچ گئے۔ ان کی کتاب ''شبلی کی آپ بیتی'' بے نظیر کتاب ہے۔ مکمل شبلی کی بازیافت کا جو خواب قدردانان شبلی برسوں سے دیکھ رہے ہیں ڈاکٹر خالد ندیم نے اسے شرمندہ تعبیر کرنے میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس کے لئے وہ تمام اہل علم وادب کے شکریہ اور قدردانی کے مستحق ہیں۔ یہی نہیں انھوں نے ایک اور تحقیقی کارنامہ انجام دیا۔ ''شبلی شکنی کی روایت اور دوسرے مضامین'' لکھ کر علامہ شبلی کی تنقیص کرنے والوں کی کم مائیگی ظاہر کردی ہے۔ وہ اپنے گہرے تنقیدی شعور اور وسیع مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

''علامہ شبلی نعمانی محض ایک عالم، ایک معلم، ایک مورخ، ایک سوانح نگار ایک نقاد یا شاعر ہی نہ تھے بلکہ وہ مسلمانان ہند کے اولین رہنما تھے۔ جس نے ان کی دینی، تعلیمی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی ضرورتوں کو سمجھا اور پھر ان کے حصول کے لئے ہمہ جہت جدوجہد کی۔ انھوں نے کبھی مصلحت سے کام نہ لیا بلکہ جس امر کو ہندی مسلمانوں کے مستقبل کے لئے ناگزیر جانا اس کے لئے ذاتی مفاد ہی نہیں، دیرینہ ذاتی حتی کہ جذباتی تعلقات تک کو قربان کردیا۔ مطالعہ حیات شبلی سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تگ وتاز کا یہی ایک مقصد رہا، چنانچہ انھوں نے جو کچھ کہا، جو کچھ لکھا اور جو کچھ کیا ان تمام کا تعلق مسلمانوں کی بیداری سے تھا، نوجوانی میں انھوں نے وکالت کے آزاد پیشے پر فرق امینی جیسی معمولی ملازمت کو ترجیح دی، علی گڑھ میں تدریسی سرگرمیوں کے ساتھ مسلم طلبہ کی تربیت کی طرف متوجہ رہے۔ روم ومصر وشام کی علمی سیاحت میں اہل وطن پیش نظر رہے۔ علی گڑھ اور دیوبند کے اوصاف کو ندوہ میں یکجا کرنے کی کوشش کی۔ وقف اولاد کا قانون منظور

کرایا۔ اشاعت اسلام کا منصوبہ بنایا۔ نماز جمعہ کی رخصت کے لئے تحریک شروع کی۔ خدام الدین کا آغاز کیا۔ تصحیح اغلاط تاریخی کا صیغہ بنایا۔ مستشرقین کی طرف سے پھیلائی جانے والی تاریخی غلط فہمیوں کا تدارک کیا، حتی کہ زندگی کے آخری دنوں میں دارالمصنفین کی بنیاد رکھی۔'' (شبلی کی آپ بیتی، ص:۹)

علامہ شبلی کی حوصلہ مندیوں کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''شبلی والد کی دوسری شادی کے باعث پریشان ہوتے ہیں، دوستوں کی بے اعتنائی انھیں رلاتی ہے، بے روزگاری سے دکھی ہوتے ہیں، علی گڑھ میں تنہائی محسوس کرتے ہیں۔ ندوہ میں مخالفوں کا مقابلہ کرتے ہیں، مرحوم والد کے ذمے تیس ہزار روپے کا قرض اتارتے ہیں، لیکن زندگی کے کسی دور میں مایوس نہیں ہوتے بلکہ علم و آگہی کی نئی نئی جہتوں اور فکر و خیال کے نت نئے پہلوؤں کے متلاشی رہتے ہیں۔

آج پاک و ہند میں مسلمانوں کی بقا اور ان کی تہذیبی اقدار کے تحفظ میں سرگرم عمل اداروں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اکثر علامہ شبلی کے خوابوں کی عملی تعبیر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شبلی کے خواب، شبلی کے خیالات، شبلی کے ارادے، شبلی کی جد و جہد اور شبلی کے اعصاب، یہ سب مزید مطالعات، تحقیقات اور استخراج نتائج کے متقاضی ہیں۔'' (ایضاً ص ۹-۱۰)

علامہ شبلی کی خوبصورت اور دلآویز کتاب زندگی کا سب سے بدنما باب ان کی تنقیصات ہیں۔ اس کی طویل داستان ہے، جس کا بارہا ذکر اس کتاب میں بھی آیا ہے۔ ان تنقیصات کا سب سے پہلے ڈاکٹر ابن فرید نے پردہ چاک کیا۔ ان کا مقالہ ''شبلی چوں بہ خلوت می رود'' آج بھی قابل مطالعہ ہے۔ دوسری کوشش مرحوم سید شہاب الدین دسنوی کی کتاب ''شبلی: معاندانہ تنقید کی روشنی میں'' ہے۔ اس سلسلہ کی آخری کوشش ڈاکٹر خالد ندیم کی کتاب ''شبلی شکنی کی روایت اور دوسرے مضامین'' ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کتابوں نے علامہ شبلی کے شفاف چہرے پر لگے بدنما داغ کو آئینہ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر خالد ندیم کے بہت سے خیالات سے اختلاف کی بھی گنجائش ہے، تاہم ان

کے جذبہ اخلاص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا اور ان کا یہ خیال کس قدر اہم ہے کہ

"میں کسی بھی فنکار کی بے جا مخالفت کو ادبی بددیانتی تصور کرتا ہوں، میں کسی طور شبلی کا وکیل نہیں اور نہ ہی اس کا اہل ہوں لیکن جہاں کہیں شبلی نعمانی کی ذات یا علمی کارناموں پر تنقیص ہوتی ہے میں تڑپ اٹھتا ہوں۔ ادبی تنقید سے کسے مفر ہے اور کون ہے جو اس سے مستثنیٰ ہو لیکن شبلی نعمانی اور علامہ اقبال کو ادبی تنقید کا سامنا نہیں بلکہ ان پر ہونے والی تنقید کا تعلق ذاتی تعصّبات سے ہے۔"

(شبلی شکنی کی روایت، ص:۱۱)

ڈاکٹر صاحب سرگودھا یونیورسٹی پاکستان کے شعبہ اردو کے سربراہ ہیں۔ شبلی کی آپ بیتی کے علاوہ دیگر موضوعات پر تقریباً ایک درجن ادبی، تنقیدی اور تحقیقی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ حال میں ڈاکٹر علامہ اقبال کا نثری کلیات مرتب کیا ہے۔ بلاشبہ وہ ایک اہم ادبی کام تھا اور ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال سے تعلق کا حق ادا کیا ہے۔ یقین ہے آئندہ بھی وہ شبلی و اقبال کی ایسی ہی خدمت انجام دیتے رہیں گے۔ ناچیز کی طرح ایک کائنات پر انحصار نہیں کریں گے۔

---

(۲۰۳)

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

[پ:۱۵/ مارچ ۱۹۶۳ء]

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی سابق صدر شعبہ دینیات (سنی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مدیر ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کے نامور فرزند ہیں۔ انتہائی سنجیدہ، باوقار اور صاحب نظر عالم ومصنف ہیں۔ ان کے قلم سے متنوع موضوعات پر متعدد علمی وتحقیقی اور بلند پایہ کتابیں نکل کر مقبول اور اہل علم سے داد تحسین وصول کر چکی ہیں۔ ان کی چند تصانیف کے نام یہ ہیں:

اسلام اور عصر حاضر کے مسائل، اسلام اکیسویں صدی میں، اسلامی معاشرہ میں مساجد کا

کردار، خواتین اور اسلامی بیداری، سراغ زندگی، فتنہ وضع حدیث اور موضوع احادیث، منہاج تفسیر، مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت وغیرہ۔

پروفیسر موصوف کی فکر شبلی وشبلیات پر بھی گہری نظر ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ علامہ شبلی نعمانی کی سیرت وشخصیت کے متنوع پہلوؤں پر علمی وتحقیقی کام ہوا، مگر قرآنیات کا موضوع اچھوتا ہے۔ چنانچہ اس کمی کی تلافی کے لئے انہوں نے ایک تحقیقی کتاب ''علامہ شبلی نعمانی کی قرآن فہمی'' سپرد قلم کی، جو ۲۰۰۵ء میں دارالنوادر لاہور سے شائع ہوئی۔ بلاشبہ یہ اپنے موضوع پر پہلی اور منفرد تصنیف ہے۔ اس کے دیباچہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ

''مولانا شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] انیسویں اور بیسویں صدی کے ان نامور علماء ودانشوروں میں تھے جنہوں نے اپنی متنوع نگارشات اور وقیع علمی وادبی خدمات سے ہندوستان کے تہذیبی ورثہ کو مالا مال کیا ہے۔ علامہ شبلی کی علمی وفکری تربیت قدیم اور جدید دونوں ماحول میں ہوئی تھی، اس لئے ان کی تحریروں میں دونوں علمی رویوں کا آہنگ صاف نظر آتا ہے۔ اور اسی لئے ان کی علمی دلچسپیوں کا دائرہ تاریخ، ادب، فلسفہ، کلام، تعلیم، الٰہیات، سیرت وسوانح تک پھیلا ہوا ہے۔ قدیم علوم نے ان کی بنیاد مضبوط کی ہے اور جدید تحقیقی منہاج نے ان کے نقطہ نظر کو وسعت اور جدت فراہم کی ہے۔

بیسویں صدی کے ہندوستان کی کوئی بھی علمی وادبی تاریخ لکھی جائے گی تو علامہ شبلی نعمانی کو نظرانداز نہ کیا جا سکے گا۔''

(علامہ شبلی نعمانی کی قرآن فہمی، ص:۶)

یہ کتاب ابتداء میں ایک مقالہ کی شکل میں سامنے آئی تھی جو ۲۰۰۴ء میں علامہ شبلی نعمانی سمینار منعقدہ دارالمصنفین میں پیش کیا گیا تھا۔ اس شاندار سمینار کے کنویز مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم تھے۔ راقم بھی اس سمینار میں شریک ہوا تھا اور علامہ شبلی بحیثیت مدیر کے عنوان سے مقالہ پیش کیا تھا۔

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی ایک بڑے خطیب ومقرر بھی ہیں۔ ان کے خطبات کا ایک

مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔

پروفیسر قاسمی نے ناچیز کی کتاب ''افادات شبلی'' پر دیباچہ لکھا ہے۔ان کا خیال ہے کہ

''علامہ شبلی نعمانیؒ انیسویں اور بیسویں صدی کے ان علماء اور دانشوروں میں شامل تھے جن کو عبقری کہا جاتا ہے۔ان کا تصنیفی و تدریسی کام اور علمی و تحقیقی دنیا میں ان کا مقام کسی بھی اہل علم سے مخفی نہیں ہے۔ان کی تاریخ نگاری ہو یا فارسی اور اردو شاعری، تنقید نگاری ہو یا سوانح نگاری، سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی کتاب ہو یا تعلیم کی اشاعت پر ان کی نگارشات، اسلام کی دعوت ہو یا مستشرقین کی جامہ تلاشی، فلسفۂ اشراق ہو یا مطالعۂ ادیان، ہر جگہ ان کا تحقیقی ذہن اور گہربار قلم ان کی عبقریت کی یاد دلاتا ہے۔وہ مشرق و مغرب کی تہذیبی قدروں کے رمز شناس تھے اور ملت اسلامیہ ہند کی نشاۃ ثانیہ کے علمبردار۔وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔انہوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا پورا احاطہ کیا اور نئی نسل کے لیے علم و تحقیق کی ایک روشن شاہ راہ چھوڑی۔بعد کے اردو مصنفین خواہ حلقۂ ادب سے تعلق رکھتے ہوں یا مذہبی اختصاص سے، علامہ شبلی ان کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' (افادات شبلی، ص:۹)

---

(۲۰۴)

ڈاکٹر علاء الدین خاں

[پ:۲۰رمئی ۱۹۶۶ء]

ڈاکٹر علاء الدین خاں علامہ شبلی کی پہلی تعلیمی یادگار شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ میں تاریخ کے استاذ ہیں۔شبلی صدی کے موقع پر اور اپنے ایک استاذ کی خواہش پر ''بیاد شبلی'' کے نام سے ایک مجموعہ مقالات مرتب کیا، جس میں اہل علم کے عمدہ مقالات شامل ہیں۔ڈاکٹر علاء الدین خاں نے اس پر ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے، جس میں علامہ شبلی کے تاریخی ذوق اور ان کی تاریخی

نگارشات کا بالتفصیل تجزیہ پیش کیا ہے۔اس کے آغاز میں وہ لکھتے ہیں:

''شبلی نے ہندوستان کی مسخ شدہ تاریخ کو مثبت انداز میں پیش کرنے کا جو اسلوب و انداز اپنایا تھا وہ یقیناً ہماری نئی نسل کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔اسی طرز سے ملک کے ساتھ وفاداری، دوسری قوموں کے ساتھ ہمدردی، گذشتہ تاریخ سے دلچسپی اور باہم رواداری کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔'' (بیاد شبلی، ص:۹)

تمام تجزیوں کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

''شبلی نے تاریخ ہند کا جس گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا ہے، موجودہ عہد کے محققین کو اسی اسلوب و معیار کو اپنانے کی ضرورت ہے تا کہ مسلمان حکمرانوں اور عام مسلمانوں کے متعلق نام نہاد غیر مسلم مورخین نے جو غلط فہمیاں پھیلائی ہیں اور ان کے دامن پر ظلم و تعدی کے جو داغ لگائے ہیں یا ان کی پر عظمت تاریخ کو جس انداز سے بدنما کرنے کی کوشش کی ہے ان کا اسی معیار و انداز میں جواب دیا جا سکے تا کہ بدگمانیوں کا سلسلہ ختم ہو۔'' (ایضاً، ص:۲۶)

---

(۲۰۵)

ڈاکٹر ارشاد نیازی

[پ:۹رجنوری ۱۹۶۸ء]

ہمارے کرم فرما ڈاکٹر ارشاد نیازی صاحب استاذ شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا ایک موضوع مطالعہ شبلی بھی ہے۔انھوں نے ''عہد شبلی کے تنقیدی تصورات'' کے عنوان سے مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند لی ہے۔موازنہ انیس و دبیر کے مطالعہ، محاسبہ اور تجزیہ پر ایک مفصل کتاب لکھی ہے جو ۲۰۰۰ء میں دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔بعد ازاں علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر و فن پر کتابوں کی کمی کے احساس نے ایک اور کتاب مرتب کرنے کا خیال پیدا کیا۔چنانچہ انھوں نے ''تفہیم شبلی'' کے نام سے ایک نہایت مبسوط کتاب شائع کی جس میں علامہ شبلی کی شخصیت

بعض تصنیفات، شاعری، تنقید نگاری، سوانح نگاری، کلام وعقائد، مقالہ نگاری، خطوط نگاری اور ان کے اسلوب بیان وغیرہ پر ہندوستان کے ممتاز اہل قلم اور مقالہ نگاروں کے مضامین یکجا کئے گئے ہیں۔ ''تفہیم شبلی'' کئی لحاظ سے بہت اہم ہے۔اس کے مطالعہ سے علامہ شبلی کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں اور اہل علم کے آراو خیالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ڈاکٹر ارشاد نیازی ان کاوشوں کے لئے قابل صد مبارک باد اور اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

تفہیم شبلی پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے، وہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔حالانکہ ان کا یہ احساس ہے کہ

> ''شبلی نے اپنے معاصرین یعنی سرسید، حالی، محمد حسین آزاد اور نذیر احمد وغیرہ میں سب سے کم عمر پائی، صرف ستاون برس، لیکن جہاں تک علمی وادبی کارناموں کا تعلق ہے اپنے تمام معاصرین میں سب سے ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔''
>
> (تفہیم شبلی، ص:۱۰)

پھر اس کی انھوں نے تشریح کی ہے۔تفہیم شبلی کے مختلف ابواب کا انھوں نے بڑے عمدہ انداز سے تعارف کرایا ہے۔اس کے ضمن میں علامہ شبلی کی شخصیت کے تمام اہم پہلو واضح کر دیئے ہیں۔اس سے مطالعہ شبلی میں ان کی گہری نظر اور ان کی تنقیدی صلاحیت بھی سامنے آتی ہے۔مگر یہ ایک قابل تنقید بات ہے کہ انھوں نے اپنے موقف کی تائید میں جن اہل قلم کے اقتباسات درج کئے ہیں ان کا حوالہ تو درکنار ان کا نام لینا بھی گوارا نہیں کیا ہے۔

ڈاکٹر نیازی نے علامہ شبلی پر جو کچھ لکھا ہے وہ غیر جانبدارانہ کے ضمن میں آتا ہے۔خاص طور پر موازنہ انیس و دبیر کے مطالعہ میں جس کا انھوں نے بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے، ان کا یہی رویہ سامنے آتا ہے۔وہ گہرے مطالعات شبلی کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

> ''موازنہ انیس و دبیر سے قبل مرثیہ کے فنی لوازمات کا زبانی طور پر تو ذکر عام تھا۔ ان سے متعلق کچھ بے ربط باتیں جو حقیقت سے قریب ہوتی تھی کہہ تو دی جاتی تھیں مگر ان باتوں میں تال میل بٹھا کر ایک منظم طرز فکر کی تشکیل دینے کی کوشش ناپید تھی۔شبلی نے نہ صرف ان باتوں کو ترتیب دے کر ان میں نظم وضبط پیدا کیا بلکہ

مرثیہ کے فنی لوازمات کو سامنے رکھ کر اس کی حد بندی کی۔ یہی نہیں مرثیہ کے لیے ایسے اوضاع مقرر کیے جو مرثیے کے تمام صفات پر حاوی ہیں۔ شبلی کے مقرر کردہ مرثیہ کے تنقیدوں، اصول اس قدر (Compact) ہیں کہ آج تک ان میں تبدیلی نہیں کی جا سکی، حالانکہ اس عرصے میں تنقید اور مرثیہ دونوں نے ارتقا کی کافی منزلیں طے کر لی ہیں۔ اس طرح موازنہ کو نہ صرف مطالعہ انیس کے سلسلے میں بلکہ صنف مرثیہ کے مطالعے کے سلسلے میں بھی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔"

(ایضاً، ص:۱۴۰)

---

(۲۰۶)

ڈاکٹر محمد سہیل شفیق

[پ: ۱۹؍مئی ۱۹۷۷ء]

پروفیسر ڈاکٹر محمد سہیل شفیق صدر شعبہ اسلامی تاریخ جامعہ کراچی حوصلہ منداور ہونہار اہل قلم ہیں۔ کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ مرکز برائے ترتیب اشاریہ، حواشی و کتابیات کراچی کے منتظم اعلی ہیں۔ انھوں نے کئی ایسے علمی کام انجام دئے ہیں جنھیں شبلی شناسی کے حوالہ سے یاد رکھا جائے گا۔ اولاً انھوں نے ماہنامہ معارف کا اشاریہ مرتب کیا۔ اس کام کی جانکاہی کا اندازہ وہی شخص کرسکتا ہے، جس نے اشاریہ ترتیب دیا ہو۔ پھر وفیات معارف جمع کیں اور ضخیم کتاب تیار کی۔ بعد ازاں ماہنامہ معارف میں شائع ہونے والے علامہ شبلی نعمانی سے متعلق تاریخی مقالات کو ''معارف شبلی'' کے نام سے اگست ۲۰۱۶ء میں شائع کیا۔ اس میں راقم کے بھی تین مقالات کو شامل کیے ہیں۔ ان کی یہ تمام کاوشیں مکتبہ قرطاس کراچی نے اہتمام سے شائع کی ہیں۔

ان کتابوں پر انھوں نے جو مقدمے لکھے ہیں وہ خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ ان میں انھوں نے علامہ شبلی نعمانی کے حالات اور علمی کمالات کا بڑے احترام وعقیدت سے ذکر کیا ہے اور انھیں اسلامی تاریخ کا مایہ ناز مورخ قرار دیا ہے۔

(۲۰۷)

عزیز الدین خضری

[•••]

سرزمین اعظم گڑھ کی خوش فکر شاعرہ تبسم اعظمی کے شعری مجموعے ''دھنک'' پر جناب عزیز الدین خضری نے ابتدائیہ لکھا ہے۔ خضری صاحب جوش ملیح آبادی کے نواسے ہیں اور کراچی میں مقیم ہیں۔ شعر وادب پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر کا آغاز اعظم گڑھ اور علامہ شبلی کے ذکر سے کیا ہے اور علامہ کے بارے میں لکھا ہے کہ

> ''شبلی علیہ الرحمہ نے برصغیر کے دور ابتلا میں یعنی ۱۸۵۷ء میں جنم لیا اور کہہ لیجیے تھوڑے ہی عرصے تقریباً تیس سال نامساعد حالات میں علم وفن کی آبیاری کی اور وہ کچھ چھوڑ گئے، آج تک ان کے خوشہ چیں اس علم وادب کو آگے بڑھانے میں مصروف کار ہیں۔ علم وادب کا جو پودا شبلی نے لگایا تھا آج ایک تناور درخت بن کر اس نے اپنے سایہ تلے ایسے ایسے قلم کاروں کی نشو ونما کی کہ اردو ادب نازاں ہے۔'' (تبسم اعظمی، دھنک ص ۱۱، لکھنؤ، ۲۰۱۷ء)

---

(۲۰۸)

ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صدیقی

[•••]

ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صدیقی ندوی ابن مولانا ظل الرحمٰن صدیقی نے ''اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات'' کے عنوان سے مقالہ لکھ کر ممبئی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند لی۔ مقالہ انہوں نے محنت سے لکھا ہے۔ ان کے پیش لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علامہ شبلی کے پرستاروں میں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہمارے اس جائزے کی سند اور بنیاد علامہ شبلی نعمانی کی بیان کردہ تعریف ہے، جس میں انہوں نے اہل لغت اور علمائے بلاغت کی بیان کردہ نپی تلی محدود تعریف سے بلند ہو کر تلمیح کے لئے نئی اور وسیع بنیاد فراہم کی ہے۔ اور یہی صحیح بھی ہے۔ تلمیح ان کے نزدیک کسی واقعے یا قصے کی طرف محض اشارے کا نام نہیں ہے بلکہ کسی قصے یا واقعے سے استفادہ کرتے ہوئے مضمون پیدا کرنے کا نام تلمیح ہے۔ تلمیح خبر مجرد نہیں اور نہ ہی خبر مجرد کا اشارہ تلمیح ہے۔ تاوقتیکہ اس اشارہ سے کوئی نیا مفہوم نیا مضمون نہ پیدا کیا جائے، نیا خیال نہ تراشا جائے تلمیح کا لطف پیدا نہیں ہوتا۔ اشارہ تلمیح نہیں بنتا یوں بھی شعر وشاعری کے لئے خبر مجرد محض کسی دلچسپی یا کشش کا باعث نہیں ہوتا، ہم نے علامہ شبلی نعمانی کے اسی تصور و تعریف کو مشعل راہ بنا کر تلمیحات کا اور تلمیحات کے امکانات کا جائزہ لیا ہے اور اسی کی روشنی میں زیر نظر مقالہ ترتیب دیا ہے۔ ہمارا مقالہ علامہ شبلی کے اسی تصور کی تشریح و توسیع کا فریضہ انجام دینے کی طالب علمانہ کوشش ہے۔"

(اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات، ص:۳۰)

اس طرح کی کوششیں بھی بہت ہوئی ہیں، جن کا احاطہ مشکل کام ہے۔

---

(۲۰۹)

مولانا محمد تنزیل صدیقی الحسینی

[۲۲ رنومبر ۱۹۷۹ء]

علامہ شبلی کے متعدد مقالات ایسے ہیں جو اپنے موضوع پر پہلی بار لکھے گئے ہیں۔ اسی طرح کا ان کا ایک مقالہ امام ابن تیمیہ حرانی پر بھی ہے۔ اس کا ذکر تفصیل سے مولانا محمد یوسف کوکن کے ذیل میں آچکا ہے۔ مولانا محمد تنزیل صدیقی الحسینی ممتاز اہل قلم ہیں۔ ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں انہوں نے علامہ شبلی کے مقالہ کو ان کے معاصر مولانا حالی کے مقالہ کے

ساتھ کتابی صورت میں دارالعلم ممبئی سے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔انہوں اس کے مفصل مقدمہ میں یہ وضاحت بھی کی ہے کہ

> ''علامہ شبلی نعمانی اپنی جودت طبع اور گوناگوں اوصاف کی وجہ سے تاریخ اسلامی ہند میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ پہلے پہل انہی نے امام ابن تیمیہ کے حالات اردو میں لکھنے کی طرف توجہ دی۔ یہ درست ہے کہ امام ابن تیمیہ کی کثیرالجہات شخصیت کا کما حقہ ذکر کسی مختصر مقالے میں نہیں سما سکتا تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ خامہ شبلی نے بھی جامعیت کے تقاضے پورے کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حضرت الامام کی مجددانہ شان اور خصائص کے بارے میں شبلی کی تحریر بڑی اہمیت رکھتی ہے۔وہ معترف ہیں کہ ''جو شخص رفارمر (مجدد) کا اصلی مصداق ہوسکتا ہے وہ علامہ ابن تیمیہؒ ہیں۔'' (امام ابن تیمیہ،ص:۲۱)

''اثرات شبلی'' کی دو جلدوں پر مشتمل طویل داستان اختتام کو پہنچی اور قلم کے مسافر نے کچھ دنوں کے لئے راحت وآرام کی سانس لی۔

شکر کہ جمازہ بہ منزل رسید
زورق اندیشہ بساحل رسید

محمد الیاس الاعظمی
شائستہ منزل۔اعظم گڑھ
۲۵/اگست ۲۰۲۲ء

کتابیات

کتب

- آثار شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء
- آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی۔ مولانا ابوالکلام آزاد، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۸
- ابوالکلام آزاد۔ انور عارف، مکتبہ ماحول کراچی، مئی ۱۹۵۹ء
- ادب اور حقیقت۔ انجم اعظمی، کراچی اشاعت گھر، ۱۹۷۹ء
- ادبی آئینے۔ ڈاکٹر سید یحیٰ احمد ہاشمی، مکتبہ شاہد کراچی، ۱۹۷۴ء
- اردو تنقید۔ حامدی کاشمیری، ساہتیہ اکادمی، دہلی۔ ۱۹۹۷ء
- اردو تنقید کے معمار۔ ایم احبیب خاں، انڈین بک ہاؤس علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۶۵ء
- اردو زبان کی تمدنی اہمیت۔ عبدالرزاق قریشی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۲ء
- اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات۔ ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صدیقی، بمبئی، ۲۰۰۴ء
- اردو شاعری میں منظر نگاری۔ سلام سندیلوی، نسیم بک ڈپو لکھنو، اگست ۱۹۶۸ء
- اردو کے بہترین انشاء پرداز۔ ظفر الملک علوی، الناظر بک ڈپو لکھنؤ
- اردو کی ترقی میں مولانا آزاد کا حصہ۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، ۱۹۸۸ء
- اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء۔ ڈاکٹر ممتاز فاخرہ، رونق پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۴ء
- اردو میں قومی شاعری کے سو سال۔ علی جواد زیدی، محکمہ اطلاعات اترپردیش لکھنو ۱۹۵۹ء
- ارمغان سلیمان۔ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۲۱ء

- اسلام اور عربی تمدن ۔ شاہ معین الدین احمد ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ،۱۹۵۲ء
- اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مترجمہ مولوی سید سلمان حسینی ندوی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنو،۱۹۸۲ء
- اسلامی فکر اور تہذیب کا اثر ہندوستان پر ۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنو ۔۱۹۸۲ء
- اشاریہ معارف ۔ محمد سہیل شفیق، قرطاس کراچی،۲۰۰۶ء
- اصلاحات غالب ۔ مولوی حیدر علی نظم طباطبائی، مرتبہ مولانا محمد عبد الرزاق راشد، اعجاز پرنٹنگ پریس حیدر آباد،۱۹۶۶ء
- افادات شبلی ۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی،۲۰۲۲ء
- افکار سلیمانی ۔ مولانا مجیب اللہ ندوی، ندوۃ التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ
- افکار و شخصیات ۔ ظفر احمد صدیقی، رام پور رضا لائبریری، رام پور،۲۰۰۶ء
- اقبال اور دبستان شبلی ۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۵ء
- اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں ۔ ڈاکٹر سفیر اختر، بزم اقبال لاہور،۱۹۷۸ء
- اقبال نامہ، حصہ اول، شیخ عطاء اللہ، شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور،
- اقبال یار جنگ علمی و سماجی خدمات حصہ اول، نواب سید تاج الدین، اعجاز پرنٹنگ پریس حیدر آباد،۱۹۷۰ء
- الغزالی ۔ علامہ شبلی نعمانی، دار المصنفین اعظم گڑھ،۱۹۹۷ء
- الفاروق ۔ علامہ شبلی نعمانی، دار المصنفین اعظم گڑھ،۲۰۰۹ء
- الفاروق ایک مطالعہ ۔ پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ،۲۰۰۲ء
- الندوہ جلد اول تا نہم ۔ علامہ شبلی نعمانی، دار المصنفین اعظم گڑھ،۲۰۱۵ء
- الہلال کے تبصرے ۔ پروفیسر محمود الہی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو،۱۹۸۸ء
- امام ابن تیمیہ ۔ رشحات قلم علامہ شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، تقدیم و حواشی محمد تنزیل الصدیقی الحسینی، دار العلم ممبئی،۲۰۱۶ء

- امام ابن تیمیہ۔ مولانا محمد یوسف کوکن، نعمان پبلی کیشنز لاہور۔۲۰۱۴ء
- امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد۔ ابوعلی اثری، عبدالمجید کھوکھر لائبریری گجرانوالہ،۲۰۰۵ء
- امیر خسرو۔ شیخ سلیم احمد، ادارہ ادبیات دلی، دہلی، طبع اول: جنوری ۱۹۷۶ء
- امیر خسرو احوال و آثار۔ ڈاکٹر نورالحسن انصاری، مکتبہ شاہ راہ اردو بازار دہلی ڈ ۱۹۷۵ء
- انتخاب مضامین شبلی ۔ رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ دہلی، طبع دوم ۱۹۹۳ء
- انتخاب مقالات شبلی ۔ رضی کاظمی، اردو پبلشرز لکھنو
- انتخاب مکاتیب سرسید۔ شبلی اور اقبال، شیخ عطاء اللہ، قومی کتب خانہ لاہور، ۱۹۵۸ء
- انشائے ماجدی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ، ۱۹۹۱ء
- انعکاس۔ پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۰۸ء
- اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر۔ علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء
- باقیات شبلی ۔ مشتاق حسین، آزاد کتاب گھر دلی، ۱۹۶۴ء
- بنو ہاشم اور بنو امیہ کے معاشرتی تعلقات ۔ پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ، ۲۰۰۱ء
- بیادِ شبلی ۔ ڈاکٹر علاء الدین خاں، آبجکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی، ۲۰۱۷ء
- بیان شبلی (۱۔۲) ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۲۰ء، ۲۰۲۲ء
- بیدل عظیم آبادی۔ حامد حسن قادری، جامعہ نگر نئی دہلی، طبع ۲۰۱۰ء
- پروانہ چراغ مزار خدیم ما۔ ڈاکٹر شعیب اعظمی، جامعہ نگر نئی دہلی، ۱۹۷۵ء
- پیغمبر انسانیت ۔ مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع پنجم ۱۹۹۵ء
- تاثرات ۔ عبدالرزاق قریشی، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۶۹ء
- تاریخ التمدن الاسلامی (اول تا سوم)۔ جرجی زیدان، الہلال مصر، ۱۹۰۴ء
- تجزیہ یادگار مرثیہ، ڈاکٹر تقی عابدی، پرنٹ آرٹ پرنٹرس نئی دہلی، ۲۰۰۲ء
- تحقیقی مطالعہ انیس ۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
- تذکرہ گلشن ہند۔ مرزا علی طلف، علامہ شبلی نعمانی، رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور، ۱۹۰۶ء

- تذکرہ گلشن ہند۔ مرزا علی طلف، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، ۱۹۸۶ء
- تذکرہ ماہ وسال۔ مالک رام، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۹۱ء
- تصانیف شبلی کے تراجم۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۲۱ء
- تنقیدی مباحث اور شبلی کا نظام نقد۔ ڈاکٹر شاداب عالم، آدم پبلشرز دہلی، ۲۰۱۳ء
- جہان شبلی۔ ڈاکٹر صفیہ بی، مکتبہ جامعہ دہلی، ۲۰۰۰ء
- چند ارباب کمال۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی، اعظم گڑھ، ۱۹۸۳ء
- چند رجال اہل حدیث۔ ابوعلی اثری، ندوۃ المحدثین گجرانوالہ، ۱۹۹۶ء
- چند مقالات شبلی۔ پروفیسر سید محمد صدر الدین فضا شمسی، پستک بھنڈار پٹنہ
- حافظ کی شاعری۔ کے این پنڈت، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۷۷ء
- حرف واثر۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۲۲ء
- حسرت موہانی حیات اور کارنامے۔ ڈاکٹر احمر لاری، ادبستان گورکھپور، ۱۹۷۳ء
- حواشی ابوالکلام آزاد۔ سید مسیح الحسن، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۸۸ء
- خسرو اور عہد خسرو۔ عبدالرؤف عروج، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۷۵ء
- خطبات شبلی نو دریافت۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۲۱ء
- خطوط شبلی۔ امین زبیری، ظل السلطان بک ایجنسی بھوپال
- خلاصہ حیات شبلی، عبدالرزاق قریشی، بمبئی، جون: ۱۹۶۵ء
- دار المصنفین کی ادبی خدمات۔ خورشید نعمانی رودولوی، رحیمی پریس بمبئی، ۱۹۷۷ء
- دار المصنفین کی تاریخی خدمات۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۲۰۰۱ء
- دار المصنفین کی عربی خدمات۔ ڈاکٹر محمد عارف عمری، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء
- دبیر حیات اور کارنامے۔ مرزا محمد زماں آزردہ، مرزا پبلی کیشنز سری نگر، ۱۹۸۱ء
- دھنک۔ تبسم اعظمی، سینڈ پاپر پبلشر لکھنو، ۲۰۱۷ء
- دیوان حافظ مترجم۔ مترجمہ شمس الحسن شمس بریلوی، سعید ایچ ایم کمپنی، کراچی، ۱۳۹۱ء

- دیوان نوشاد۔ راجہ نوشاد علی خاں، مرتبہ راجہ محمد اعجاز رسول، نامی پریس لکھنو،۱۹۲۰ء
- سخن ہائے گفتنی۔ ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی، البلاغ پبلی کیشنز نئی دہلی،۲۰۰۴ء
- سرگذشت ایام۔ حافظ نذر احمد، مسلم اکادمی لاہور،۲۰۱۵ء
- سوانح مولانا روم۔ علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ،۲۰۱۰ء
- سوانح مولانا روم۔ علامہ شبلی، مرتبہ سید عابد علی عابد، مجلس ترقی ادب لاہور،۱۹۶۴ء
- سید سلیمان ندوی۔ ابوعلی اثری، ندوۃ المحدثین گوجرانوالہ،۱۹۸۵ء
- سید سلیمان ندوی حیات اور کارنامے، سید محمد ہاشم، شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،۱۹۹۵ء
- سیرۃ النبیؐ۔ جلد اول، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ،۲۰۰۳ء
- شاعر اعظم مرزا سلامت علی دبیر تحقیقی مطالعہ، ڈاکٹر اکبر حیدری، اردو پبلشرز لکھنو،۱۹۷۶ء
- شاہ معین الدین احمد ندوی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۰۷ء
- شبلی: اقتباسات کی روشنی میں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۲۲ء
- شبلی اور جہان شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۵ء
- شبلی اور معاصرین۔ پروفیسر عبدالحق، اصیلہ پریس دہلی،۲۰۱۴ء
- شبلی ایک دبستان۔ آفتاب احمد صدیقی، دارالمصنفین اعظم گڑھ،۲۰۱۵ء
- شبلی بحیثیت سیاست داں۔ اختر وقار عظیم، سنگ میل پبلی کیشن لاہور،۲۰۱۶ء
- شبلی بحیثیت مورخ۔ اختر وقار عظیم، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی،۱۹۷۹ء
- شبلی خود نوشتوں میں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۸ء
- شبلی شکنی کی روایت اور دوسرے مضامین۔ ڈاکٹر خالد ندیم، نشریات لاہور،۲۰۱۷ء
- شبلی شناسی۔ پروفیسر سید شفیق احمد، ایم آر پبلی کیشنز، دہلی،۲۰۱۵ء
- شبلی شناسی کے اولین نقوش۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، دارالمصنفین اعظم گڑھ،۲۰۱۶ء
- شبلی شناسی کے سو سال۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء
- شبلی کا ذہنی ارتقا۔ سید یحییٰ احمد ہاشمی مجلس یادگار ہاشمی کراچی،۱۹۹۶ء
- شبلی کی آپ بیتی۔ ڈاکٹر خالد ندیم، دارالمصنفین اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء

- شبلی کی ادبی وفکری جہات ۔ڈاکٹر شمس بدایونی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء
- شبلی کی حیات معاشقہ ۔ڈاکٹر وحید قریشی، ٹی اینڈ ٹی پبلشرز لاہور، ۲۰۱۳ء
- شبلی کی علمی وادبی خدمات ۔ڈاکٹر خلیق انجم، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۹۶ء
- شبلی کے نام اہل علم کے خطوط ۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء
- شبلی معاصرین کی نظر میں ۔ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو ۔۲۰۰۵ء
- شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں ۔سید شہاب الدین دسنوی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ۱۹۸۷ء
- شبلی نعمانی شخصیت اور عصری معنویت، شہاب الدین ثاقب، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۱۵ء
- شبلی نقادوں کی نظر میں ۔ناز صدیقی، الیاس ٹریڈرس حیدر آباد، ۱۹۷۶ء
- شذرات شبلی ۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
- شعر العجم (اول تا پنجم) علامہ شبلی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۸ء
- صحیفہ محبت ۔پروفیسر محمود الہی، ادارہ فروغ اردو، لکھنو، ۱۹۶۴ء
- عرفان شبلی ۔کلیم صفات اصلاحی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
- عرفان محبت ۔مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی، مکتبہ فردوس لکھنو، ۱۹۸۰ء
- عظمت شبلی ۔مولانا ضیاء الدین اصلاحی، ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی، اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن دہلی، ۲۰۱۷ء
- عظمت کے نشاں ۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، طبع دوم ۲۰۱۰ء
- عکس واثر ۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
- علامہ سید رشید رضا ۔ڈاکٹر ابراہیم عدوی، مترجم مولانا محمد ثناء اللہ عمری، مشیلا پٹنم، آندھر پردیش، ۲۰۰۲ء
- علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۲۰۰۱ء
- علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت وادبی خدمات ۔ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی، مکتبہ فردوس لکھنو

طبع اول: ۱۹۸۵ء

- علامہ شبلی اور انجمن ترقی اردو۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتا، طبع اول: ۲۰۲۱ء
- علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد۔ ابوعلی اثری، محمد آباد گوہنہ مئو، ۲۰۰۲ء
- علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۹ء
- علامہ شبلی کے فارسی خطوط ایک مطالعہ۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، طبع اول: ۲۰۲۲ء
- علامہ شبلی نعمانی صدی کے آئینے میں۔ ڈاکٹر مہ جبیں زیدی، قرطاس کراچی، ۲۰۱۴ء
- علامہ شبلی نعمانی کی قرآن فہمی۔ ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی، دارالنوادر لاہور، ۲۰۰۵ء
- علامہ شبلی نعمانی معنویت کی بازیافت۔ ڈاکٹر شباب الدین، شبلی کالج اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء
- علم الکلام اور الکلام۔ علامہ شبلی نعمانی، دوست ایسوسی ایٹس اردو بازار لاہور، ۲۰۰۳ء
- عہد نبوی کا تمدن۔ پروفیسر لیسین مظہر صدیقی، دارالنوادر لاہور، ۲۰۱۱ء
- غزلیات شبلی۔ علامہ شبلی نعمانی، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۵ء
- فردوسی۔ وحشی محمود آبادی، نسیم بک ڈپو لکھنو،
- قرآن مجید بحثیت ماخذ سیرت۔ مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی، دعوت القرآن لکھنو، ۲۰۱۶ء
- کتابیات شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء
- کتاب نامہ شبلی۔ اختر راہی، مسلم اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۱ء
- کلام شبلی کے اعلام واشخاص۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۲۰ء
- کلیات شبلی اردو۔ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۷ء
- کلیات شبلی فارسی۔ علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۴ء
- گلہائے داغ۔ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، مکتبہ عارفین ڈھاکہ، ۱۹۵۷ء
- مالک رام ایک مطالعہ۔ علی جواد زیدی، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۸۶ء
- متاع رفتگاں از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،

دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء

- متعلقات شبلی ـ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء
- محبت نامے ـ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۷ء
- مختصر سیرت النبی، علامہ شبلی و مولانا سید سلیمان ندوی، تلخیص مولانا پروفیسر محمد رفیق چودھری، مکتبہ قرآنیات لاہور، ۲۰۰۸ء
- مراسلات شبلی ـ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء
- مرثیے کی سماجیات ـ ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی، نصرت پبلشرز لکھنو، ۱۹۹۳ء
- مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری ـ ایس اے صدیقی، مکتبہ جامعہ دہلی، دسمبر ۱۹۸۰ء
- مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی کا حصہ ـ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۲۱ء
- مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ـ علامہ شبلی نعمانی، قومی پریس لکھنؤ، ۱۸۸۸ء
- مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، مولانا محمد عمران خاں، لکھنو ۱۹۴۶ء
- مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت ـ ابوالکلام قاسمی، لبرٹی آرٹ پریس دہلی ۱۹۹۲ء
- مشرقی کتب خانے ـ شمیم طارق، مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن ممبئی، ۲۰۰۸ء
- مطالعات شبلی ـ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء
- مطالعات ومشاہدات ـ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۰
- مطالعہ تصنیفات علامہ شبلی نعمانی ـ محمد سرفراز عالم، طلبائے ندوۃ العلما لکھنؤ، ۲۰۱۸ء
- مطالعہ دبیر ـ مشکور حسین یاد، کلاسیک لاہور، دسمبر ۲۰۰۳ء
- معارف شبلی ـ ڈاکٹر سہیل شفیق، قرطاس کراچی، ۲۰۱۶ء
- معارف کا اشاریہ ـ ڈاکٹر عابد رضا بیدار، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۹۵ء
- مقالات رشید حسن خاں جلد اول ـ ڈاکٹر ٹی آر رینا، اپلائڈ بکس دہلی، ۲۰۱۶ء
- مقالات سلیمان اول ـ سید صباح الدین عبدالرحمن، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء
- مقالات شبلی اور تا ہشتم ـ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

- مقالات یوم شبلی۔ حافظ نذر احمد، مسلم اکادمی لاہور، ۱۹۶۸ء
- مقالات یوم شبلی۔ عبید اللہ خاں، اردو مرکز لاہور، ۱۹۶۱ء
- مکتوبات شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنفین اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۰۲۱ء
- موازنہ انیس و دبیر۔ علامہ شبلی نعمانی، مرتبہ رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۸۹ء
- موازنہ انیس و دبیر۔ علامہ شبلی نعمانی، مرتبہ سید رفیق حسین، رام نرائن لال الٰہ آباد، ۱۹۸۷ء
- موازنہ انیس و دبیر۔ علامہ شبلی نعمانی، مرتبہ سید مجاور حسین، لکھنؤ، ۲۰۱۰ء
- موازنہ انیس و دبیر۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۴ء
- موازنہ انیس و دبیر۔ علامہ شبلی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، ۱۹۸۲ء
- موازنہ انیس و دبیر کا تنقید مطالعہ۔ سید ظہور الاسلام، بھوپال بک ہاؤس بھوپال، ۱۹۸۶ء
- مولانا ابوالکلام آزاد مذہبی افکار، صحافت اور قومی جدوجہد۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی، دار المصنفین اعظم گڑھ، طبع جدید، ۲۰۱۴ء
- مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ۔ نیر جہاں، دہلی، ۱۹۹۸ء
- مولانا شبلی ایک مطالعہ۔ مفتون احمد، مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۸۶ء
- مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، دار النوادر لاہور، ۲۰۰۵ء
- مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں۔ عبد اللطیف اعظمی، شبلی اکادمی دہلی، ۱۹۴۵ء
- مولانا شبلی کی اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۴ء
- مولانا عبد السلام ندوی کی دانشوری اور عہد حاضر۔ ہارون اعظمی، مولانا عبد السلام ندوی فاؤنڈیشن ممبئی، ۲۰۰۹ء
- نثر کا حسن۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار، رام پور انسٹی ٹیوٹ رام پور، ۱۹۶۸ء
- نقوش زندگی۔ مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا مجیب اللہ ندوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اعظم گڑھ
- نقوش صدرنگ۔ ڈاکٹر انیس ادیب، مکتبہ الفہیم مئو، ۲۰۱۱ء
- نوادرات شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۸ء

- نئی تحریریں-عبدالستاردلوی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۶ء
- وزیرآغا کے خطوط انور سدید کے نام-مکتبہ فکر وخیال لاہور، مارچ ۱۹۸۵ء
- وفیات معارف-ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، قرطاس کراچی، ۲۰۱۳ء
- یگانۂ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی-ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء

رسائل:

- البصیر-چینوٹ (شبلی نمبر) مدیر عبیداللہ خاں، ۱۹۵۷ء
- ادیب-علی گڑھ (شبلی نمبر) مدیر ڈاکٹر ابن فرید، ستمبر ۱۹۶۰ء
- اسلام اور عصر جدید-دہلی (شبلی نمبر) مدیر پروفیسر اختر الواسع، جولائی ۲۰۰۸ء
- صبا، حیدرآباد-(شبلی نمبر) مدیر سلیمان اریب، ۱۹۵۸ء
- صحیفہ لاہور (شبلی نمبر)-مدیر افضل حق قرشی، ۲۰۱۴ء
- شبلی کالج میگزین اعظم گڑھ-(شبلی نمبر) مدیر ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی، ۲۰۰۸ء
- علوم اسلامیہ علی گڑھ (شبلی نمبر) مدیر پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، ۲۰۱۲ء-۲۰۱۴ء
- فکر ونظر علی گڑھ (شبلی نمبر) مدیر ڈاکٹر شہریار، جون ۱۹۹۶ء
- کریسنٹ لاہور (شبلی نمبر) مدیر خالد بزمی، جنوری ۱۹۷۱ء
- معارف اعظم گڑھ (سید سلیمان نمبر) مدیر شاہ معین الدین احمد ندوی، ۱۹۵۵ء
- معارف اعظم گڑھ (شبلی نمبر) مدیر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ۲۰۱۴ء
- نقطہ نظر اسلام آباد-اکتوبر مارچ ۲۰۱۱ء، (شبلی نمبر) ۲۰۲۲ء، مدیر: ڈاکٹر سفیر اختر
- نوائے ادب ممبئی (شبلی نمبر) پروفیسر عبدالستار دلوی، ۲۰۱۵ء
- ماہنامہ الندوہ لکھنؤ-اپریل ۱۹۱۵ء
- سہ ماہی فکر ونظر علی گڑھ-مارچ ۲۰۱۵ء

•••

ASRAT-E-SHIBLI

Vol. 2

Dr. Mohammad Ilyas Azmi

Price : 400/-

ADBI DAIRA
AZAMGARH

E-mail: azmi408@gmail.com
Mob.: +91-9838573645